جاوید احمد غامدی

البیان

العنکبوت ـ الحجرات

۲۹ —— ۴۹

۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

العنكبوت - الروم

٢٩ ـــــ ٣٠

العنکبوت - الروم

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع منکرین رسالت کو تہدید و وعید، اُن کے شبہات کی تردید اور اہل ایمان کے لیے، اگر وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے ایمان پر قائم رہیں تو انجام خیر کی بشارت ہے۔ پہلی سورہ ــــــ العنکبوت ــــــ میں اِسی رعایت سے اُنھیں مصائب و شدائد کے ہجوم میں عزیمت و استقامت کی تلقین کی گئی ہے۔ اِس کے لیے بنائے استدلال پہلی سورہ میں زیادہ تر تاریخ کے حقائق اور دوسری میں انفس و آفاق کی نشانیاں ہیں۔

اِن میں خطاب اگرچہ بعض مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے اور اہل ایمان سے بھی، لیکن روے سخن ہر جگہ قریش مکہ ہی کی طرف ہے۔

دونوں سورتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب ہجرت و براءت کا مرحلہ قریب آ چکا ہے۔

سورة العنکبوت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳﴾

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الٓمّٓ' ہے[۱]۔ کیا لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور اُنھیں آزمایا نہ جائے گا[۲]؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اُن سب لوگوں کو آزمایا ہے جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ اُن لوگوں کو ضرور جانے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا[۳]۔ ۱-۳

---

۱ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

۲ یہ اُن لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو منکرین کے ہاتھوں زہرہ گداز مصائب سے گھبرا اٹھے اور طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو گئے تھے، مثلاً یہ کہ اگر یہ خدا کا راستہ ہے تو ایسا دشوار گزار کیوں ہے؟ اگر اِس کی دعوت دینے والے خدا کے رسول ہیں تو اُن کا ساتھ دینا اِس قدر جان جوکھم کا کام کیوں بن گیا ہے؟ ہم خدا کے لیے اٹھے ہیں تو ہمارے راستے میں یہ رکاوٹیں کیوں کھڑی ہو گئی ہیں؟

۳ مطلب یہ ہے کہ سنت الٰہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جزا و سزا کا معاملہ مجرد اپنے علم کی بنیاد

اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ اَنۡ يَّسۡبِقُوۡنَا ؕ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ﴿۴﴾ مَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۵﴾ وَمَنۡ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفۡسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶﴾ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور کیا جو (اُن کے ساتھ) برائیاں کر رہے ہیں[4]، اُنھوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے؟ (اُن پر افسوس)، بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں[5]! (اِس میں شبہ نہیں کہ اِس وقت ہجوم مصائب ہے، لیکن) جو خدا سے ملنے کی امید رکھتا ہو، اُسے مطمئن رہنا چاہیے، اِس لیے کہ (جزا و سزا کے لیے) خدا کا ٹھیرایا ہوا وقت ضرور آنے والا ہے اور خدا سمیع و علیم ہے۔ (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) جو ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں[6] تو وہ اپنے ہی بھلے کے

پر نہیں کرتا، بلکہ لوگوں کو آزمایشوں میں ڈالتا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں، اُسی کی بنیاد پر اُن کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کرتا ہے۔

۴؎ یہ اُن لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو کم زور مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔

۵؎ یعنی ہر لحاظ سے برا فیصلہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...خدا کو اگر اُنھوں نے کم زور سمجھا ہے کہ وہ اُن پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا، جب بھی اُن کا فیصلہ نہایت برا ہے اور اگر اُنھوں نے اپنی اِن تمام ستم رانیوں پر اُس کو راضی اور اِس معاملے سے بالکل بے تعلق و بے پروا سمجھ رکھا ہے، جب بھی اُن کا یہ فیصلہ نہایت غلط اور نہایت برا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۱۷)

۶؎ یعنی وہ محنت جو انسان اپنے ایمان پر قائم رہنے کے لیے اٹھاتا ہے۔

لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا

لیے محنت اٹھاتے ہیں، اِس لیے کہ اللہ تو دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔ اور جو لوگ ایمان پر قائم رہے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، (وہ یقین رکھیں کہ) اُن کی برائیاں[7] ہم ضرور اُن سے دور کریں گے اور اُن کے عمل کا اُنھیں بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے۔۶-۷

(خدا سے بڑھ کر کسی کا حق نہیں ہے)۔ ہم نے انسان کو اُس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے، لیکن (ساتھ ہی واضح کر دیا ہے کہ) اگر وہ تمھارے درپے ہوں کہ تم کسی کو میرا شریک ٹھیراؤ جس کا تمھیں کوئی علم نہیں ہے[8] تو اُن کی بات نہ ماننا[9]۔ تم سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا

۷ اِس سے وہ برائیاں مراد ہیں جو اُنھوں نے اپنے ایمان لانے سے پہلے کی ہوں گی یا اب کر بیٹھیں گے اور اُس کے بعد توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر لیں گے۔

۸ یہ نفی شرک کی دلیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...'علم' کے معنی دلیل و برہان کے ہیں۔ جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے، وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک مشرک بھی بہر حال مانتا ہے۔ رہے دوسرے اُس کے شریک تو اُن کی دلیل پیش کرنا اُن لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اُن کو شریک خدا ٹھیراتے ہیں اور جب تک اُن کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو، کسی عاقل کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اُن کو خدائی میں شریک کر کے اُن کی غلامی کا قلادہ بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔" (تدبر قرآن ۶/۱۹)

۹ اوپر جن آزمایشوں کا ذکر ہوا ہے، اُن میں سے ایک بڑی آزمایش یہ بھی رہی ہے کہ والدین

كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ⑧ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِى الصّٰلِحِيۡنَ ⑨

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوۡذِىَ فِى اللّٰهِ جَعَلَ فِتۡنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنۡ جَآءَ نَصۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكَ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّا

جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، اُنھیں ہم (اُس دن) ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔[۱۰] ۸-۹

(یہ خدا پر ایمان کا تقاضا ہے) اور اِدھر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں، لیکن جب اُسی خدا کی راہ میں ستائے جاتے ہیں تو لوگوں کے ستانے کو وہ خدا کے عذاب کی طرح سمجھ لیتے (اور پیچھے ہٹ جاتے) ہیں۔[۱۱] (یہی لوگ ہیں کہ) اگر تیرے پروردگار کی طرف سے کوئی مدد ظاہر ہو

مذہب کے معاملے میں بسا اوقات اولاد کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والے بھی یقیناً اِس سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ قرآن نے واضح کر دیا کہ والدین کا حق، بے شک مسلم ہے، لیکن خدا نے یہ حق اُن کو بھی نہیں دیا کہ دین کے معاملے میں اُن کی بات بغیر کسی دلیل کے مان لی جائے یا وہ اِس معاملے میں اپنی اولاد پر کوئی جبر کریں۔

۱۰۔ یہ تنبیہ بھی ہے اور تسلی بھی کہ دباؤ کے باوجود حق پر قائم رہو گے تو صلہ پاؤ گے، ورنہ تم اور تمھارے والدین، سب کو ایک دن میری ہی طرف پلٹنا ہے، جہاں جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔

۱۱۔ لوگوں کے ستانے کے لیے آیت میں لفظ 'فِتۡنَة' اور جو کچھ خدا کی طرف سے پیش آئے گا، اُسے 'عَذَاب' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عذاب درحقیقت خدا ہی کا عذاب ہے۔ لوگ جو تکلیف بھی پہنچائیں، وہ بہرحال آزمایش ہی ہے، اِس سے زیادہ اُس کی کوئی حیثیت

كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ⑩ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ⑪

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑫

گی تو ضرور کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ تھے۔ کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے، اُس سے اللہ بخوبی واقف نہیں ہے؟ (یہ ایمان کا دعویٰ کر رہے ہیں تو خوب سمجھ لیں کہ) اللہ اُنھیں ضرور جانے گا جو فی الواقع مومن ہیں اور منافقوں کو بھی جان کر رہے گا۔[12] ۱۰-۱۱

اور منکرین (جو اِن کو ستا رہے ہیں)[13]، ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو اور تمھارے گناہ ہم اٹھا لیں۔[14] حالاں کہ اُن کے گناہوں میں سے وہ کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ہاں، اپنے

نہیں ہے۔

۱۲؎ اِس لیے کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ تمیز ضروری ہوتی ہے۔ اللہ اپنے علم کی بنیاد پر لوگوں کے عذاب وثواب کا فیصلہ نہیں کرتا، بلکہ اُن کے عمل کی بنیاد پر کرتا ہے اور یہی عدل کا تقاضا ہے۔

۱۳؎ اِس سے مراد وہ کفار ہیں جن کے بچے یا دوسرے زیردست افراد اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔

۱۴؎ اپنے چھوٹوں کے مقابل میں یہی منطق ہے جو اُن کے بڑے ہمیشہ استعمال کرتے رہے ہیں۔

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ز وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا

(گناہوں کے) بوجھ وہ ضرور اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کچھ دوسرے بوجھ بھی اور جو افترا وہ کر رہے ہیں[۱۵]، قیامت کے دن اُس کے بارے میں یقیناً اُن سے پوچھا جائے گا۔ ۱۲-۱۳

(یہی کچھ اگلوں نے بھی کیا ہے)۔ ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا[۱۶] تھا تو وہ پچاس کم ایک ہزار سال اُن لوگوں میں رہا[۱۷]، (لیکن اِس کے باوجود وہ

۱۵؎ یعنی اپنی طرف سے جو دین بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اِسے افترا اِس لیے کہا ہے کہ شرک ہو یا بدعت، دونوں جھوٹ ہیں جو خدا پر باندھے جاتے ہیں۔

۱۶؎ یعنی عذاب سے پہلے اتمام حجت کے لیے اُسی طرح رسول بنا کر بھیجا تھا، جس طرح اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تمھاری طرف بھیجا ہے۔

۱۷؎ نوح علیہ السلام کی لمبی عمر کا یہ حوالہ راہ حق کے مسافروں کو یہ بتانے کے لیے دیا گیا ہے کہ تم لوگ چند سال کی جدوجہد اور اُس کے مصائب و شدائد سے گھبرا اٹھے ہو، تم سے پہلے خدا کے پیغمبر اور اُن کے ساتھیوں کو بعض اوقات اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے سیکڑوں برس تک اِسی طریقے سے اور اِنھی حالات میں جدوجہد کرنا پڑی ہے۔

حضرت نوح کی عمر کے بارے میں بائیبل کا بیان بھی یہی ہے۔ پیدایش میں ہے:

"...اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس ہوئی، تب اُس نے وفات پائی۔" (۹: ۲۸-۲۹)

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں عمروں کا اوسط بالعموم یہی تھا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کے باپ کی عمر سات سو ستتر سال اور دادا کی نو سو انہتر سال مذکور ہے۔ اِسی طرح اُن کے

العنکبوت
۲۹

خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوۡفَانُ وَهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَاَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَةِ وَجَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۵﴾
وَاِبۡرٰهِیۡمَ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوۡهُ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ

لوگ نہیں مانے تو) آخرکار اُنھیں طوفان نے آ گھیرا اور وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔[۱۸] پھر نوح کو اور کشتی والوں کو ہم نے بچا لیا اور اِس واقعے کو ہم نے دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنا دیا۔ ۱۴-۱۵

اِسی طرح ابراہیم کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا،[۱۹] جب اُس نے اپنی قوم سے کہا

دوسرے اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ سال بتائی گئی ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے سال۔ اِن بیانات کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خدا کا فیصلہ اگر ابتدا میں یہی رہا ہو، اِس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ہماری یہ زمین اُس وقت آباد ہو رہی تھی اور اِسے آباد رکھنے کے لیے غالباً یہی طریقہ موزوں بھی تھا۔

۱۸ یعنی اُسی طرح ظلم ڈھا رہے تھے، جیسے اب تم لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہو۔ چنانچہ باز نہیں آئے تو اتمام حجت کے بعد عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، سنت الٰہی یہی ہے کہ جس طرح اہل حق کا کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان ضروری ہے، اُسی طرح اہل باطل پر عذاب سے پہلے اُن پر اتمام حجت ضروری ہے۔

نوح علیہ السلام کی قوم پر یہ عذاب دجلہ و فرات کے دوآبے میں آیا۔ چنانچہ آرمینیا کی سرحد پر کوہ ارارات کے نواح میں لوگ اب بھی اُس زمانے کے بعض آثار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ارارات کے اوپر سے اڑنے والے جہازوں کا بیان ہے کہ اُنھوں نے پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی پر ایک کشتی جیسی کوئی چیز دیکھی ہے۔ اہل علم کا خیال ہے کہ یہ غالباً وہی چیز ہے جسے الہامی کتابوں میں کشتی نوح کہا گیا ہے۔

۱۹ ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کم و بیش ۲۱ سو قبل مسیح میں اور عراق کے شہر ار کے لوگوں کی

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

العنکبوت ۲۹

کہ اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو پوج رہے ہو اور اِس کے لیے جھوٹ گھڑتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پوج رہے ہو، وہ تمھارے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔[۲۰] سو اللہ ہی کے ہاں رزق تلاش کرو اور اُسی کی بندگی کرو اور اُسی کے شکر گزار رہو، تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۶-۱۷

اور اگر جھٹلاؤ گے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اِس لیے کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور خدا کے رسول پر تو صاف صاف پہنچا دینے ہی کی ذمہ داری ہے۔[۲۱] ۱۸

طرف ہوئی تھی۔

۲۰ یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ جو رزق و فضل تمھیں حاصل ہے، وہ اِن بتوں کی برکت سے ہے تو یہ محض وہم ہے۔ تمھیں جو کچھ مل رہا ہے، خدا کے قانون کے مطابق اور اُس کی عنایت سے مل رہا ہے۔ اِن میں سے کسی کا تمھارے رزق اور تمھاری خوش حالی میں کوئی دخل نہیں ہے۔

۲۱ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس کے بعد خدا کا رسول تو سبک دوش ہو جائے گا، لیکن جو پرسش ہوگی، وہ تم سے ہوگی اور اُس کا نتیجہ بھی تمھیں ہی بھگتنا پڑے گا۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ﴿۱۹﴾ قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ بَدَاَ الۡخَلۡقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنۡشِئُ النَّشۡاَۃَ الۡاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿ۚ۲۰﴾ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡحَمُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ اِلَیۡہِ تُقۡلَبُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۫ وَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ

العنکبوت
۲۹

کیا[۲۲] اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اُس کا اعادہ کر دیتا ہے[۲۳]؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لیے یہ نہایت آسان ہے۔ اِن سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح خلق کی ابتدا کی، پھر وہی اللہ اُسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا[۲۴]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (پھر کسی کے اختیار میں نہ ہو گا کہ اُس کے کسی فیصلے میں مداخلت کرے)۔ وہ جس کو چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا، رحم فرمائے گا اور تم اُسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ (لوگو[۲۵])، نہ تم زمین میں خدا کے قابو سے باہر نکل سکتے ہو، نہ آسمان میں،

۲۲۔ یہاں سے آگے آیت ۲۳ تک حضرت ابراہیم کی دعوت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تضمین ہے جس سے وہ بات مکمل بھی ہو گئی ہے اور مطابق حال بھی جو ابراہیم علیہ السلام نے 'اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ' کے مختصر الفاظ میں فرمائی تھی۔

۲۳۔ یہ اُسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہم شب و روز اپنی زمین پر کرتے ہیں کہ زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے، پھر خشک اور بے آب و گیاہ ہو جاتی ہے، پھر آسمان برستا ہے اور یکایک وہ دوبارہ اُسی طرح سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔

۲۴۔ یعنی ابتدا دیکھ رہے ہو تو اِسی سے سمجھ لو کہ وہ اِسے دہرا بھی دے گا۔

دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٣﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٢٤﴾

العنکبوت
٢٩

اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی کارساز ہے، نہ مدد کرنے والا۔ اور جنھوں نے اللہ کی آیتوں اور اُس سے ملاقات کا انکار کر دیا ہے، وہی ہیں کہ میری رحمت سے محروم ہو کر مایوس ہو چکے[٢٦] اور وہی ہیں کہ جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ١٩-٢٣

سو (ابراہیم نے اپنی دعوت پیش کی تو) اُس کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ آپس میں کہنے لگے: اِسے قتل کر دو یا جلا دو۔ پھر اللہ نے اُس کو آگ سے بچا لیا[٢٧]۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لائیں[٢٨]۔ ٢٤

٢٥ اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں تھیں۔ اب قریش کو براہ راست خطاب کر کے تنبیہ فرمائی ہے۔

٢٦ اصل میں 'یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'یَئِسُوْا' یہاں 'حُرِمُوْا' اور 'بُعِدُوْا' کے مفہوم میں ہے، یعنی ایسی محرومی جو کامل مایوسی کے ساتھ ہو گی۔

٢٧ دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر جلانے پر اتفاق ہوا اور ایک اسکیم بنا کر اُنھیں آگ میں پھینک دیا گیا، مگر اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا اور وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوا جو رسولوں کے باب میں مقرر کی گئی ہے کہ اُن کے دشمن اُن پر غلبہ نہیں پا سکتے اور تکذیب پر جمے رہیں تو زمین سے مٹا دیے جاتے ہیں۔

٢٨ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ ایمان والوں کو بعض اوقات اپنے ایمان کی خاطر آگ

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾

العنکبوت ۲۹

اُس نے کہا: تم نے اللہ کے سوا جو بت بنائے ہیں تو دنیا کی زندگی تک صرف آپس کی دوستی میں بنا لیے ہیں۔[29] پھر قیامت آئے گی تو اُس دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا[30] اور تمھارا ٹھکانا آگ ہو گا اور (اِن میں سے) کوئی وہاں تمھارا مددگار نہ بنے گا۔ ۲۵

اُس وقت لوط نے اُس کی تصدیق کی اور ابراہیم نے (جب یہ دیکھا کہ اُس کے سوا کوئی شخص بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے تو) کہا: میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔[31] بے شک، وہی زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[32] ۲۶

کے الاؤ کے اندر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے اور اِس بات کی کہ اپنے رسولوں کو خدا کبھی تنہا نہیں چھوڑتا، بلکہ لازماً اُن کی مدد کرتا ہے۔

۲۹۔ اصل میں 'مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن کا نصب ہمارے نزدیک بیان علت کے لیے نہیں، بلکہ بیان حال کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۰۔ یہاں اجمال ہے، قرآن میں دوسرے مقامات میں تفصیل کر دی ہے کہ کس طرح زعما اور اُن کے پیرو اور عابد اور معبود وہاں ایک دوسرے کو لعنت ملامت کریں گے۔

۳۱۔ اِس میں اہل ایمان کے لیے تنبیہ ہے کہ اِس وقت جس ردعمل کا اُنھیں سامنا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جیسی ہستی پر بھی ایسا وقت گزر چکا ہے کہ ایک بھتیجے

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾
وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ

(اِسی استقامت کے صلے میں) ابراہیم کو ہم نے اسحٰق اور یعقوب عطا فرمائے[۳۳]
اور اُس کی اولاد میں نبوت جاری کی اور اُنھیں کتاب کا حامل بنایا اور اُس کا اجر اُسے
دنیا میں دیا اور آخرت میں بھی وہ یقیناً ہمارے نیک بندوں میں سے ہوگا۔ ۲۷
اِسی طرح لوط[۳۴] کو رسول بنا کر بھیجا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ کھلی
بدکاری کے مرتکب ہوتے ہو[۳۵]۔ تم سے پہلے دنیا کی کسی قوم نے (اِس ڈھٹائی کے

کے سوا کوئی دوسرا شخص اُن کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

۳۲؎ یعنی زبردست ہے، لہٰذا راہ کھولنا چاہے گا تو کوئی اُس میں رکاوٹ نہ ڈال سکے گا، لیکن اُسی وقت کھولے گا، جب اُس کی حکمت کا تقاضا ہوگا، اِس لیے کہ حکیم بھی ہے۔

۳۳؎ اُن کے دوسرے بیٹوں کا ذکر اِس لیے نہیں ہوا کہ آگے جس نعمت کا ذکر ہے، وہ ڈھائی ہزار سال تک اُن کی اولاد کی اُسی شاخ کو عطا ہوتی رہی جو حضرت اسحٰق سے چلی تھی۔ بنی مدیان میں حضرت شعیب اور بنی اسمٰعیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نبی نہیں آیا۔

۳۴؎ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔

۳۵؎ لوط علیہ السلام کی قوم بھی ایک مشرک قوم ہی تھی، لیکن اِس کے ساتھ امرد پرستی کی بے حیائی کو اِس طرح اپنی قومی تہذیب بنا چکی تھی کہ اُنھیں سب سے بڑھ کر اِسی پر توجہ کرنی پڑی۔

بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ

ساتھ اور اِس طرح قومی حیثیت میں) اِس کا ارتکاب نہیں کیا۔ کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو اور فطرت کی راہ مارتے ہو[۳۶] اور اپنی مجلسوں میں (علانیہ) اِس برائی کا ارتکاب کرتے ہو؟[۳۷] اِس پر اُس کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُنھوں نے کہا: اگر تم سچے ہو تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ۔ ۲۸-۲۹

لوط نے دعا کی کہ میرے پروردگار، اِن مفسد لوگوں کے مقابلے میں[۳۸] میری مدد

۳۶؎ یعنی خدا نے جو راستہ انسان کی جنسی جبلت کی تسکین کے لیے مقرر کر رکھا ہے، اُسے بند کرتے ہو۔ یہ اِس برائی میں مبتلا ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اِس سے عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور اگر کچھ رہتی بھی ہے تو اِسی طرح کے انحرافات کی صورت میں رہتی ہے جو بجائے خود پاکیزگی اور لطافت کے احساس کو انسان کے اندر ختم کر دینے کا باعث بن جاتے ہیں۔ چنانچہ دبر کے راستے مباشرت کو اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے معاملے میں بھی اِسی بنا پر ممنوع ٹھیرایا ہے۔

۳۷؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم امرد پرستی میں کس مقام تک پہنچ گئی تھی کہ لوگ علانیہ اِس کا ارتکاب کرتے اور فخر و لذت کے ساتھ ہر بزم و انجمن میں اِس کا چرچا کرتے تھے۔

۳۸؎ یعنی اُن لوگوں کے مقابلے میں جو خدا اور خدا کے رسول کے آگے بھی سرکشی اور تمرد پر اتر آئے ہیں۔ اُنھیں مفسد اِسی بنا پر کہا ہے۔

رُسُلُنَآ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا مُهۡلِكُوۡۤا اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ ۚ اِنَّ اَهۡلَهَا كَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِيۡهَا ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۫ كَانَتۡ مِنَ

فرما۔ اور (اُس کی یہ دعا اِس طرح قبول ہوئی کہ) ہمارے فرستادے جب ابراہیم کے پاس خوش خبری[39] لے کر آئے تو اُنھوں نے اُسے بتایا کہ ہم اِس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں[40]، اِس لیے کہ اِس کے لوگ ظالم ہو چکے ہیں[41]۔ ابراہیم نے کہا: اُس میں تو لوط بھی ہے[42]۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ اُس میں جو لوگ بھی ہیں، اُنھیں ہم خوب جانتے ہیں۔ (آپ مطمئن رہیے)، ہم لوط کو اور اُس کے سب گھر والوں کو ضرور بچا لیں گے،

العنکبوت ۲۹

۳۹؎ یعنی بیٹے اور پوتے کی خوش خبری۔ اوپر آیت ۲۷ میں اِس کا ذکر ہو چکا ہے۔

۴۰؎ فرشتوں نے یہ غالباً حبرون (موجودہ الخلیل) کی پہاڑیوں سے اشارہ کر کے کہا ہے کہ ہم اِسی بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ حضرت ابراہیم اُس وقت فلسطین کے اِسی شہر میں مقیم تھے اور یہ بستی اُس کے جنوب مشرق میں نیچے کی طرف چند میل کے فاصلے پر ٹھیک اُسی جگہ واقع تھی، جہاں اب بحیرہ مردار کا پانی پھیلا ہوا ہے۔ حبرون کی پہاڑیوں سے یہ علاقہ صاف نظر آتا ہے۔

۴۱؎ یعنی وہی فرشتے جو ابراہیم علیہ السلام کے لیے خوش خبری لے کر آئے، اُنھوں نے بتایا کہ اُن کے پاس قوم لوط کے ظالم لوگوں کے لیے عذاب کا تازیانہ بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس سے مشرک قوموں کے اِس واہمے کی بھی تردید ہو رہی ہے جس میں وہ اِس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کے سبب سے مبتلا ہوئیں کہ اُنھوں نے خیر و شر کے الگ الگ دیوتا مان کر اُن کی الگ الگ عبادت شروع کر دی۔" (تدبر قرآن ۶/۳۷)

۴۲؎ سورۂ ہود میں تصریح ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے پہلے پوری قوم کے لیے رحم کی درخواست کی، لیکن جب وہ قبول نہیں ہوئی تو قدرتی طور پر اُنھیں لوط علیہ السلام اور اُن کے

الْغٰبِرِيْنَ ﴿٣٢﴾
وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا
وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ قف اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ

اُس کی بیوی کے سوا۔ وہ البتہ، پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔[۴۳] ۳۰-۳۲

اور جب یہ ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو اُن کے آنے سے وہ سخت پریشان اور تنگ دل ہوا۔[۴۴] (اُس کی پریشانی دیکھ کر) اُنھوں نے تسلی دی کہ نہ اندیشہ کرو، نہ رنجیدہ ہو۔ تمھاری بیوی کے سوا، ہم تمھیں اور تمھارے سب گھر والوں کو

گھر والوں کی فکر لاحق ہوئی۔ اُن کی زبان سے یہ جملہ غالباً اُسی موقع پر نکلا ہے۔

۴۳؎ یہ خدا کے بے لاگ انصاف کا اظہار ہے۔ لوط علیہ السلام کی بیوی غالباً اپنی قوم اور خاندان کی عصبیت کے باعث حق کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو پیغمبر کی بیوی ہونا اُس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہوسکا۔ حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے باپ کی طرح وہ بھی اُسی انجام کو پہنچ گئی جو اُس کی قوم کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔

۴۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا'۔ اِن میں 'لَمَّا' کے بعد 'اَنْ' دلیل ہے کہ شرط اور جواب شرط میں سبب اور مسبب کا تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ اِس کی وجہ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے خوب رو نوجوانوں کی صورت میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام اپنی قوم کی بیماری سے واقف تھے، چنانچہ اُنھیں اندیشہ ہوا کہ بستی کے گنڈے اُنھیں دیکھ کر ٹوٹ پڑیں گے اور اُنھیں اور اُن کے مہمانوں کو رسوا کر دیں گے۔ پھر جب فرشتوں نے بتایا کہ وہ عذاب لے کر آئے ہیں تو اُنھیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ معلوم نہیں، اب اُن کے اور اُن کے خاندان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ قرآن نے دونوں مرحلوں کی اِس پریشانی کو اپنے اسلوب کے مطابق، بالاجمال ایک ہی جملے میں بیان کر دیا ہے۔

مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰۤى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا

بچا لیں گے۔ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ اِس بستی کے لوگوں پر ہم اُن کی نافرمانیوں کی پاداش میں آسمان سے عذاب اتارنے والے ہیں[۴۵]۔ (قریش کے لوگو)، اِس کی ایک واضح نشانی ہم نے اُن لوگوں کے لیے باقی رکھی ہے جو عقل سے کام لیں[۴۶]۔ ۳۳-۳۵

اور[۴۷] مدین والوں کی طرف[۴۸] ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا، پھر اُس نے

۴۵؎ آیت میں عذاب کے لیے 'رِجز' کا لفظ آیا ہے، یعنی وہ عذاب جو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دے۔ اِس پر مزید یہ کہ یہ آسمان سے نازل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے نازل ہوگا اور قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑے گا۔ خدائی عذاب کے لیے یہ تعبیر ہماری زبان میں بھی اِسی طرح اختیار کی جاتی ہے۔

۴۶؎ یہ مخاطبین کو توجہ دلائی ہے کہ بصیرت کی آنکھ ہو تو جس سنت الٰہی کے ظہور سے تمھیں متنبہ کیا جا رہا ہے، اُس کی ایک واضح نشانی شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے تم ہر وقت دیکھ سکتے ہو۔

۴۷؎ اوپر کی سرگذشتیں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ یہاں سے آگے اب بالاجمال قوم شعیب، عاد و ثمود اور انسانی تاریخ کے بعض سرکش افراد کا حوالہ دے کر اُسی حقیقت کو مبرہن کر دیا ہے جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ فرمایا ہے کہ خدا کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرنے والے ہرگز خیال نہ کریں کہ وہ خدا کے قابو سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ خدا ڈھیل دیتا ہے، لیکن اِس کے بعد لازماً پکڑتا ہے اور اِس طرح پکڑتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اُن کے کام نہیں آتی۔

الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَيَّنَ

دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور روزِ آخرت کے منتظر رہو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ پھر اُنھوں نے اُسے جھٹلا دیا تو آخر کار ایک زلزلے نے اُنھیں آپکڑا۔ پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۳۶-۳۷

عاد اور ثمود[۴۹] کو بھی ہم نے اِسی طرح ہلاک کر دیا۔ اُن کی بستیوں کے آثار بھی تم پر

۴۸؎ اِن کی بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے مدیان کے نام پر، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے، مدین یا مدیان کہلاتی تھی۔ اِس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اِس کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر اِس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہ راہیں اِسی علاقے سے گزرتی تھیں، اِس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔ قریش کا اصل میدان بھی یہی تھا۔ غالباً اِسی مناسبت سے اِن کا ذکر یہاں خاص طور پر کیا گیا ہے۔

۴۹؎ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت وشوکت کے لیے بھی۔ ثمود اِنھی کے بقایا میں سے ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں عاد ثانی کہتے ہیں۔ عرب کی قدیم اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمال مغرب کا وہ علاقہ تھا جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ حجاز کے شمالی حصے میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ وخیبر سے تیما اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی اِن کی تعمیرات کے آثار سے بھرا ہوا ہے۔

لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ﴿۳۸﴾
وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى
بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾
فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ

کھلے ہوئے ہیں[۵۰]۔ اُن کے اعمال شیطان نے اُن کے لیے خوش نما بنا دیے اور اُنھیں راہ راست سے روک دیا، حالاں کہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے[۵۱]۔ ۳۸

اور قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کر دیا[۵۲]۔ موسیٰ اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آ گیا تھا۔ تاہم اُنھوں نے بھی زمین میں گھمنڈ کیا اور وہ بھی ہم سے کہیں بھاگ کر نہیں جا سکے۔ ۳۹

سو اِن میں سے ہر ایک کو ہم نے اُس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا، پھر اُن میں

۵۰۔ یعنی تم پر مخفی نہیں ہیں، اپنے تجارتی سفروں میں تم اِن کے کھنڈروں پر سے گزرتے ہو جو آج بھی اِن کی سرگذشت زبان حال سے تمھیں سنا رہے ہیں۔

۵۱۔ یعنی دنیوی معاملات میں بڑے ماہر اور علم وفن میں بڑے زیرک و چالاک تھے، لیکن اُن کی یہی زیرکی اور چالاکی اُن کے لیے مزلۂ قدم بن گئی اور شیطان آخرت جیسی بدیہی حقیقت سے اُنھیں غافل کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔

۵۲۔ اِس سلسلۂ بیان میں کسی جگہ 'اَرْسَلْنَا' اور کسی جگہ 'اَخَذْنَا' یا اِن کے ہم معنی افعال بر بنائے قرینہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ تینوں نام بھی اُسی فعل محذوف کے تحت ہیں جو اوپر 'عَادًا وَّ ثَمُوْدَا' کا عامل ہے۔ اِن سے پہلے قوموں کا ذکر تھا۔ اب یہ تاریخ کے بعض نمایاں مستکبرین کا ذکر کیا ہے تاکہ قریش کے ابوجہل اور ابولہب بھی اپنی صورتیں اِس آئینے میں دیکھ لیں اور یہ بھی دیکھ لیں کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ایسے مستکبرین کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

وَمِنْهُم مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُم مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٠﴾

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا

سے کوئی تھا کہ اُس پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دی[۵۳] اور کوئی تھا کہ اُس کو کڑک نے آلیا[۵۴] اور اُن میں سے کوئی تھا کہ اُسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا[۵۵] اور کوئی تھا کہ اُس کو ہم نے غرق کر دیا[۵۶]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہیں تھا، بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے[۵۷]۔ ۴۰

اللہ کے سوا جن لوگوں نے دوسرے کارساز بنا لیے ہیں، اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے کہ اُس نے ایک گھر بنایا اور کوئی شبہ نہیں کہ سب گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر

۵۳۔ جیسے قوم لوط۔

۵۴۔ جیسے عاد و ثمود اور مدین کے لوگ۔

۵۵۔ جیسے قارون۔

۵۶۔ جیسے فرعون اور ہامان۔

۵۷۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمام سرگذشتیں خدا کے ظلم کی نہیں، بلکہ اُس کے انصاف کی سرگذشتیں ہیں۔ لہٰذا متنبہ ہو جاؤ، اُس کے انصاف کا دن اب تمھارے لیے بھی آنے والا ہے۔ یہ خدا کا حلم اور اُس کی بردباری ہے کہ وہ ابھی تمھیں ڈھیل دے رہا ہے۔ اِس سے فائدہ اٹھاؤ اور سرکشی چھوڑ کر ہمارے پیغمبر کے سامنے سر اطاعت جھکا دو، ورنہ اُسی انجام سے دوچار ہو جاؤ گے جو تم سے پہلے اِن ظالموں کا ہو چکا ہے۔

يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾ اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۴۲﴾ وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ ۚ وَ مَا یَعۡقِلُہَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾

ہی ہوتا ہے۔ اے کاش، یہ لوگ جانتے[۵۸]! اللہ کے سوا جن چیزوں کو بھی یہ پکارتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ اُنھیں اچھی طرح جانتا ہے[۵۹] اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۶۰]۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمایش کے لیے بیان کرتے ہیں، مگر اِن کو وہی سمجھتے ہیں جو علم والے ہیں[۶۱]۔ ۴۱-۴۳

العنکبوت
۲۹

۵۸۔ یعنی اِس حقیقت کو جانتے کہ خدا کے سوا جو سہارے یہ ڈھونڈتے ہیں، وہ سب جھوٹے سہارے ہیں۔ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد خدا کا فیصلہ جب بھی صادر ہوا ہے، یہ جھوٹے ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ آخرت میں بھی اِسی طرح جھوٹے ثابت ہوں گے۔ اپنے خیال میں جو قلعے اِنھوں نے بنا رکھے ہیں، اُن کی حقیقت مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں ہے۔

۵۹۔ یعنی اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کتنے بے حقیقت ہیں۔ اِس اسلوب بیان میں جو طنز و تحقیر چھپی ہوئی ہے، اُسے ہر صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے۔

۶۰۔ یعنی زبردست ہے، لہٰذا کوئی اُسے دبا نہیں سکتا اور حکیم ہے، اِس لیے عدل و مجازات کے لیے جو قانون اُس نے بنا دیا ہے، اُسے کوئی باطل نہیں کر سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خدا کے ہاں بڑا زور و اثر رکھنے والے ہیں، اِس وجہ سے یہ اپنی پرستش کرنے والوں کو، خواہ اُن کے اعمال کچھ بھی ہوں، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ یہ عقیدہ خدا کے عزیز و حکیم ہونے کی نفی کرتا ہے، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اِن دونوں صفتوں کی یاددہانی کر کے اِس بے ہودہ عقیدے کی نفی کر دی۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۴۹)

۶۱۔ اِس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں اصلی عالم وہی ہیں جو انفس و آفاق کی نشانیوں سے اُن حقائق تک پہنچ جائیں جن تک ہر سلیم الفطرت انسان کو پہنچنا چاہیے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۴﴾ اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ

زمین اور آسمانوں کو خدا نے برحق پیدا کیا ہے[۶۲]۔ اِس میں یقیناً بہت بڑی نشانی ہے، اُن کے لیے[۶۳] جو ماننے والے ہوں۔ (یہ دھیان نہیں دے رہے تو اِن کی پروا نہ کرو، اے پیغمبر، اور) اُس کتاب کو پڑھتے رہو[۶۴] جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز کا اہتمام رکھو[۶۵]۔

۶۲۔ اِس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کائنات کسی بامعنی انجام تک پہنچے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا ختم ہو جائے۔ یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اِس کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد پورا ہو کر رہے گا۔

۶۳۔ یعنی اِس بات کی نشانی کہ زمین و آسمان کا خالق علیم و حکیم ہے، اِس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں کامل عدل کا ظہور ہو اور اِس کی کہ لوگ اِسی دن کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کے تمام فیصلے کریں اور کبھی یہ خیال نہ کریں کہ خدا کے کوئی شریک بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی شفاعت سے اُنھیں وہاں بچا لیں گے۔

۶۴۔ یعنی خود بھی پڑھتے رہو اور دوسروں کو بھی پڑھ کر سناتے رہو۔

۶۵۔ دین پر قائم رہنے اور دعوت کی جدوجہد میں صبر و استقامت کے حصول کے لیے یہ ہدایت قرآن میں کئی جگہ کی گئی ہے۔ اِس راہ کے سالکین جانتے ہیں کہ اِس میں استقامت خدا کی معیت سے حاصل ہوتی ہے اور نماز خدا سے اِس درجہ قریب ہے کہ وہ دنیا میں گویا ہمارے لیے خدا کی قائم مقام ہے۔ سورۂ علق (۹۶) کی آیت (۱۹) 'وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ' (سجدہ ریز ہو اور اِس طرح میرے قریب ہو جاؤ) میں یہی حقیقت واضح فرمائی ہے۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں جدوجہد کے لیے اللہ کی معیت اگر حاصل ہو سکتی ہے تو اُس کی کتاب اور اُس کے حضور میں نماز ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اِس مقصد کے لیے سب سے زیادہ اہمیت قیام اللیل، یعنی نماز تہجد کی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب انذار عام کا حکم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِس

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ

کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔[66] (یہ اللہ کی یاد ہے) اور

قولِ ثقیل کا تحمل اور اِس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مقصود ہے تورات کی نمازوں میں قرآن کی تلاوت کی جائے۔ اِس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ وقت دل و دماغ کے فراغ اور فہم قرآن کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ وقت چونکہ دماغ کے سکون اور دل کی بیداری کا خاص وقت ہے، اِس وجہ سے زبان سے جو بات نکلتی ہے، تیر بہ ہدف اور 'از دل خیزد بر دل ریزد' کا مصداق بن کر نکلتی ہے۔ آدمی خود بھی اُس کو اپنے دل کی گواہی کی طرح قبول کرتا ہے اور دوسرے سننے والوں کے دلوں پر بھی اُس کی تاثیر بے خطا ہوتی ہے۔

۶۶؎ یعنی ایک واعظ کی طرح نماز آدمی کو متنبہ کرتی ہے کہ جذبات کے غلبے، شہوات کی یورش اور خواہشوں کے ہجوم میں اُسے یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور اُس کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جو لوگ نماز کو اُس کے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں، خواہ خلوت کی نماز ہو یا جلوت کی، اُن کی نماز اپنے ظاہر و باطن، دونوں سے، اُن کو اُن حقائق کی یاددہانی کرتی رہتی ہے جن کی یاددہانی زندگی کو صحیح شاہ راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر خلوت کی نمازیں انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اُس کی مثال اُس ڈرائیور کی ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چلا تو رہا ہے، لیکن اُس کی رہنمائی کے لیے داہنے بائیں جو نشانات اُس کو صحیح راہ بتانے اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں، اُن سے وہ بالکل بے پروا اور بے خبر ہے۔ ایسا ڈرائیور، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی گاڑی کس کھڈ میں گرائے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۵۳)

اِس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نماز ہی انسان کے دین پر قائم رہنے کی ضمانت ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے اور اُس سے اعراض کر لیتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو شب و روز کے لیے اُن کا ساتھی بن جاتا ہے۔ نماز

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی یاد بڑی چیز ہے[۶۷]۔ (تم اُس پر بھروسا رکھو، اِس لیے کہ) اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو[۶۸]۔ ۴۴-۴۵

اِسی غفلت اور اعراض سے انسان کو بچاتی اور شیطان کے حملوں سے اُس کی حفاظت کرتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ حملے اِس کے باوجود جاری رہتے ہیں، لیکن نماز پر مداومت کے نتیجے میں شیطان کے لیے مستقل طور پر انسان کے دل میں ڈیرے ڈال دینا ممکن نہیں ہوتا۔ نماز اُسے مسلسل دور بھگاتی اور ایک حصار کی طرح انسان کے دل و دماغ کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطرے کی حالت میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ پیدل یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو، اِسے لازماً ادا کیا جائے۔

۶۷؎ مطلب یہ ہے کہ اِسے کوئی معمولی بات یا طفل تسلی نہ سمجھو، خدا کی یاد فی الواقع بہت بڑی چیز ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِسی سے انسان کے دل کو حقیقی طمانیت و سکینت حاصل ہوتی ہے۔ 'اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ' (اچھی طرح سن لو کہ دلوں کو طمانیت اللہ کی یاد سے حاصل ہوتی ہے) اور دل ہی انسان کے اندر وہ چیز ہے جو تمام عزم و حوصلہ کا منبع ہے۔ اگر دل مضبوط ہے تو انسان سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں، اور اگر دل کم زور ہے تو انسان سے زیادہ ناتواں کوئی شے نہیں اور دل کو قوت دینے والی اصلی چیز خدا کی یاد ہے جس کی سب سے زیادہ بہتر، جامع اور موثر شکل نماز ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۳)

۶۸؎ اوپر خطاب صیغۂ واحد سے تھا، لیکن یہ آخر میں جمع کا صیغہ آگیا ہے۔ اِس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ خدا کے پیغمبر کو تو ہر حال میں اِس راستے پر چلنا ہے، لیکن یہی ہدایات اُن سب لوگوں کے لیے بھی ہیں جو خدا کے دین کو اختیار کریں، اُس پر قائم رہنا چاہیں اور اُس کی دعوت کے لیے اُٹھیں یا اٹھنے والوں کے مددگار بنیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے ہر عمل سے واقف ہے، لہٰذا اُس پر بھروسا رکھو، وہ خلوت و جلوت میں تمھاری کسی

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ق اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

اور اہل کتاب (اِس دعوت کی طرف متوجہ ہوں تو اُن) کے ساتھ اُسی طریقے سے بحث کرو جو بہتر ہے[69]، سوائے اُن کے جو اُن میں سے ظالم ہیں[70]۔ (اُن کے ساتھ کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے)[71]۔ تم اُنھیں بتاؤ کہ ہم اُسے بھی مانتے ہیں جو ہماری طرف نازل کیا گیا ہے اور اُسے بھی جو تمھاری طرف نازل کیا گیا تھا[72]۔

العنکبوت
۲۹

محنت کو ضائع نہیں جانے دے گا، بلکہ اُس کا بھرپور صلہ عطا فرمائے گا۔

۶۹؎ اِس کی وضاحت آگے کر دی ہے کہ پہلے اُن چیزوں کو پیش کیا جائے جو تمھارے اور اُن کے درمیان مشترک ہیں۔ اِس کے بعد اُنھی اقدارِ مشترکہ کے لوازم و مقتضیات کی طرف توجہ دلائی جائے جو باعثِ نزاع ہو سکتے ہیں اور اُنھیں شایستہ اور مہذب زبان میں، معقول دلائل کے ساتھ اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ کے ساتھ پیش کیا جائے۔ تمھارا کلام حکیمانہ کلام ہونا چاہیے، نہ کہ مناظرانہ۔ اِس لیے کہ بحث و گفتگو کا یہی طریقہ ہے جس سے کسی کی انانیت کو ٹھیس نہیں لگتی اور مخاطب سلیم الطبع ہو تو بات پر غور کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔

۷۰؎ یعنی شریر، کج بحث اور مناظرہ باز ہیں۔

۷۱؎ قرآن کے دوسرے مقامات میں ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنے کے بجائے اُن سے اعراض کر لیا جائے۔ داعیِ حق کے لیے صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ الزام کا جواب الزام سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کر دے۔ اُس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو سلام کر کے اُن سے جدا ہو جائے۔

۷۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہم کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہم نے حق کو حق کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اُسے جہاں پایا ہے، اُس کی تصدیق کر دی ہے۔ ہماری کتاب اور تمھاری کتابوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اُن کا منبع و ماخذ ایک ہی ہے اور وہ ایک

وَ اِلٰـهُنَا وَ اِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾
وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ

ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں[۳]۔ ۴۶
ہم نے، (اے پیغمبر)، اِسی طرح یہ کتاب تمھاری طرف اتاری ہے[۴]۔ سو جن کو ہم نے (اِس سے پہلے) کتاب سے نوازا ہے[۵]، وہ اِس پر ایمان لائیں گے اور اُن میں سے بعض اِس پر ایمان لا بھی رہے ہیں، اور ہماری آیتوں کا انکار تو وہی کرتے ہیں

ہی دین کی دعوت دیتی ہیں۔ لہٰذا تم بھی اگر تعصبات سے بالاتر ہو کر غور کرو گے تو ہماری طرح یہی کہو گے کہ ہم اُسے بھی مانتے ہیں جو ہماری طرف نازل کیا گیا تھا اور اُسے بھی جو اب تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے۔

۳؎ یعنی معبود ایک ہی ہے، لہٰذا ہم تمھیں کسی دوسرے خدا کو ماننے کی دعوت نہیں دے رہے، بلکہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح ہم نے اُس پر ایمان اور اُس کی اطاعت کے باب میں بالکل یک سو ہو کر اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا ہے، تم بھی اُسی طرح اُن سب باتوں کو چھوڑ کر جو اُس کی توحید کے منافی ہیں، تنہا اُسی کے فرماں بردار بن جاؤ۔

۴؎ یعنی اُسی اصول پر اتاری ہے جو اوپر بیان ہوا کہ خدا کا دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ تمام کتابیں اُسی دین کی دعوت پیش کرتی ہیں اور اُس میں ایک ہی خدا پر ایمان اور اُس کی عبادت و اطاعت کا تقاضا کیا گیا ہے۔

۵؎ اِس سے مراد عام اہل کتاب نہیں ہیں، بلکہ اُن کے اندر کے وہ لوگ ہیں جو اِس سے پہلے بھی اپنی کتابوں کی تعلیمات پر پوری سچائی کے ساتھ قائم تھے۔ 'اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' کے الفاظ میں قرآن بالعموم اِنھی کا ذکر کرتا ہے۔

اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو انکار کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں۔ تم اِس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے، نہ اُس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے البتہ، شک میں پڑ سکتے تھے۔[۶] نہیں، (اِس میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہے)، بلکہ یہ قرآن تو کھلی ہوئی آیتیں ہیں اُن لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم عطا ہوا ہے[۷]۔ اور ہماری آیتوں کا انکار تو وہی

العنکبوت
۲۹

۶ے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں یہ وہی استدلال ہے جو اِس سے پہلے سورۂ یونس (۱۰) میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سے پہلے اگر اِنھوں نے تم کو لکھتے پڑھتے اور مختلف علوم وفنون کا اکتساب کرتے دیکھا ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ نوح و ابراہیم سے لے کر مسیح وکلیم تک کے یہ تمام خزائن حکمت تم نے کتابیں پڑھ کر اور اُن سے اخذ و اکتساب کر کے لکھ لیے ہیں اور اب اُنھیں پڑھ کر سنا رہے ہو، لیکن اِنھیں معلوم ہے کہ تم نے عمر بھر نہ کوئی کتاب کبھی پڑھی ہے، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا ہے تو سوچتے کیوں نہیں کہ تمھارے اوپر وہ تمام علوم آخر کہاں سے برس پڑے ہیں جو اِس وقت یہ تمھاری زبان سے سن رہے ہیں؟ آسمانی کتابوں کی تعلیمات، انبیاے سابقین کے حالات اور قانون وحکمت کے اسرار وغوامض کا یہ اظہار ایک امی کی زبان سے آخر کس طرح ہونے لگا ہے؟

۷ے یعنی جن کے پاس حقیقی علم ہے، اُن کے لیے تو یہ قرآن ایک جانی پہچانی اور موعود و منتظر چیز ہے، اِس لیے کہ جو کچھ یہ بیان کر رہا ہے، وہ اِسی وضاحت کے ساتھ اُن کے سینوں میں پہلے سے موجود ہے۔ وہ اِس کتاب کو نہیں پڑھ رہے، وہ تو درحقیقت اپنے دلوں کی الواح پر لکھی ہوئی خدا کی آیتیں پڑھ رہے ہیں جو اِس سے پہلے وہ کبھی کتاب فطرت میں اور کبھی تورات، زبور اور انجیل میں پڑھتے رہے ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى

کرتے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔[۷۸] ۴۷-۴۹

یہ (ظالم) کہتے ہیں کہ اِس کے پروردگار کی طرف سے اِس پر نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں[۷۹]؟ اِن سے کہو، نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں، میں تو صرف ایک کھلا ہوا خبردار کرنے والا ہوں۔[۸۰] کیا اِن کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے کہ اِنھیں پڑھ کر سنائی جا رہی ہے[۸۱]؟ اِس میں یقیناً اُن لوگوں کے

۷۸؎ اِس سے مراد وہی بد بخت ہیں جن کے بارے میں اوپر فرمایا ہے کہ اُن سے کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے، اُن کا مرض لا علاج ہو چکا ہے۔

۷۹؎ یہ اعتراض بالعموم اہل کتاب کی طرف سے اٹھایا جاتا تھا جسے قریش لے اڑتے تھے اور لوگوں کو یہ کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اگر یہ خدا کی طرف سے آئے ہیں تو اِن کو اُس طرح کے معجزے کیوں نہیں دیے گئے جو اِن سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو دیے گئے تھے؟

۸۰؎ یہ اُن کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...نشانیوں اور معجزات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ میں اِس معاملے میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ وہ اگر چاہے گا تو کوئی نشانی دکھا دے گا اور نہیں چاہے گا تو نہیں دکھائے گا۔ میں تو صرف ایک نذیر مبین ہوں، مجھے حکم ہے کہ تمھیں آنے والے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کر دوں، سو یہ فرض میں ادا کر رہا ہوں۔ باقی تمام امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمھاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دوں۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۵۸)

لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾ قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ شَہِیۡدًا ۚ یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡبَاطِلِ وَ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۵۲﴾
وَ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَ لَوۡ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَّجَآءَہُمُ الۡعَذَابُ ؕ وَ لَیَاۡتِیَنَّہُمۡ بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۳﴾ یَسۡتَعۡجِلُوۡنَکَ

لیے رحمت ہے اور یاد دہانی بھی جو ایمان لائیں۔ (یہ انکار کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں یا اِن پر فی الواقع حقیقت واضح نہیں ہوئی)؟ کہہ دو کہ (اِس پر) میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے۔ (البتہ، یاد رکھو کہ) جو باطل پر ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کا انکار کر دیا ہے، وہی نامراد ہونے والے ہیں۔ ۵۰-۵۲

یہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں۔[۸۲] اِن پر عذاب آ جاتا، اگر اُس کے لیے ایک وقت مقرر نہ ہوتا۔[۸۳] (اِن کا رویہ یہی رہا تو) یقیناً (ایک دن) وہ

۸۱؎ یہ دوسرا جواب ہے کہ یہ اگر غور کریں تو خدا کی سب سے بڑی نشانی تو خدا کی کتاب ہے جو اِن کے لیے اتار دی گئی ہے۔ وہ اپنے ہر دعوے پر خود حجت اور ایک برہان قاطع ہے۔ اُس کا حرف حرف گواہی دیتا ہے کہ وہ کسی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اِس کے بعد کسی اور نشانی کی ضرورت کہاں رہی!

۸۲؎ یعنی جب اِن کے کرتوتوں پر اِنھیں خدا کی گرفت سے خبردار کیا جاتا ہے تو مذاق اڑانے کے لیے جلدی مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ پھر لے آؤ اپنا عذاب، وہ کہاں رہ گیا ہے؟ اُس کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟

۸۳؎ یعنی سنت الٰہی کے مطابق اُس کے بارے میں طے نہ ہوتا کہ اُسی وقت آئے گا،

بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

اچانک اِن پر آ جائے گا اور اِنھیں خبر بھی نہیں ہوگی۔ (اِن پر افسوس)، یہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں، دراں حالیکہ جہنم اِن منکروں کو گھیرے میں لے چکی ہے[۸۴]۔ یہ اُس دن کا خیال کریں، جس دن عذاب اِن کے اوپر سے اور اِن کے پاؤں کے نیچے سے اِنھیں ڈھانک لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو اُس کا مزہ جو کرتے رہے ہو۔ ۵۳-۵۵

میرے بندو جو ایمان لائے ہو، (یہ تم پر ظلم و ستم سے باز نہیں آتے تو ہجرت کر کے یہاں سے نکل جاؤ)[۸۵]۔ میری زمین، بے شک وسیع ہے، سو (جہاں رہ کر بن پڑے) تم میری

جب اِن لوگوں پر خدا کی حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے گی۔

۸۴۔ یہ اعادہ اظہار تعجب کے لیے ہے کہ آگ میں کھڑے ہوئے آگ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہی ایک دن اِن کے لیے جہنم کا ایندھن بننے والا ہے؟ یہ اپنے اعمال سے واقف ہیں اور اِس کے باوجود عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔

۸۵۔ بندۂ مومن کے لیے کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے، یہاں تک کہ اپنے دین کو ظاہر کرنا ہی ممکن نہ رہے تو ہجرت ایمان کا تقاضا بن جاتی ہے، اگرچہ اُس کے لیے اپنا گھر بار اور مال واسباب، سب چھوڑنا پڑے۔ قرآن نے دوسری جگہ واضح کر دیا ہے کہ اِس کے بجائے انسان اگر غیر اللہ کی بندگی گوارا کر لے تو یہ ایمان کھو کر خدا کے حضور آنا ہے جس کا انجام جہنم ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۬ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

العنکبوت
۲۹

ہی بندگی کرو۔ (یہ دنیا ہمیشہ کے لیے نہیں ہے، یہاں) ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُنھیں ہم ضرور جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا صلہ ہے عمل کرنے والوں کے لیے — جنھوں نے صبر کیا اور ہر حال میں اپنے پروردگار ہی پر بھروسا کرتے رہے۔ (یہ خیال نہ کرو کہ یہاں سے نکلے تو کھاؤ گے کہاں سے)۔ کتنے جانور ہیں جو اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی اُن کو روزی دیتا ہے اور تمھیں بھی اور وہ سمیع و علیم ہے[۸۶]۔ ۵۶-۶۰

۸۶؎ مطلب یہ ہے کہ خدا کی زمین بھی وسیع ہے اور اُس کا خوان کرم بھی۔ پھر وہ سمیع و علیم ہے۔ تمھاری ہر فریاد اُس تک پہنچے گی اور تمھاری کوئی پریشانی اُس سے چھپی نہ رہے گی۔ اِس لیے اگر اُس پر ایمان کا تقاضا ہے کہ اپنا وطن اور اپنے اموال و جایداد، سب چھوڑ کر نکل جاؤ تو بغیر کسی تردد کے ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہو اور یہ مت سوچو کہ آگے کیا کھاؤ گے اور کیا پہنو گے؟ اپنے رب پر بھروسا رکھو، وہی تمھیں کھلائے گا اور وہی پہنائے گا۔

سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اپنے حواریوں سے ٹھیک یہی بات فرمائی تھی۔ اُن کا ارشاد ہے:

''تم خدا اور دولت، دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اِس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پییں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ‌ ۚ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۶۱﴾ اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ

(حقیقت یہ ہے کہ اِن کی عقل ماری گئی ہے)۔

اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں سے اوندھے ہو جاتے ہیں؟[87] (کیا اِن کے معبود اِنھیں کھلاتے ہیں؟ ہرگز نہیں)، اللہ ہی اپنے

خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمھارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے اُن میں سے کسی کی مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے کل تنور میں جھونکی جائے گی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو، اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ اِس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پییں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیوں کہ اِن سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں رہتی ہیں اور تمھارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم اِن سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اُس کی بادشاہی اور اُس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیوں کہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔'' (متی ۶: ۲۵-۳۴)

۸۷؎ یعنی کہاں سے بھٹک جاتے ہیں کہ دوسروں کو ماویٰ و مرجع بنا کر اُن کو پوجتے اور اُن سے استغاثہ و استرحام کرنے لگتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یہ تو اپنے منہ سے خود اپنے مسلمہ کی تردید ہے۔

لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾

بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے، کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک، اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی برسایا، پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کر دیا تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو، شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے[88]، لیکن اِن میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔ ۶۱-۶۳

(اِس کا سبب یہ ہے کہ دنیا پر ریجھے ہوئے ہیں اور) حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی لہو ولعب کے سوا کچھ بھی نہیں[89]۔ اصل زندگی کا گھر تو آخرت کا گھر ہے، اگر یہ جانتے! ۶۴

۸۸ مطلب یہ ہے کہ جب ہر چیز کا خالق اللہ ہے اور ہر چیز اُسی کے حکم کی پابند ہے اور تمام نعمتیں بھی اُسی کی بخشی ہوئی ہیں تو پھر شکر کے حق دار دوسرے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ اُن کی عبادت یا اطاعت کی جائے؟

۸۹ یعنی آخرت کے مقابل میں، اِس لیے کہ اِس کی ہر چیز عارضی اور ایک محدود مدت کے لیے ہے۔ انسان اِس سے خالی ہاتھ اٹھتا اور موت کے دروازے سے گزر کر دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ گویا وہی معاملہ ہے کہ بچے تھوڑی دیر کے لیے کھیلیں کودیں اور پھر اپنے اپنے گھروں کو سدھار جائیں۔ یہاں بڑے سے بڑے بادشاہ کو جو کچھ میسر ہے، اُس کی حقیقت بھی اِس سے زیادہ نہیں ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

پھر (یہی لوگ ہیں کہ گویا وہ مسافر ہیں کہ) جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور وہ طوفان میں گھر جاتی ہے) تو اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس کو پکارتے ہیں[90]۔ پھر جب اللہ نجات دے کر اُنھیں خشکی کی طرف لے جاتا ہے تو نجات پاتے ہی شرک کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے جو نعمت اُن کو بخشی ہے، اُس کی ناشکری کریں اور (دنیا کی اِس زندگی سے) چند دن اور بہرہ مند ہو لیں[91]۔ (اِس کا انجام کیا ہے)؟ اب آگے جان لیں گے۔ ۶۵-۶۶

کیا اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ایک مامون حرم بنایا (جس میں یہ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں)، دراں حالیکہ اِن کے گرد و پیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں[92]؟ کیا پھر بھی باطل ہی کو مانتے ہیں اور اللہ کی اِس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟

---

۹۰ یعنی اُس وقت کوئی شریک یاد نہیں رہتا اور خدا سے مخلصانہ اطاعت کا عہد کرتے ہوئے دست بدعا ہو جاتے ہیں۔

۹۱ یعنی ہماری دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا لیں۔

۹۲ مطلب یہ ہے کہ اُس کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں جو گرد و پیش کی غارت گری اور بدامنی کے طوفان میں اِن کے لیے سفینۂ نجات بنی ہوئی ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے[۹۳] یا حق کو جھٹلائے[۹۴]، جب کہ وہ اُس کے پاس آ چکا ہے؟ کیا ایسے منکروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے! ۶۷-۶۸

(تم میرے بندوں کو بشارت دو، اے پیغمبر کہ) جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں، اُن پر ہم اپنی راہیں ضرور کھولیں گے[۹۵] اور کچھ شک نہیں کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں[۹۶]۔ ۶۹

العنکبوت
۲۹

۹۳؎ یعنی شرک کرے۔

۹۴؎ یعنی خدا کے پیغمبر اور اُس کی کتاب کا انکار کر دے۔

۹۵؎ یہ بشارت دین، دنیا اور آخرت، سب کی راہوں کے لیے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یعنی اِن کے لیے دین کی راہیں بھی کھلیں گی، اِن کی دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں گی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اِن کی رہنمائی صراط حمید کی طرف فرمائے گا۔''

(تدبر قرآن ۶/۶۶)

۹۶؎ یعنی اُن کے ساتھ ہے جو دنیا کی رغبات اور راہ حق کی مشقتوں اور مصیبتوں کے باوجود صبر و استقلال اور عزیمت و استقامت کے ساتھ اُس پر گام زن رہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بشارت ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس لیے کہ جن کو اللہ کی معیت حاصل ہو، شمس و قمر، سب اُن کی راہ میں گرد ہیں۔

سورة الروم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓـمّٓ ۚ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ﴿۲﴾ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورہ 'الٓمّٓ' ہے۔[97] رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، لیکن اپنی اِس مغلوبیت کے بعد وہ جلد ہی غالب ہو جائیں گے،[98] اگلے چند برسوں میں۔ اِس سے پہلے جو

---

۹۷ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

۹۸ اصل میں 'اَدْنَی الْاَرْضِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے مراد یہاں شام و فلسطین کی سرزمین ہے جو عرب کی سرزمین کے بالکل متصل تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو اُس وقت دنیا میں دو بڑی سلطنتیں تھیں: ایک مسیحی رومی سلطنت، دوسرے مجوسی ایرانی سلطنت۔ دونوں میں ہمیشہ رقیبانہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ ۶۰۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک بغاوت کو فرو کرنے کا بہانہ بنا کر ایران نے رومی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اِس کے بعد رومیوں کو شکست پر شکست ہوتی رہی، یہاں تک کہ ۶۱۶ء تک یروشلم سمیت روم کی مشرقی سلطنت کا بڑا حصہ ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چھٹا یا ساتواں سال تھا۔ قرآن نے یہ پیشین گوئی ۶۱۷ء اور ۶۲۰ء کے درمیان کسی وقت کی ہے۔ ''زوال روما''* کے مصنف ایڈورڈ

---

* زوال روما، ایڈورڈ گبن ۲/ ۷۸۸۔

وَمِنۢ بَعۡدُ ۚ وَيَوۡمَئِذٍ يَفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ بِنَصۡرِ اللّٰهِ ؕ يَنۡصُرُ

کچھ ہوا ہے، وہ بھی اللہ کے حکم سے ہوا ہے اور جو کچھ بعد میں ہوگا، وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا۔[99] اور ایمان والے اُس دن اللہ کی مدد سے مسرور ہوں گے۔[100] اللہ

گبن کا بیان ہے کہ یہ جس زمانے میں کی گئی، اُس وقت کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، اِس لیے کہ رومی حکمران ہرقل کے پہلے بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ بہت دن نہیں لگیں گے، یہ زیادہ سے زیادہ اگلی دہائی (بِضۡعِ سِنِيۡنَ) کے اندر پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ ٹھیک اِس اعلان کے مطابق یہ پوری ہوگئی اور مارچ ۶۲۸ء میں رومی حکمران اِس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اُس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے اور بے شمار لوگ دار السلطنت کے باہر چراغ اور زیتون کی شاخیں لیے اپنے ہیرو کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

اِس تعیین و تصریح کے ساتھ اور اِس حتمی اسلوب میں یہ پیشین گوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کی دلیل کے طور پر کی گئی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کے ساتھ مذہبی قربت، قرآن کی دعوت اور مسلمانوں کے ساتھ، خاص طور پر حبشہ میں اُن کے طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمان قدرتی طور پر اُن سے ہم دردی رکھتے تھے۔ قرآن نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ وہ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، اُن کے اہل کتاب بھائی عنقریب غلبہ حاصل کر لیں گے اور یہ پیشین گوئی اُس نبوت کی بھی بہت بڑی دلیل بن جائے گی جس پر وہ ایمان لائے ہیں، اِس لیے کہ خدا کے سوا کوئی بھی ایسی صراحت اور حتمیت کے ساتھ مستقبل کے بارے میں اِس طرح کی خبر نہیں دے سکتا۔

۹۹ یعنی اُس قانون کے مطابق ہوگا جو خدا نے قوموں کے امتحان اور اُن کے عزل و نصب کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھتا ہے کہ زمین میں اقتدار پا کر وہ کیا رویہ اختیار کرتی ہیں، پھر اُسی کے لحاظ سے اپنا فیصلہ صادر فرماتا ہے۔

مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ

جس کی چاہتا ہے، مدد فرماتا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور بڑا مہربان بھی[۱۰۱]۔ اللہ کا حتمی وعدہ ہے[۱۰۲] اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے

۱۰۰؎ یعنی یہ وہ زمانہ ہوگا، جب مسلمانوں کے لیے بھی اللہ کی مدد آ چکی ہوگی، جو اِس وقت ستائے جا رہے ہیں اور قریش کے ظلم وستم سے نجات پا کر وہ بھی خوش وخرم ہوں گے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ ۶۲۴ء میں جب قیصر روم کی فتوحات کی ابتدا ہوئی تو مسلمان نہ صرف یہ کہ یثرب میں متمکن ہو چکے تھے، بلکہ بدر کی جنگ میں قریش پر فتح پا کر اُن کی پوری قیادت کا خاتمہ بھی کر چکے تھے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ یہ خوشی بھی شامل ہوگی کہ جس کتاب پر وہ ایمان رکھتے ہیں، اُس کی ایک عظیم پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوگئی اور وہ لوگ غالب ہوگئے جو مذہب میں اُن سے قریب تر ہیں۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو غلبۂ حق کی اُس بشارت کا زمانہ بھی اللہ تعالیٰ نے بالکل متعین کر دیا ہے جو قرآن میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔

۱۰۱؎ یعنی بڑا مہربان ہے، اِس لیے اپنا کوئی مشن جب اپنے بندوں کے سپرد کرتا ہے تو لازماً اُن کی مدد بھی کرتا ہے اور اُس کے ساتھ زبردست بھی ہے، اِس لیے جب مدد کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کا یہ فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے، اُس میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔

۱۰۲؎ آیت میں 'وَعْد' کا نصب مصدر کا ہے، یعنی 'وَعَدَ اللّٰهُ ذٰلِكَ وَعْدًا'۔ اِس سے مراد اُسی نصرت کا وعدہ ہے جس کا ذکر پیچھے 'بِنَصْرِ اللّٰهِ' کے الفاظ میں ہوا، اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بھی اپنے مخالفین پر اُسی طرح غلبہ حاصل ہو جائے گا، جس طرح رومیوں کے غلبے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ آگے اِسی سورہ کی آیات ۴۷، ۶۰ میں اِس کی وضاحت ہوگئی ہے۔

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

نہیں ہیں۔ وہ صرف دنیا کی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے تو وہ بالکل ہی بے خبر ہیں[۱۰۳]۔ ۱-۷

کیا اِنھوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا[۱۰۴]؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن سب چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں، برحق[۱۰۵] اور ایک مقرر مدت ہی کے لیے پیدا

۱۰۳۔ چنانچہ نہ حالات کے باطن میں اتر کر کائنات میں خدا کے ہاتھ کی کارفرمائی کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ابتلا اور جزا و سزا اور عزل و نصب کے لیے اُس کے قوانین کو سمجھ سکتے ہیں، اِس لیے کہ آخرت سے بالکل ہی بے خبر ہیں۔

۱۰۴۔ یعنی اپنے باطن میں اتر کر اور اصل حقیقت کو پانے کی خواہش کے ساتھ غور نہیں کیا۔ اِس لیے کہ انسان جب اِس طرح غور کرتا ہے تو اُس پر حقیقت لازماً کھل جاتی ہے۔

۱۰۵۔ یعنی غایت و حکمت کے ساتھ۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جب اِس کائنات کی ہر چیز اپنے اندر ایک غایت و حکمت رکھتی ہے اور اِس کے لیے ایک مدت بھی مقرر ہے تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان جو اِس کے اندر، واضح طور پر، ایک برتر مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل بے مقصد اور عبث پیدا کیا گیا ہو؟ اِس چیز کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک روز جزا و سزا آئے جس میں وہ اپنے اعمال کی بابت مسئول ہو، اپنی نیکیوں کا صلہ پائے، اگر اُس نے نیکیاں کی ہوں اور اپنی بدیوں کی سزا بھگتے، اگر اُس نے بدیاں کمائی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ کارخانۂ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھیل اور انسان ایک شتر بے مہار اور بے غایت و مقصد وجود بن کے رہ جاتا ہے اور یہ بات اِس کائنات کی اُس مقصدیت اور حکمت کے بالکل منافی ہے جس کی شہادت اِس کے ہر گوشے سے مل رہی ہے۔" (تدبر قرآن ۶/۷۷)

بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ لَكٰفِرُوۡنَ ﴿۸﴾
اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ ؕ كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَعَمَرُوۡهَاۤ اَكۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡهَا وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ؕ ﴿۹﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيۡنَ

کیا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگوں میں بہت سے ہیں جو اپنے پروردگار سے ملاقات کو مانتے ہی نہیں[۱۰۶]۔ ۸

کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے تھے[۱۰۷]؟ وہ اِن سے قوت میں کہیں بڑھ کر تھے۔ اُنھوں نے زمینیں خوب جوتیں (کہ اُنھیں زرخیز بنائیں) اور زمین کو جتنا اِن لوگوں نے آباد کیا ہے، اُس سے کہیں زیادہ اُنھوں نے اُسے آباد کیا تھا، اور اُن کے پیغمبر اُن کے پاس نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے تھے، (لیکن نہیں مانے اور سزا پائی) تو اُن پر اللہ ظلم کرنے والا نہیں تھا، بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

۱۰۶؎ یہ علم حقیقی سے محرومی کا اصل سبب بیان کر دیا ہے کہ جب انسان اِس دنیا سے آگے کچھ سوچنے کے لیے تیار ہی نہ ہو تو اُس پر یہ حکمت کبھی نہیں کھل سکتی کہ کائنات کیوں پیدا کی گئی ہے اور اُس کا انجام کیا ہونا ہے؟

۱۰۷؎ یہ عاد و ثمود، قوم لوط اور مدین والوں کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی انکار پر جمے رہے اور بالآخر تباہ کر دیے گئے۔ انفس و آفاق کے دلائل کی طرف توجہ دلانے کے بعد قرآن بالعموم اِسی طریقے سے دینونت کے اُن واقعات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو سرزمین عرب کی قدیم اقوام کے ساتھ پیش آئے تھے۔

اَسَآءُوا السُّوْٓاٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِھَا یَسْتَھْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾
اَللّٰہُ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾
وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ
مِّنْ شُرَکَآئِھِمْ شُفَعٰٓؤُا وَکَانُوْا بِشُرَکَآئِھِمْ کٰفِرِیْنَ ﴿۱۳﴾

پھر برا کرنے والوں کا انجام بھی بالآخر برا ہی ہوا، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلا دیا[۱۰۸] اور اُن کا مذاق اڑاتے رہے۔ ۹-۱۰

اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے۔ (اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں)، پھر وہ اِسی طرح اُسے دوبارہ پیدا کر دے گا، پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے[۱۰۹] اور جس دن یہ قیامت برپا ہوگی، اُس دن مجرم مایوسی کے عالم میں حیرت زدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ (تم دیکھو گے کہ) اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی اُن کی سفارش کرنے والا نہیں ہے اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو چکے ہیں[۱۱۰]۔ ۱۱-۱۳

۱۰۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ'۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے ایک حرف عربیت کے اسلوب پر محذوف ہے، یعنی 'لِاَنْ کَذَّبُوْا'۔

۱۰۹؎ یعنی اپنے ٹھیرائے ہوئے معبودوں کی طرف نہیں، بلکہ اُسی معبود حقیقی کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو تمھارا خالق ہے۔

۱۱۰؎ آیت میں ماضی کے صیغے تقریب فہم کے لیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...گویا مخاطب جس چیز کو نہایت بعید سمجھتے ہیں، متکلم اُس کو ماضی کے اسلوب میں ایک واقع شدہ واقعے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ احوال قیامت کے بیان میں قرآن نے یہ اسلوب اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۷۹)

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ

اور جس دن یہ قیامت برپا ہوگی، اُس دن لوگ الگ الگ ہو جائیں گے۔[۱۱۱] پھر جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے، وہ ایک شان دار باغ[۱۱۲] میں شاداں وفرحاں رکھے جائیں گے۔ اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلا دیا تو وہی عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ سو اللہ کی تسبیح کرو،[۱۱۳] جس وقت تم شام کرتے ہو[۱۱۴] اور جس وقت تم صبح کرتے ہو ـــــ زمین اور

[۱۱۱] آگے وضاحت کر دی ہے کہ کس لحاظ سے الگ الگ ہو جائیں گے۔ مدعا یہ ہے کہ آخرت کا دن ایک یوم الفرقان ہوگا جو دنیا کے تمام التباسات اور شبہات کو ختم کر کے بالکل واضح کر دے گا کہ خدا نے اِسے 'بِالْحَق' پیدا کیا تھا اور یہ ٹھیک اُس انجام کو پہنچ گئی ہے، جس تک اسے پہنچنا چاہیے تھا۔

[۱۱۲] اصل میں لفظ 'رَوْضَة' آیا ہے۔ یہ اگرچہ نکرہ ہے، لیکن اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے، یعنی جنت کے باغوں میں سے ایک شان دار باغ میں۔

[۱۱۳] یعنی اُس کے بارے میں اُن حقائق کا اعتراف و اعلان کرو جو اوپر بیان کیے گئے ہیں اور اُن تمام عیوب و نقائص اور کمزوریوں سے اُسے پاک اور منزہ قرار دو جو مشرکین اپنے شرک اور انکار آخرت سے اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اِس اعتراف و اعلان کی بہترین صورت نماز ہے۔ آگے اُسی کے اوقات بیان ہوئے ہیں۔

[۱۱۴] یہ عصر اور مغرب کی نماز کا وقت ہے۔

تُظۡهِرُوۡنَ ⑱

آسمانوں میں اُسی کی حمد ہو رہی ہے[115] ـــــــ اور عشا کے وقت بھی[116] اور جب تم ظہر کرتے ہو۔ ۱۴-۱۸

۱۱۵ اوقات نماز کے بیچ میں یہ جملۂ معترضہ تذکیر و تنبیہ کے لیے آ گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ یہ خدا ہی کی تسبیح کی جو دعوت دی جا رہی ہے، یہ کوئی بے گانہ دعوت نہیں ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے سے خدا ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے۔ تو جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں، اُن کا سُر اِس کائنات کے مجموعی سُر سے بالکل بے جوڑ ہے۔ البتہ، جو لوگ خدا کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں، وہ اِس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اِس میں دعوت کے ساتھ ایک قسم کی بے نیازی کا اظہار بھی ہے کہ اگر کچھ بدقسمت خدا کی حمد و تسبیح سے گریز کریں گے تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ اِس کائنات میں اُس کی حمد و تسبیح کرنے والوں کی کمی ہے۔ آسمانوں اور زمین کا ہر گوشہ اُس کی حمد کرنے والوں سے معمور ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۸۰)

۱۱۶ آیت میں 'عَشِیّ' کا لفظ اُسی طرح ظہر کے مقابل میں ہے، جس طرح صبح کے مقابل میں شام ہے، اِس لیے اِسے عصر کے بجائے عشا ہی کے معنی میں لینا چاہیے۔ نماز کے لیے یہ اوقات کیوں مقرر کیے گئے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد و تسبیح کے لیے وہ اوقات خاص طور پر پسند فرمائے ہیں جن میں اُس کی کسی بڑی نشانی کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ رات دن میں داخل ہوتی ہے یا دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ یا سورج سمت راس سے جھکتا ہے یا رات تاریک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو انسان غور کرنے والا ہے، یہ اوقات اُس کے ذہن و دماغ پر خاص طور پر اثر انداز ہوتے اور اُس کو جھنجھوڑتے ہیں کہ وہ اُس ذات کو اِس وقت یاد کرے جس کے حکم سے یہ عظیم تغیر اِس دنیا میں واقع ہوا ہے۔ اگر اِن واقعات میں بھی کوئی شخص اللہ کی نشانیوں اور اُس کی شانوں سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ نہایت بلید جانور ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۸۰)

الروم ۳۰

يُخۡرِجُ الۡحَيَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَيِّ وَيُحۡيِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

(تمھیں تعجب ہے کہ یہ کس طرح ہو گا؟ دیکھتے نہیں ہو کہ) وہ زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے[۱۱۷] اور زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے[۱۱۸]۔ اِسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر دیکھتے دیکھتے تم انسان بن کر (زمین میں) پھیل جاتے ہو[۱۱۹]۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور اِس کے لیے اُس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی[۱۲۰]۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو غور

۱۱۷؎ یعنی زندوں پر موت طاری کرتا ہے اور بے جان مادے کے اندر زندگی کی روح پھونک کر اُس سے جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان پیدا کر دیتا ہے۔

۱۱۸؎ یہ زندہ کو مردہ سے نکالنے کی مثال ہے کہ زمین بالکل خشک اور مردہ ہوتی ہے، لیکن بارش کا ایک ہی چھینٹا پڑتا ہے اور اُس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔

۱۱۹؎ یعنی مٹی کے اندر پائے جانے والے چند بے جان مادوں سے تمھارا حیوانی وجود تخلیق کیا، پھر اُس میں روح پھونکی اور یکایک تم عقل و شعور اور جذبہ و تخیل کی حامل ایک حیرت انگیز ہستی بن کر کھڑے ہو گئے، اور اب لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں روے زمین پر پھیلتے جا رہے ہو۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ

کرنے والے ہیں[121]۔ زمین اور آسمانوں کی پیدایش اور تمھاری بولیوں اور رنگوں کا

۱۲۰ یعنی انسان کی صرف ایک صنف نہیں بنائی، بلکہ اُسے دو صنفوں کی صورت میں پیدا کیا اور دونوں کے اندر الگ الگ انفرادی خصوصیات رکھیں، لیکن پھر اُن میں ایسی مناسبت پیدا کر دی کہ دونوں ایک دوسرے سے تسکین و راحت حاصل کرتے ہیں جس کے لیے محبت و رحمت کا ایسا جذبہ اُن کے اندر ودیعت کر دیا کہ اُنھیں وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کا خیر خواہ، ہم درد و غم خوار اور شریک رنج و راحت بنا دیتا ہے۔

۱۲۱ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے اور نہ اِس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ ایک ہی خدا ہے جو اِس کا تنہا خالق، مالک اور فرماں روا ہے۔ اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ جس طرح اُس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے، اُسی طرح دوبارہ پیدا کر دے۔ چنانچہ لازماً پیدا کرے گا اور تم سب ایک دن اُس کے سامنے جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے، اِس لیے کہ یہی اُس کے عدل و حکمت کا تقاضا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے تفصیل فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس کے اندر ایک واضح نشانی تو اِس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے مقصد وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اِس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اِس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اِسی آخرت سے اِس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔

دوسری نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ ہمارا خالق نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اُس نے ہمارے اندر جوڑے کی طلب دی تو ہماری ہی جنس سے ہمارا جوڑا بھی اُس نے پیدا کیا اور پھر دونوں کے اندر محبت و ہم دردی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے تاکہ دونوں دو قالب یک جان ہو کر زندگی بسر کریں۔

تیسری نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ اِس کائنات کے اضداد کے اندر نہایت گہرا توافق اور ایک بالاتر مقصد کے لیے نہایت عمیق سازگاری پائی جاتی ہے جو اِس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اِس

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ

اختلاف بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً علم والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں[۱۲۲]۔ اِسی طرح تمھارا رات اور دن میں سونا اور اُس کا فضل تلاش

کا خالق و مالک ایک ہی ہے جو اپنی حکمت کے تحت اِس کائنات کے اضداد میں توفیق پیدا کرتا ہے۔

چوتھی نشانی اِس کے اندر یہ ہے کہ اُن لوگوں کا خیال بالکل احمقانہ ہے جو سمجھتے ہیں کہ اِس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر اِس کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے تو اِس کے اضداد میں یہ حیرت انگیز توافق کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ تو اِس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک قادر و حکیم ہستی ہے جو اِس پورے نظام کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۸۵)

۱۲۲؎ اوپر 'لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ' فرمایا تھا، یہاں 'لِلْعٰلِمِيْنَ' فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے پاس حقیقی علم ہے، وہ اِس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت اور اِس کے تضادات کے اندر سازگاری اور موافقت کو دیکھ لیتے اور اِسی سے اِس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ جس حکیم و قدیر خالق نے یہ کائنات بنائی ہے، اُس کا کوئی کام عبث نہیں ہو سکتا، لہٰذا ضروری ہے کہ ایک روز جزا آئے جس میں لوگوں کے لیے اچھے اور برے انجام کا فیصلہ کیا جائے۔ پھر یہی نہیں، اُن کے اندر یہ مشاہدہ اِس بات کا یقین و اذعان بھی پیدا کر دیتا ہے کہ کائنات کا خالق، مالک اور مدبر ایک ہی ہے۔ اُس کی خدائی میں کسی شراکت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اور ناپیدا کنار کائنات ہے اور دوسری طرف یہ کرۂ زمین ہے۔ بظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے، لیکن اِس دوری کے باوجود دونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آئے اور الگ الگ ارادوں کے تحت گردش کر رہے ہیں، بلکہ اِن کی باہمی سازگاری پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی قدیر و حکیم دونوں پر متصرف ہے اور دونوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔ اِسی طرح انسانوں کے عالم پر غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ قوموں قوموں کی زبانیں الگ اور فرد فرد کا لہجہ مختلف ہے۔ اِسی طرح اُن کے رنگ بھی الگ الگ ہیں، لیکن اِس اختلاف و تنوع کے

وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

کرنا[۱۲۳] بھی اُس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو (دل کے کانوں سے) سنتے ہیں[۱۲۴]۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ تمھیں بجلیاں دکھاتا ہے جو خوف بھی پیدا کرتی ہیں اور امید بھی[۱۲۵]، اور

باوجود کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں رنگ اور فلاں زبان و لہجہ کے لوگ الگ خدا کی مخلوق ہیں اور فلاں رنگ و روغن کے لوگ کسی الگ خالق کی مخلوق ہیں، بلکہ ہر دانش مند یہ جانتا ہے کہ ایک ہی خالق نے تمام انسانوں کو وجود بخشا ہے۔ یہ محض اُس کی حیرت انگیز کاری گری کا کرشمہ ہے کہ اُس نے ہر انسان کا لب و لہجہ اور اُس کا ناک نقشہ ایسا بنایا ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا بھی جائزہ لیجیے تو ناممکن ہے کہ کوئی دو فرد بھی آپ کو بالکل ایک ہی رنگ و روغن، ایک ہی قد و قامت اور ایک ہی ناک نقشہ کے مل سکیں۔'' (تدبر قرآن ۶/۸۶)

۱۲۳۔ اصل الفاظ ہیں: 'مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ'۔ اِن میں 'اِبْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ' کا عطف 'مَنَامُكُمْ' پر ہے، یعنی رات میں سونا اور دن میں فضل تلاش کرنا۔ اِس اسلوب کی مثالیں دوسرے مقامات میں بھی ہیں۔

۱۲۴۔ یعنی سنتے ہیں تو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ فرمایا کہ وہ اگر تنہا اِسی بات پر غور کریں کہ اُن کے خالق نے انسانی جسم کے لیے نیند اور آرام کی ضرورت اور معاش کی جدوجہد کو رات اور دن میں تقسیم کر کے کس رحمت و شفقت کے ساتھ اُنھیں اور اُن کے ماحول کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کیا یہ چیز صاف صاف ایک رب رحیم و کریم کے وجود کا پتا نہیں دے رہی؟ کیا اِس کے بعد بھی انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہو گیا ہے یا اِس میں ایک سے زیادہ خداؤں کی خدائی متصور ہو سکتی ہے یا اِس کائنات کا خالق اِسے یوں ہی ختم ہو جانے دے گا؟ اِس میں، اگر غور کیجیے تو مخالفین کے رویے پر ایک نوعیت کی تعریض بھی ہے کہ سنتے بھی ہیں تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے،

فَيُحۡيٖ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمۡ دَعۡوَةً ۖۗ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنۡ فِي

آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اُس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے[۱۲۶]۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان اُسی کے حکم سے قائم ہیں[۱۲۷]۔ پھر جب وہ زمین سے نکلنے کے لیے تم کو ایک ہی بار پکارے گا تو سنتے ہی نکل پڑو گے[۱۲۸]۔ زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، اُسی کے ہیں، سب

بلکہ اندھے اور بہرے ہو کر مخالفت کے لیے آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔

۱۲۵؎ یعنی اپنے وجود سے تعلیم دیتی ہیں کہ نعمت و نقمت، سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ جزا و سزا، دونوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور اُس کے لیے اپنی جس نعمت کو چاہے، نقمت اور نقمت کو نعمت میں تبدیل کر سکتا ہے۔

۱۲۶؎ یہ اُسی استدلال کی تفصیل ہے جو اوپر 'يُحۡيِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا' کے الفاظ میں بیان ہو چکا ہے۔

۱۲۷؎ اِس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے کہ تم اگر سن سکو تو اتھاہ خلاؤں میں گردش کرتے ہوئے نجوم و کواکب اور سورج اور چاند اور تمھاری یہ زمین، سب بول کر بتا رہے ہیں کہ وہ کسی قائم رکھنے والے کی قدرت سے قائم ہیں اور کسی چلانے والے کے زور سے چل رہے ہیں۔

۱۲۸؎ یعنی دوسری مرتبہ پکارنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ زمین و آسمان کے قیام و استحکام میں خدا کی قدرت و حکمت کا اظہار جس حیرت انگیز طریقے سے اور جس اعلیٰ سطح پر دیکھ رہے ہو، وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ وہ اگر ایک ہی پکار پکار دے تو ممکن نہیں ہے کہ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

اُسی کے فرماں بردار ہیں۔ وہی ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اُسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اُس کے لیے زیادہ آسان ہے[۱۲۹]۔ زمین اور آسمانوں میں سب سے بالاتر صفت[۱۳۰] اُسی کی ہے اور وہی عزیز و حکیم ہے[۱۳۱]۔ ۱۹-۲۷

زمین اُس کے حکم سے سرتابی کی جسارت کرے یا آسمان اُس سے سرمو انحراف کر سکے۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔

۱۲۹۔ مطلب یہ ہے کہ پہلی تخلیق کا جو مظاہرہ ہر آن دیکھ رہے ہو، اُس کے بعد دوسری تخلیق کو مستبعد کس طرح خیال کرتے ہو؟ اگر کوئی مشکل تھی تو پہلی تخلیق میں تھی۔ اِسے تو ہر حال میں آسان تر ہونا چاہیے۔

۱۳۰۔ اصل میں 'اَلْمَثَلُ الْاَعْلٰی' کا لفظ آیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی صفات کو ہم اپنی صفات پر قیاس کر کے ہی سمجھتے ہیں۔ اُن کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ہمارے فہم کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ چنانچہ اُن کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ اصلاً 'مَثَل' ہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ہم کہہ سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اُن کا جو بلند ترین مفہوم ہو سکتا ہے، خدا کے لیے وہ اُسی مفہوم میں سمجھی جائیں گی۔

۱۳۱۔ یعنی زمین و آسمان میں تمام اعلیٰ صفات کا حق دار وہی ہے۔ اِن میں کوئی دوسرا اُس کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہی سب سے بالاتر اور اپنے تمام ارادوں میں سراسر حکمت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مطلب یہ ہے کہ اُس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اُس کے ارادے میں اُس کی حکمت کے سوا کوئی چیز بھی دخیل نہیں، اور اِس ساری کائنات میں کوئی نہیں جو اُس کی صفات میں برابری کر سکے۔ اِس سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر آپ سے آپ نکل آئی

ضَرَبَ لَكُمۡ مَّثَلًا مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ هَلۡ لَّكُمۡ مِّنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ شُرَكَآءَ فِیۡ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ فَاَنۡتُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ تَخَافُوۡنَهُمۡ كَخِيۡفَتِكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ۚ فَمَنۡ يَّهۡدِىۡ مَنۡ

(تم پر تعجب ہے کہ اِس کے باوجود اُس کے شریک ٹھیراتے ہو)۔ خدا نے تمھارے لیے خود تمھاری ذات سے مثال بیان کی ہے۔ (ذرا بتاؤ کہ) ہم نے جو رزق و فضل تمھیں بخشا ہے، کیا اُس میں تمھارے مملوکوں میں سے بھی کچھ تمھارے شریک ہیں کہ تم اور وہ اُس میں برابر ہو گئے ہوں اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو، اُسی طرح اُن کا بھی لحاظ کرتے ہو؟[۱۳۲] ہم اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں، اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں۔ لیکن یہ عقل سے کہاں کام لیں گے، بلکہ اِن ظالموں (کا حال تو یہ ہے کہ اِنھوں) نے بلا دلیل اپنے تخیلات کی پیروی کر رکھی

کہ جب صفات میں کوئی اُس کی برابری کا نہیں تو اُس کے حقوق میں بھی کوئی اُس کی برابری کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔‘‘ (تدبر قرآن ۶/۸۹)

۱۳۲؎ یہ اُسی طرح کی دلیل ہے، جیسے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہو، دراں حالیکہ اپنی طرف اُن کی نسبت سے بھی تمھیں شرم محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ شرک کی تردید میں انفس و آفاق اور عقل و فطرت کے دلائل سے قطع نظر تنہا اِسی بات پر غور کرو کہ جو شراکت تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اُسے خدا کے حق میں کس طرح قبول کر لیتے ہو؟ تمھیں خیال نہیں ہوتا کہ یہ کیسا تضاد فکر و عمل ہے؟ اِس طرح کی باتیں آخر تم کس طرح گوارا کرتے ہو کہ تمھارے مملوک تو تمھارے اموال و جایداد اور عز و جاہ میں شریک نہیں ہو سکتے، لیکن خدا کی مخلوقات اور اُس کے بندے خدا کی خدائی میں ضرور شریک ہو سکتے ہیں؟

اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۹﴾
فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ

ہے! پھر اُنھیں کون ہدایت دے سکتا ہے جنھیں اللہ نے بھٹکا دیا ہو[۱۳۳]؟ اِن کا اب کوئی مددگار نہیں ہے[۱۳۴]۔ ۲۸-۲۹

(یہ حقائق مبرہن ہو گئے)، سو ایک خدا کے ہو کر[۱۳۵] تم (اپنے باپ ابراہیم کی طرح اب) اپنا رخ اُس کے دین کی طرف کیے رہو[۱۳۶]۔ تم اللہ کی بنائی ہوئی فطرت[۱۳۷] کی پیروی کرو، (اے پیغمبر)، جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے[۱۳۸]۔ اللہ کی بنائی

۱۳۳؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق بھٹکا دیا ہو کہ جو اپنی گم راہی پر اصرار کرتے ہیں، اُنھیں پھر اللہ اُسی راستے پر ڈال دیتا ہے، جس پر وہ جانا چاہتے ہیں۔

۱۳۴؎ یعنی نہ دنیا کی ضلالت سے نکالنے کے لیے کوئی مددگار ہے اور نہ آخرت میں برے انجام سے بچانے کے لیے کوئی مدد کہیں سے ملنے کی توقع ہے۔ یہ اب اِسی ہرزہ گردی میں زندگی گزاریں گے۔

۱۳۵؎ اصل میں لفظ 'حَنِيۡفًا' آیا ہے۔ یہ قرآن میں خاص طور پر اُس یک سوئی اور حنیفیت کے لیے استعمال ہوا ہے جس کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم فرمائی۔

۱۳۶؎ آیت میں خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن آگے حال اور خطاب میں جمع کے صیغوں سے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ حضور کے واسطے سے درحقیقت تمام مسلمانوں کو مخاطب فرمایا گیا ہے۔

۱۳۷؎ لفظ 'فِطۡرَتَ' کا نصب آیت میں اُس فعل سے ہے جو پچھلے جملے سے مستفاد ہوتا ہے۔ قرآن نے اُسے ظاہر نہیں کیا۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ ساری توجہ مفعول پر مرتکز رہے۔

۱۳۸؎ مطلب یہ ہے کہ یہ دین کوئی خارج کی چیز نہیں ہے جو اوپر سے تم پر لادی جا رہی

النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ

ہوئی اِس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔[139] یہی سیدھا دین ہے،[140] لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (اِس کی پیروی کرو)، تم سب اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اور اُس سے

ہے۔ یہ عین تمھاری فطرت کا ظہور ہے۔ اِس سے اختلاف کرو گے تو گویا اپنے ساتھ اختلاف کرو گے اور اپنے ہی باطن میں چھپے ہوئے خزانے سے اپنے آپ کو محروم کر لو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِس سے واضح ہوا کہ جو فلسفی یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک صفحۂ سادہ اور تمام تر اپنے ماحول کی پیداوار اور الف و عادت کی مخلوق ہے، اُن کا خیال بالکل غلط ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت اور بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اُس کو خیر و شر اور حق و باطل کی معرفت عطا فرمائی ہے اور نیکی کو اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کا جذبہ بھی اُس کے اندر ودیعت فرمایا ہے، لیکن اُس کی یہ فطرت حیوانات کی جبلت کی طرح نہیں ہے کہ وہ اُس سے انحراف نہ اختیار کر سکے، بلکہ وہ اپنے اندر اختیار بھی رکھتا ہے، اِس وجہ سے بسا اوقات وہ اِس دنیا کی محبت اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں اِس طرح اندھا ہو جاتا ہے کہ حق و باطل کا شعور رکھتے ہوئے نہ صرف باطل کی پیروی کرتا ہے، بلکہ باطل کی حمایت میں فلسفے بھی ایجاد کر ڈالتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۹۴)

انبیا علیہم السلام اِسی فطرت کی تفصیل کرتے اور اِس کے تمام مقتضیات و لوازم کو انسان کے لیے واضح کر دیتے ہیں۔ قرآن نے 'ذِکْر' اور 'ذِکْرٰی' کا لفظ اِسی پہلو سے اپنے لیے استعمال کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ وہ در حقیقت اُنھی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں، لیکن وہ اُنھیں فراموش کر بیٹھتا ہے۔

۱۳۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ'۔ اِن میں لاے نفی نفی جواز کے لیے ہے، یعنی ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور خلق سے مراد وہی فطرت ہے جس کا ذکر پیچھے ہوا ہے۔ استاذ

وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا

ڈرتے رہو اور نماز کا اہتمام رکھو[۱۴۱] اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ، اُن مشرکین میں

امام لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جو چیز اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، اُس کو بدلنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز کا خالق ہے، وہ اپنی مخلوقات کے مقاصد و مقتضیات کو جتنے بہتر طریقے پر جانتا یا جان سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جان سکتا کہ وہ کسی چیز میں ترمیم و تغیر کرنے کا حق دار بن سکے۔ اگر کوئی شخص اِس کی جسارت کرتا ہے، تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی چیز کی اصلاح کا مدعی ہے جو بالبداہت ایک حماقت ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ خدا نے آنکھیں پیشانی کے ساتھ لگائی ہیں، کوئی اُن کو گدی یا پاؤں کے ساتھ لگانے کی کوشش کرے یا اللہ تعالیٰ نے عورت کو عورت اور مرد کو مرد بنایا، لیکن عورت مرد بننے کے لیے زور لگائے یا مرد عورت بننے کا خواہش مند ہو جائے۔ اِس قسم کی سعی نامراد کا نتیجہ بگاڑ اور فساد کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ بالکل یہی حال دین فطرت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے جو مبادی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں، اُنھی پر انسان کی دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح منحصر ہے۔ اگر انسان اُس سے ذرا سا انحراف اختیار کرے تو وہ خدا کی صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا جس کا لازمی نتیجہ اُس کے دین اور اُس کی دنیا، دونوں کی تباہی ہے، اگرچہ وہ یہ انحراف علم اور سائنس کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کرے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۹۵)

۱۴۰؎ یعنی اِس میں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو نہایت قریب سے اور سیدھا خدا تک پہنچا دیتا ہے۔

۱۴۱؎ اوپر جس یک سوئی کا حکم دیا ہے، یہ اب اُس کے تقاضے بیان کر دیے ہیں کہ اُس کے لیے دل کی انابت و خشیت بھی مطلوب ہے، حدود الٰہی کی پابندی اور نماز کا اہتمام بھی جو اِن سب چیزوں کی حفاظت کرتی ہے۔

شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوۡا رَبَّهُمۡ مُّنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمۡ مِّنۡهُ رَحۡمَةً اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اٰتَيۡنٰهُمۡ ؕ فَتَمَتَّعُوۡا ۟ وقفۃ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اَمۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ

سے جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر گروہ اُسی میں مگن ہے جو اُس کے اپنے پاس ہے[۱۴۲]۔ ۳۰-۳۲

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب اُنھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو اُسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتے ہیں، پھر جب وہ اپنی طرف سے اُن کو رحمت کی لذت چکھاتا ہے تو اُن میں سے ایک گروہ یکایک اپنے پروردگار کے شریک ٹھیرانے لگتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اُنھیں عطا فرمایا ہے، اُس کی ناشکری کریں[۱۴۳]۔ اچھا تو چند

۱۴۲۔ اِس تفصیل سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے، اِس لیے کہ روے سخن قریش کی طرف ہے جنھوں نے شرک میں مبتلا ہو کر دین حنیفی میں تفرقہ ڈالا اور ایک خدا کے بجاے سیکڑوں خدا بنا لیے جس کے نتیجے میں ہر خدا کے پیرو اپنے امتیازات کے ساتھ ایک الگ گروہ بن گئے۔ اِس میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے درحقیقت اُنھی سے اظہار بے زاری کیا ہے۔

۱۴۳۔ لوگوں کے حال پر اظہار افسوس کے ساتھ یہ توحید کی ایک نہایت اہم نفسیاتی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جب انسان پر حقیقی افتقار اور بے بسی کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ تمام دوسرے اسباب و وسائل اور خود تراشیدہ معبودوں کو چھوڑ کر پوری انابت کے ساتھ اپنے رب حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اُس کی اصل فطرت کے اندر ایک خدا کے سوا کسی اور کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ لیکن جب افتقار کی حالت ختم ہو جاتی

سُلۡطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوۡا بِهٖ يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۵﴾
وَاِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَةً فَرِحُوۡا بِهَا ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌۢ بِمَا
قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ اِذَا هُمۡ يَقۡنَطُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ

روز حظ اٹھالو، پھر عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ اِن سے پوچھو، اِنھوں نے یونہی خدا کے شریک ٹھیرا لیے ہیں یا ہم نے کوئی ایسی دلیل اِن پر اتاردی ہے کہ جو یہ خدا کے شریک ٹھیراتے ہیں، وہ اُس کی شہادت دے رہی ہے[۱۴۴]؟ ۳۳-۳۵

(پھر یہی نہیں)، ہم جب لوگوں کو رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو (شکرگزاری کے بجاے) وہ اُس پر اترانے لگتے ہیں اور جو کچھ اُن کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اُس کے بدلے میں اگر کوئی تکلیف اُنھیں پہنچ جائے تو فوراً مایوس ہو جاتے ہیں[۱۴۵]۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی جس کا چاہتا ہے، رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے،

ہے تو پھر وہ اُنھی گم راہیوں میں کھو جاتا ہے جن میں وہ اِس سے پہلے کھویا ہوا تھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ شرک کا اصلی سبب انسان کی غفلت ہے۔ یہ غفلت جب قدرت کی کسی تنبیہ سے دور ہو جاتی ہے تو اُس کو اصل حقیقت نظر آجاتی ہے، لیکن جب حالات بدل جاتے ہیں تو اُس کی سابق غفلت پھر عود کر آتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۹۷)

۱۴۴؎ یہ آخر میں قریش کو تنبیہ فرمائی ہے جس میں، اگر غور کیجیے تو طنز و تحقیر اور غیظ و غضب، سب جمع ہو گیا ہے۔

۱۴۵؎ نعمت و نقمت، سب خدا کا امتحان ہے اور تمام نیک و بد کسی نہ کسی صورت میں اُس سے گزرتے ہیں، لیکن آیت میں نقمت کے ساتھ 'بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ' کے الفاظ اِس لیے آگئے ہیں کہ اشارہ قریش کی طرف ہے جنھیں درپردہ تنبیہ فرمائی ہے کہ آج تو خدا کی بخشی ہوئی نعمت پر اکڑ رہے ہو، لیکن اپنے کرتوتوں کے باعث اگر کل کسی پکڑ میں آگئے تو روؤ اور چلاؤ گے۔

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾
فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ
لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ
مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ

تنگ کر دیتا ہے؟ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان والے ہیں[۱۴۶]۔ ۳۶-۳۷

سو (رزق میں کشادگی ہو تو) قرابت منداور مسکین اور مسافر کو اُس کا حق دو[۱۴۷]۔ یہ اُن کے لیے بہتر ہے جو خدا کی رضا چاہتے ہیں اور وہی (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔ یہ سودی قرض[۱۴۸] جو تم اِس لیے دیتے ہو کہ دوسروں کے مال میں شامل ہو کر بڑھے

۱۴۶؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ ہر چیز خدا کے اختیار میں ہے اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے، اصلاً امتحان کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ بندے کے لیے دو ہی رویے ہیں کہ نعمت ملے تو شکر کرے اور مصیبت آئے تو صبر کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرے۔ انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا سرچشمہ اُس کی یہی دو صفات ہیں۔ وہ جب اِن سے محروم ہو جاتا ہے تو وہی کچھ کرتا ہے جو یہ لوگ اِس وقت کر رہے ہیں۔

۱۴۷؎ یعنی وہ حق جو خدا نے ہمیشہ سے مقرر کر رکھا ہے، اِس لیے کہ نہیں دو گے تو خدا کے ہاں غصب حقوق کے مجرم ٹھیرو گے اور تمھارا مال خود تمھارے لیے وبال بن جائے گا۔ اوپر جس شکر گزاری کی تلقین ہے، یہ اُسی کا طریقہ بتایا ہے۔

۱۴۸؎ اصل میں لفظ 'رِبا' آیا ہے۔ یہ یہاں 'تسمیة الشیء بما یئول إلیه' کے اسلوب پر استعمال ہوا ہے، یعنی اُس مال کے لیے جو سود کما لائے گا۔

زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿٣٩﴾

تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا[149] اور جو صدقہ[150] تم دیتے ہو کہ اُس سے اللہ کی رضا چاہتے ہو تو اُسی کے دینے والے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھا رہے ہیں۔[151] ۳۸-۳۹

الروم ۳۰

۱۴۹؎ یعنی دنیا میں تو یقیناً بڑھتا ہے اور تم دس کے بیس اور بیس کے سو بنا لیتے ہو، لیکن اللہ کے ہاں اُس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی، بلکہ الٹا تمھارے لیے وبال بن جاتا ہے، اِس لیے کہ جو کچھ بڑھا کر لاتا ہے، دوسروں پر ظلم کر کے لاتا ہے۔

۱۵۰؎ اصل میں لفظ 'زکٰوۃ' استعمال ہوا ہے، لیکن چونکہ نکرہ ہے، اِس لیے اِسے اصطلاحی مفہوم میں نہیں، بلکہ عام صدقات کے مفہوم میں لینا چاہیے۔

۱۵۱؎ یہ اُس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو انفاق کرنے والوں کے ساتھ خدا نے کر رکھا ہے کہ وہ اُس کا اجر اُنھیں اتنا بڑھا کر دے گا کہ وہ نہال ہو جائیں گے۔ اِس سے، اگر غور کیجیے تو قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ آخرت کو پانے کے لیے بعض اوقات دنیا کو کھونا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے، اِس لیے کہ خدا کی اِس ابدی بادشاہی کے مقابلے میں دنیاے دوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ اُس زمانے میں سودی قرض بالعموم تجارتی اور کاروباری مقاصد ہی کے لیے دیے جاتے تھے اور اِس طرح قرآن کی تعبیر کے مطابق دوسروں کے مال میں شامل ہو کر بڑھتے تھے۔ بالبداہت واضح ہے کہ ضرورت مندوں کو دیے جانے والے صرفی قرضوں کے لیے یہ تعبیر کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...آیت کے الفاظ پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ سود خوار کے مال کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے سانڈ سے تشبیہ دی ہے جو دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآىٕكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی

(قریش کے لوگو)، اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمھیں روزی دی، پھر تم کو مارتا ہے، پھر تمھیں زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے شریکوں میں بھی کوئی ایسا ہے جو اِن کاموں میں سے کوئی کام کرتا ہو؟[152] وہ پاک اور بالاتر ہے اُن سب چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔[153] (تم نے دیکھا نہیں کہ) لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی سے خشکی اور تری[154] میں فساد برپا ہو گیا ہے۔[155] (یہ خدا کو دعوت دے رہا ہے) کہ وہ

ہے۔ اِس وجہ سے اُس کی فربہی میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ خیر و برکت صرف اُس مال میں ہے جو اپنی چراگاہ میں چر کر پروان چڑھتا ہے، پھر خدا کی رضا جوئی اور ادائے حقوق کی راہ میں قربان ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۹۹)

۱۵۲؎ مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہی تنہا معبود ہے، وہی مارتا، جلاتا، پیدا کرتا اور روزی دیتا ہے تو آخر کن کے بل بوتے پر اکڑ رہے ہو اور اگر اُس کی پکڑ میں آ گئے تو کون تمھارے کام آئے گا؟

۱۵۳؎ اوپر کی بات خطاب کے صیغے میں تھی۔ یہ جملہ غائب کے صیغے میں ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ بات کرتے کرتے گویا متکلم نے اپنے مخاطبین سے منہ پھیر لیا ہے۔

۱۵۴؎ یہ الفاظ احاطہ پر دلیل ہیں، جیسے روز و شب اور صبح و شام وغیرہ۔

۱۵۵؎ روم و ایران کے درمیان جس کشمکش اور جنگ و جدال کا ذکر سورہ کے شروع میں ہوا ہے، یہ اُس کی طرف اشارہ ہے۔ اِس طرح کا فساد انسانی تاریخ میں وقتاً فوقتاً برپا ہوتا رہتا ہے۔ قریب کے زمانے میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم اِسی کی مثال ہے۔ یہ اُس وقت برپا ہوتا ہے،

النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾
قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾
فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ

اُن کے بعض کرتوتوں کا مزہ اُنھیں چکھائے تا کہ وہ رجوع کریں۔[156] ۴۰-۴۱

(اِس لیے متنبہ ہو جاؤ، تمھاری طرف تو خدا کا رسول آگیا ہے)۔ اِن سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ (رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد) اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو پہلے گزرے ہیں۔ اُن میں سے اکثر (تمھاری طرح) مشرک ہی تھے۔ ۴۲

سو (نہیں سنتے تو پروا نہ کرو، اے پیغمبر، اور) اپنا رخ دین قیم کی طرف سیدھا رکھو، اِس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آجائے جس کے لیے واپسی نہیں ہے۔ اُس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔[157] جس نے انکار کیا تو اُس کے

جب قوموں کے مفادات اور دوسروں پر علو و برتری کی خواہش اُنھیں اخلاقی اصولوں سے یک سر بے گانہ کر دیتی ہے اور وہ عدل وقسط کے بجائے ظلم وعدوان کو اپنی پالیسی بنا لیتی ہیں۔

۱۵۶؎ اپنے تمام کرتوتوں کا مزہ تو لوگ آخرت ہی میں چکھیں گے، لیکن بعض کرتوتوں کے لیے روز مکافات بسا اوقات اِسی دنیا میں آجاتا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگ متنبہ ہوں اور آخرت کی جزا و سزا سے پہلے اپنے خالق کی طرف رجوع کر لیں۔

۱۵۷؎ یعنی سب متفرق ہو جائیں گے، کوئی کسی کے لیے کام آنے والا نہ بنے گا۔

صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ

انکار کا وبال اُسی پر ہوگا[۱۵۸] اور جنھوں نے اچھے عمل کیے تو وہ اپنے ہی لیے اپنی راہ سنواریں گے۔ یہ اِس لیے ہوگا کہ جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، اللہ اُن کو اپنے فضل سے جزا دے[۱۵۹]۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ منکروں کو پسند نہیں کرتا[۱۶۰]۔ ۴۴-۴۵

اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ہواؤں کو (باران رحمت کی) خوش خبری دینے والی بنا کر بھیجتا ہے اور اِس لیے بھیجتا ہے کہ تم کو اپنی رحمت کی لذت چکھائے اور اِس لیے کہ کشتیاں (اِن ہواؤں کی مدد سے) اُس کے حکم سے چلیں اور اِس لیے

۱۵۸؎ یعنی کوئی دوسرا اُس کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا۔

۱۵۹؎ یہی قیامت کی اصل غایت ہے۔ وہ اِسی لیے برپا کی جائے گی کہ ماننے والوں کو اُن کے ایمان و عمل کی جزا دی جائے۔ نہ ماننے والوں کی سزا اُس کی اصل غایت نہیں، بلکہ لازمی نتیجہ ہے۔ پھر مزید یہ کہ ماننے والوں کو یہ جزا اُن کا پروردگار اُن کے اعمال کے پیمانے سے نہیں، بلکہ اپنے فضل کے پیمانے سے دے گا اور اللہ تعالیٰ کا فضل ایسی چیز ہے کہ استاذ امام کے الفاظ میں، اُس کا اندازہ ہم اپنے پیمانوں اور قیاسوں سے نہیں کر سکتے۔

۱۶۰؎ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سخت نفرت و کراہت کا اظہار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اُنھیں پسند نہیں کرتا، لہٰذا اُس کو کوئی پروا بھی نہیں ہے کہ وہ کس انجام کو پہنچتے اور کس جہنم میں جا کر گرتے ہیں۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ

الروم ۳۰

کہ تم اُس کے فضل کے طلب گار بنو اور اِس لیے کہ تم اُس کا شکر ادا کرو۔۴۶

(اِسی طرح ہماری مدد بھی آئے گی)۔تم سے پہلے بھی ہم نے رسولوں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا تھا، پھر وہ کھلی کھلی نشانیاں لے کر اُن کے پاس آئے تو ہم نے مجرموں سے (اُن کے جھٹلانے کا) انتقام لیا اور ہم پر لازم تھا کہ ایمان والوں کی مدد کریں[۱۶۱]۔(حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی ہے جو رحمت کی ہوائیں بھیجتا ہے، پھر وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر اللہ جس طرح چاہتا ہے، اُنھیں آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اُنھیں تہ بر تہ کرتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن کے اندر سے مینہ نکلا چلا آتا ہے، پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے، اُسے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش ہو جاتے ہیں، دراں حالیکہ اُس کے اپنے اوپر نازل ہونے سے قبل، اِس خوشی سے پہلے وہ بالکل مایوس تھے۔سو (تم بھی مطمئن رہو[۱۶۲] اور) رحمت الٰہی

۱۶۱؎ ہم جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں کہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔

۱۶۲؎ اِس لیے کہ اُس کی یہی شان رحمت عنقریب تمھارے لیے بھی ظاہر ہو جائے گی۔

رَحۡمَتِ اللّٰہِ کَیۡفَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۵۰﴾

وَ لَئِنۡ اَرۡسَلۡنَا رِیۡحًا فَرَاَوۡہُ مُصۡفَرًّا لَّظَلُّوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۵۱﴾

فَاِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ﴿۵۲﴾

الروم ۳۰

کے اِن آثار کو دیکھو، وہ زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے۔ بے شک، وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۱۶۳] ۴۷-۵۰

(اِن لوگوں کا کیا ہے)! اگر ہم دوسری ہوا بھیج دیں، پھر یہ اپنی کھیتی کو[۱۶۴] پیلا پڑا ہوا دیکھیں تو اِس کے بعد منکر ہو کر رہ جائیں گے۔[۱۶۵] سو تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ

۱۶۳؎ اوپر کی آیتوں میں دنیا کی کامیابی کی بشارت تھی۔ یہ اب آخرت میں بھی خدا کی رحمت کے ظہور کی طرف اشارہ فرما دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...مطلب یہ ہے کہ کفار آخرت کو جو جھٹلاتے اور اُس کو محض تمھارا خواب و خیال قرار دیتے ہیں، تم اُن کی بوالفضولیوں کی پروا نہ کرو۔ خدا کی یہ عظیم رحمت ظاہر ہو کے رہے گی اور تمھارے یہ حریف اُس دن اپنی بدبختی و محرومی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ یہ حقیقت قرآن سے واضح ہے کہ قیامت دراصل اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا مقتضیٰ ہے اور اُس کا اصل مقصد اہل ایمان کو اُن کی جاں بازیوں کا صلہ دینا ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۶/ ۱۰۸)

۱۶۴؎ اصل میں ضمیر ہے جس کا مرجع ’یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا‘ کے جملے سے مفہوم ہو رہا ہے، یعنی ’زَرۡع‘ یا اُس کے ہم معنی کوئی لفظ جو ’مُصۡفَرًّا‘ سے مناسبت رکھتا ہو۔

۱۶۵؎ مطلب یہ ہے کہ اِن سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، یہ نہ نعمت پر شکر کی توفیق پاتے ہیں اور نہ مصیبت پر صبر کر سکتے ہیں۔ تمھاری باتیں اِس طرح کے لوگوں کے دلوں میں نہیں اتریں گی۔

وَمَآ اَنۡتَ بِهٰدِ الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۵۳﴾

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ ضُعۡفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ ضُعۡفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ قُوَّةٍ ضُعۡفًا وَّ شَیۡبَةً ؕ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ

الروم ۳۰

بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو، جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہوں۔[۱۶۶] اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گم راہی سے موڑ کر راہ راست دکھا سکتے ہو۔[۱۶۷] تم تو صرف اُنھی کو سنا سکتے ہو جو ہماری نشانیوں[۱۶۸] کے ماننے والے ہوں۔ سو وہی اطاعت کرنے والے ہوں گے۔ ۵۱-۵۳

(یہ کس چیز پر نازاں ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی ہے جس نے تم سب لوگوں کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت دی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری

۱۶۶؎ یعنی بہرے بھی اگر متوجہ ہوں تو اُن سے کچھ سننے سمجھنے کی توقع کی جا سکتی ہے، لیکن جو بہرے بھی ہوں اور پیٹھ پھیر کر بھاگے بھی جا رہے ہوں، اُن کو کوئی کیا سنائے اور کس طرح سنائے؟

۱۶۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَآ اَنۡتَ بِهٰدِ الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ'۔ اِن میں 'عَنۡ' اِس بات پر دلیل ہے کہ لفظ 'ہدایت' یہاں 'صَرۡف' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔

۱۶۸؎ اِن سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہیں جن کا ذکر پیچھے تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ تمھاری باتیں اگر کارگر ہو سکتی ہیں تو اُن لوگوں پر کارگر ہو سکتی ہیں جو خدا کی قدرت، رحمت اور اُس کے عدل کی اُن نشانیوں کو مانتے ہوں جو آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جو اِن کو نہ مانتے ہوں، اُن کے آگے سارا وعظ بھینس کے آگے بین بجانے کے حکم میں داخل ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۱۰۹)

وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۫ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

کر دیا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کر دیتا ہے اور وہی علیم و قدیر ہے۔ ۵۴

(یہ جس کو دور سمجھ رہے ہیں)، جس دن وہ قیامت برپا ہو گی، یہ مجرم قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اپنی قبروں میں وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ یہ اِسی طرح اوندھے ہوتے رہے تھے۔[۱۶۹] اِس کے برخلاف جن کو علم[۱۷۰] اور ایمان عطا ہوا، وہ کہیں گے کہ اللہ کے نوشتے میں تو تم قیامت کے دن تک رہے ہو۔ سو یہ قیامت کا دن ہے، لیکن تم جانتے نہیں تھے۔[۱۷۱] پھر اُس دن ظالموں کو نہ اُن کی معذرت نفع دے گی اور نہ اُن کو موقع دیا جائے گا کہ خدا کو راضی کر لیں۔ ۵۵-۵۷

---

۱۶۹ یعنی اِسی طرح کے غلط اندازے لگاتے رہے تھے۔ چنانچہ آج جس کو گھڑی دو گھڑی کی بات سمجھ رہے ہیں، اُسی کو دنیا میں ایسا بعید سمجھتے تھے کہ موت اور موت کے بعد کے مراحل کے بارے میں کبھی فکرمند ہونے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔

۱۷۰ یعنی علم حقیقی جو خدا اور آخرت پر ایمان کا ذریعہ بنتا ہے۔

۱۷۱ یعنی اُس وقت جاننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

(یہ نشانی مانگتے ہیں)۔ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں (اور وہی کافی ہیں)۔تم اِن کے پاس کوئی سی نشانی بھی لے آؤ گے تو جو انکار کا فیصلہ کر چکے ہیں، وہ یہی کہیں گے کہ تم لوگ نرے جھوٹے ہو۔اللہ اِسی طرح اُن لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جو جاننا نہیں چاہتے۔سو، (اے پیغمبر)، صبر کرو۔ بے شک، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور (متنبہ ہو جاؤ کہ) اُس کے وعدوں پر یقین نہ رکھنے والے یہ لوگ تمھیں ہرگز بے وزن نہ بنانے پائیں۔[۷۲] ۵۸-۶۰

۷۲؎ یعنی ایسا نہ ہو کہ اِن کے شور و غوغا، بہتان و افترا اور طنز و استہزا کے طوفان میں اپنی بات تمھیں بے وزن معلوم ہونے لگے۔نہیں، بلکہ خدا کے وعدوں پر تمھارا یقین اِس قدر راسخ ہونا چاہیے کہ اُس کے مقابل میں یہ اپنے آپ کو بے وزن محسوس کریں۔

کوالالمپور

۵/ مارچ ۲۰۱۴ء

الروم ۳۰

لقمان - السجدة

۳۱ ـــــ ۳۲

لقمان - السجدة

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ حکیم لقمان کے حوالے سے دین فطرت کے جن حقائق کا اثبات کرتی ہے، دوسری میں اُنھی کے متعلق لوگوں کے اُن شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو اُس وقت پیش کیے جا رہے تھے۔

دونوں کا موضوع وہی انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے اور دونوں کے مخاطب قریش مکہ ہیں۔

اِن سورتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب ہجرت و براءت اور فتح و نصرت کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔

سورۃ لقمان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓـمّٓ ۚ﴿۱﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّلۡمُحۡسِنِیۡنَ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ

لقمان ۳۱

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الٓمّٓ' [۱] ہے۔ یہ پرحکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔ اُن کے لیے جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں [۲] ہدایت اور رحمت [۳] بن کر نازل ہوئی ہیں۔ یہ جو نماز کا اہتمام کر رہے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور یہی ہیں جو آخرت پر سچا یقین رکھتے ہیں [۴]۔ یہی اپنے

۱۔ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

۲۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کی پیروی کی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے صحیح کام لیا، پوری بصیرت کے ساتھ حقائق کو تسلیم کیا اور اُن کے جو تقاضے بھی سامنے آئے، پورے اخلاص کے ساتھ اُن کے مطابق عمل کرنے لگے۔

۳۔ یعنی دنیا میں ہدایت اور آخرت میں فضل و رحمت جو اِس ہدایت کو اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

۴۔ اِس سے معلوم ہوا کہ آخرت پر سچا یقین ہو تو آدمی نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں ہو سکتا

رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٦﴾
وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ

پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ ۱-۵

اِس کے برخلاف لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو فضولیات[5] کے خریدار بنتے ہیں[6] تاکہ اللہ کی راہ سے بغیر کسی علم[7] کے گم راہ کریں اور اُس کی آیتوں کا مذاق اڑائیں۔ یہی ہیں کہ جن کے لیے ذلت کا عذاب ہے[8]۔ اِن میں سے کسی کو جب ہماری یہ آیتیں سنائی جاتی ہیں تو بڑے تکبر کے ساتھ اِس طرح منہ پھیر کر چل دیتا ہے، جیسے اُن کو

اور اپنی اِس غفلت کے باوجود اگر وہ اِس کا مدعی ہے کہ آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اپنے اِس دعوے میں بالکل جھوٹا ہے۔

۵ اصل میں 'لَهْوَ الْحَدِيْثِ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اُسی طرح کی ترکیب ہے، جیسے دوسرے مقام میں 'زُخْرُفَ الْقَوْلِ' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ لفظ کتاب حکیم کی آیتوں کے مقابل میں ہے، اِس وجہ سے اِس سے مراد وہ فضولیات و خرافات ہوں گی جو مفسدین لوگوں کو آیات الٰہی سے برگشتہ کرنے کے لیے پھیلاتے تھے۔

۶ یعنی اُن کو ترجیح دیتے اور اُن کے طلب گار بنتے ہیں۔ لفظ 'اِشْتِرَاء' جب معنوی چیزوں کے لیے استعمال کیا جائے تو اِسی مفہوم میں آتا ہے۔

۷ یعنی بغیر کسی دلیل و برہان کے۔

۸ آگے وضاحت فرما دی ہے کہ اِن کا اصلی جرم استکبار ہے اور استکبار کے بارے میں

اُذُنَيۡهِ وَقۡرًا ۚ فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتُ النَّعِيۡمِ ﴿۸﴾ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۹﴾

سنا ہی نہیں، جیسے کانوں سے بہرا ہے۔ سو اِسے ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے، اُن کے لیے راحت کے باغ ہیں کہ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا[۹] اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۱۰]۔ ۶-۹

قرآن اور دوسرے الہامی صحائف میں جگہ جگہ واضح کیا گیا ہے کہ اُس کی سزا ذلت اور رسوائی ہے۔

۹۔ اِس جملے میں تاکید در تاکید کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...اِس تاکید کی ضرورت اِس وجہ سے تھی کہ اوپر آیت ۶ میں ذکر ہو چکا ہے کہ مستکبرین اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کے استہزا کا خاص ہدف وہ آیتیں تھیں جن میں اُس دور کے بے بس اور غریب مسلمانوں کو ایک ابدی بادشاہی کی خوش خبری سنائی جاتی تھی۔ معاملے کا یہ پہلو مقتضی ہوا کہ یہ بات یہاں پورے زور اور تاکید سے کہی جائے کہ مذاق اڑانے والے اگر اِس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑائیں، لیکن اہل ایمان اطمینان رکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۱۲۳)

۱۰۔ یعنی نہ ظالموں اور مستکبروں کے مقابلے میں کوئی بے بس ہستی ہے کہ عاجز ہو کر بیٹھا رہے اور نہ یہ دنیا اُس نے کھیل تماشے کے طور پر بنائی ہے کہ اُسے کسی انجام حق تک پہنچائے بغیر ختم کر دے۔ وہ یہ لازماً کرے گا، اِس لیے کہ عزیز و حکیم ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۰﴾
هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۱﴾
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا

اُس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بنا دیا ہے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑ جما دیے ہیں کہ وہ تمھیں لے کر جھک نہ پڑے[۱۱] اور اُس میں ہر طرح کے جان دار پھیلا دیے ہیں۔ (دیکھتے نہیں ہو کہ) ہم نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اِسی زمین میں ہر قسم کی فیض بخش چیزیں پیدا کر دی ہیں۔۱۰

یہ سب تو اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، اب مجھے دکھاؤ کہ (تمھارے زعم کے مطابق) جو اُس کے سوا ہیں، اُنھوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ کچھ نہیں، بلکہ یہ ظالم صریح گم راہی میں ہیں۔۱۱

ہم نے یہی حکمت[۱۲] لقمان[۱۳] کو بھی دی اور ہدایت فرمائی تھی کہ اللہ کا شکر ادا

۱۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ'۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے لام علت عربیت کے اسلوب پر مقدر ہے۔ یہ غالباً وہی چیز ہے جسے جدید سائنس میں 'isostasy' کہا جاتا ہے۔ قرآن کے اِس بیان سے پہاڑوں کے بارے میں یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمندروں کے نیچے کے کثیف مادے کو متوازن رکھنے کے لیے سطح زمین پر ابھرے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو زمین اُسی طرح ہلتی رہتی، جس طرح اب زلزلہ آ جائے تو ہلتی ہے۔

۱۲؎ یعنی جو اِس کتاب حکیم میں بیان کی جا رہی ہے۔ سورہ کی ابتدا میں کتاب کے ساتھ

يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

کرو[۱۴] ـــــ اور جو شکر کرے گا تو وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ کو اُس کی کچھ پروا نہیں، اِس لیے کہ اللہ بے نیاز ہے، وہ اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔۱۲

حکیم کی صفت اِسی رعایت سے آئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ لقمان جسے تم اپنی قوم کا سقراط و فلاطوں سمجھتے ہو، اُس کی تعلیمات بھی وہی تھیں جو آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔

۱۳[ا] یہ عرب میں ایک حکیم و دانا کی حیثیت سے مشہور تھے۔ شعراے جاہلیت اپنے شعروں میں اِن کا اور اِن کے قبیلے کا ذکر کرتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں اِن کو اور اِن کی قوم کو بڑی شان و شوکت حاصل تھی اور یہ قوم عاد کے بقایا میں سے تھے۔ اِسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اپنے قبیلے پر اِن کو ایک پدرسرانہ قسم کی سرداری حاصل تھی۔ آگے جو نصیحتیں نقل ہوئی ہیں، اُن سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ غالباً بیٹے کو سرداری کی ذمہ داریاں سونپتے ہوئے کی گئی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''لقمان کی یہ نصیحتیں اگرچہ ہر شخص کے لیے اپنے اندر یکساں خیر و برکت رکھتی ہیں، لیکن اُن لوگوں کے لیے یہ خاص اہمیت رکھنے والی ہیں جن کو قیادت و سربراہی اور امارت و حکومت کا مقام حاصل ہو۔ اِس وجہ سے ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لقمان صرف ایک حکیم نہیں، بلکہ ایک حکمران حکیم تھے۔ اُن کو اپنی قوم کی سربراہی حاصل تھی اور یہ نصیحتیں اپنے بیٹے کو اُنھوں نے سرداری و قیادت کی ذمہ داریاں سمجھانے کے لیے کی ہیں۔ یہ اگرچہ نبی نہیں تھے، لیکن اُن کو حضرت داؤد سے فی الجملہ مشابہت ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۱۳۳)

۱۴[ا] یہ حکمت کا اولین ثمر ہے۔ تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی معرفت اِسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کی کتاب جس حکمت کو لے کر نازل ہوئی ہے، اُس کی بنیاد یہی شکر گزاری ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو انسان کے اندر اُن صفات میں سے کوئی صفت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جن کا ذکر سورہ کی ابتدا میں ہوا ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ

(اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھیرایا جائے)۔ یاد کرو، جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا[15] کہ بیٹا، اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھیرانا۔ حقیقت یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ ۱۳

(اِس میں شبہ نہیں کہ) ہم[16] نے انسان کو اُس کے والدین کے بارے میں بھی نصیحت کی ہے[17]۔

۱۵؎ یعنی یونہی راہ چلتے کچھ باتیں نہیں کہہ دی تھیں، بلکہ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہی تھیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِس سے موقع اور بات، دونوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی سرسری بات نہیں ہے جو راہ چلتے کہہ دی گئی ہو، بلکہ لقمان نے خاص اپنے بیٹے کو، ایک اہم موقع پر، خاص اہتمام کے ساتھ بطور ایک موعظت کے بتائیں اور اِن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید کی۔ اِس سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو توجہ دلانا ہے کہ ایک دانش مند باپ اپنے بیٹے کو کیا تعلیم دیتا تھا اور آج اُس کے احمق نام لیوا اپنی اولاد کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں!'' (تدبر قرآن ۶/۱۲۸)

۱۶؎ یہاں سے آگے آیت ۱۵ تک تضمین ہے۔ لقمان نے اللہ تعالیٰ کے حق کے پہلو بہ پہلو اپنے حق کا ذکر غالباً اِس لیے نہیں کیا کہ اُنھوں نے اِسے خلاف ادب خیال کیا ہے۔ چنانچہ اِس کو چھوڑ کر وہ قیامت کے ذکر کی طرف بڑھ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات اِسی خلا کو بھرنے کے لیے ارشاد ہوئی ہیں۔

۱۷؎ یہ نصیحت تمام الہامی صحائف میں بیان ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے بھی ایک سے زیادہ

وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾
وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا

اُس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اُس کو پیٹ میں رکھا اور (پیدایش کے بعد) کہیں دو سال میں جا کر اُس کا دودھ چھڑانا ہوا۔[۱۸] (ہم نے اُس کو نصیحت کی ہے) کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے۔[۱۹] (اور یاد رکھو کہ بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ لیکن اگر وہ تم پر زور ڈالیں کہ کسی کو میرا شریک ٹھیراؤ جس کے بارے میں تمھارے پاس کوئی دلیل

مقامات پر اِس کی تلقین فرمائی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین ہی کا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے بعد وہی اُس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۱۸؎ آیت میں ولادت کا ذکر نہیں ہوا۔ اِس کی وجہ غایت وضاحت ہے۔ قرآن میں اِسی کے پیش نظر بعض چیزیں لفظاً محذوف ہو جاتی ہیں۔ بچے کی پرورش کے معاملے میں باپ کی شفقت بھی کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن حمل، ولادت اور رضاعت کے مختلف مراحل میں جو مشقت بچے کی ماں اٹھاتی ہے، اُس میں یقیناً اُس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اِسی بنا پر ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین درجے زیادہ قرار دیا ہے۔*

۱۹؎ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا، اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی اُن کے ساتھ انتہائی احترام سے پیش آئے، اُن کے خلاف دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے، اُن کے سامنے سوء ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ اُن کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں اُن کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

* بخاری، رقم ۵۹۷۱۔ مسلم، رقم ۶۵۰۰۔

تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِي الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾

نہیں ہے تو اُن کی بات نہ ماننا۔[۲۰] دنیا میں، البتہ اُن کے ساتھ نیک برتاؤ رکھنا[۲۱] اور پیروی اُنھی کے طریقے کی کرنا جو میری طرف متوجہ ہیں۔[۲۲] پھر تم کو میری ہی طرف پلٹنا ہے۔ پھر میں تمھیں بتا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔[۲۳] ۱۴-۱۵

۲۰؎ والدین کی اِس حیثیت کے باوجود یہ حق اُن کو حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو بے دلیل اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں۔ چنانچہ خدا سے انحراف کی دعوت والدین بھی دیں تو قبول نہیں کی جاسکتی۔ یہاں صرف شرک کا ذکر ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام و ہدایات بھی اِسی کے تحت سمجھے جائیں گے اور والدین کے کہنے سے اُن کی خلاف ورزی بھی کسی کے لیے جائز نہیں ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت تو صرف بھلائی کے کاموں میں ہے۔*

۲۱؎ مطلب یہ ہے کہ شرک جیسے گناہ پر اصرار کے باوجود دنیا کے معاملات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ دستور کے مطابق اُسی طرح قائم رہنا چاہیے۔ اُن کی ضروریات حتی المقدور پوری کرنے کی کوشش کی جائے اور اُن کے لیے ہدایت کی دعا بھی برابر جاری رہے۔ دین و شریعت کا معاملہ الگ ہے، مگر اِس طرح کی چیزوں میں اولاد سے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

۲۲؎ یعنی خدا سے منحرف کسی شخص کی راہ اختیار نہیں کی جاسکتی، اگرچہ وہ آدمی کے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا کے دین میں اِس کی گنجایش نہیں ہے۔ انسان کو اگر پیروی کرنی ہو تو اِس کے لیے اُنھی لوگوں کی طرف دیکھنا چاہیے جو خدا کی راہ پر ہیں۔

۲۳؎ یہ آخر میں اولاد اور والدین، دونوں کو توجہ دلائی ہے کہ اعمال کی جواب دہی کے

* بخاری، رقم ۷۱۴۵۔ مسلم، رقم ۴۷۶۶۔

لقمان ۳۱

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿١٦﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ

(لقمان نے کہا تھا): بیٹا، بات یہ ہے[24] کہ کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں[25] ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں، اللہ اُسے نکال لائے گا۔ بے شک، اللہ باریک بین ہے، وہ ہر چیز سے باخبر ہے[26]۔ ۱۶

بیٹے، نماز کا اہتمام رکھو[27]، بھلائی کی تلقین کرو اور برائی سے روکو[28]، اور (اِس راہ

لیے ایک دن پلٹنا میری ہی طرف ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ خطاب والدین اور اولاد، دونوں سے یکساں ہے اور اِس میں تنبیہ بھی ہے اور اطمینان دہانی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے اور اُس دن جو کچھ جس نے کیا ہو گا، میں اُس کے سامنے رکھ دوں گا۔ اگر کسی کے والدین نے میرے بخشے ہوئے حق سے غلط فائدہ اٹھا کر اولاد کو مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کی تو وہ اُس کی سزا بھگتیں گے اور اگر اولاد نے والدین کے حق کے ساتھ ساتھ میرے حق کو بھی کما حقہٗ پہچانا اور اِس حق پر قائم رہنے میں استقامت دکھائی تو وہ اپنی اِس عزیمت کا بھرپور صلہ پائے گی۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۱۳۰)

۲۴ آیت میں 'اِنَّھَا' کی ضمیر مونث ہے۔ یہ ضمیر قصہ ہے جو متکلم اپنے معہود ذہنی کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے۔ یہاں یہ لفظ 'حَبَّة' کی رعایت سے استعمال ہوئی ہے۔

۲۵ اصل میں لفظ 'صَخْرَة' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ پہاڑی اور گھاٹی کے لیے بھی آتا ہے۔

۲۶ توحید کے بعد یہ لقمان نے قیامت کے بارے میں بھی ہر اُس مغالطے کو دور کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم سے ناآشنائی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

۲۷ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا سب سے بڑا مظہر نماز ہے، چنانچہ اعمال میں سب سے پہلے اِسی کی تلقین کی ہے۔

عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿ۚ۱۷﴾
وَ لَا تُصَعِّرۡ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ
لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ﴿ۚ۱۸﴾ وَ اقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِکَ وَ اغۡضُضۡ

میں) جو مصیبت تمھیں پہنچے، اُس پر صبر کرو[۲۹]۔ اِس لیے کہ یہی کام ہیں جن کی تاکید کی گئی ہے۔ ۱۷

اور لوگوں سے بے رخی نہ کرو[۳۰] اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، اِس لیے کہ اللہ کسی اکڑنے اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا[۳۱]۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز

لقمان
۳۱

۲۸ یعنی انسانی فطرت میں جو باتیں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں، اُن کی تلقین کرو اور جن کو فطرت ناپسند کرتی اور پوری انسانیت برائی سمجھتی ہے، اُن سے لوگوں کو منع کرتے رہو۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایمان کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے اور ہر مسلمان اپنے ماحول میں اِس کا مکلّف ٹھیرایا گیا ہے۔ خدا نے جو ہدایت ہمیں دی ہے، یہ اُس کی شکرگزاری کا اظہار ہے۔

۲۹ اِس لیے کہ یہی عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔ اِسی سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوش گوار تجربات پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجائے وہ اُنھیں رضامندی کے ساتھ قبول کرے اور خدا کی طرف سے مان کر اُن کا استقبال کرے۔ اِس کی جتنی ضرورت خود بھلائی کے راستے پر چلنے کے لیے ہے، اُس سے زیادہ دوسروں کو بھلائی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے ہے۔

۳۰ اِس میں خاص طور پر اشارہ اُن غربا کی طرف ہے جن کو امرا و اغنیا حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

۳۱ یعنی اُس سے نفرت کرتا ہے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیسی سخت تنبیہ ہے۔

مِنۡ صَوۡتِكَ ؕ اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِيۡرِ ﴿۱۹﴾
اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ

کو پست رکھو، حقیقت یہ ہے کہ سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے[۳۲]۔ ۱۸-۱۹
(تم نے اِسے بھلا دیا[۳۳])۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ ہی ہے جس نے زمین اور

۳۲؎ یعنی چال میں اکڑ کے بجائے فروتنی وتواضع اور آواز میں کرختگی اور خشونت کے بجائے نرمی اور لینت پیدا کرو۔ اخلاق کے رذائل میں سب سے بری چیز تکبر ہے اور یہ انسان کے چہرے، اُس کی گردن اور اُس کی چال اور انداز گفتگو، ہر چیز سے ظاہر ہوتا ہے۔ لقمان نے بیٹے کو یہ اُسی سے بچنے کی نصیحت کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... 'اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِيۡرِ' کا ٹکڑا یہاں کرخت اور سخت لب ولہجہ سے نفرت دلانے کے لیے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اُس کو حسن بیان اور حسن کلام کی نعمت سے نوازا ہے تو وہ اِس مقام کو چھوڑ کر گدھوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کیوں کرے؟ یہ بلبل کی بدقسمتی ہے کہ وہ زاغ وزغن کی ہم نوائی کرے!'' (تدبر قرآن ۶/۱۳۳)

اِسی طرح آیت میں 'وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ' کے 'مِنۡ' کے بارے میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''...(یہ) اِس بات پر دلیل ہے کہ جب خالق نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اُس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اُس کو وہ پست بھی کر سکتا ہے اور بلند بھی تو موقع ومحل کے مطابق وہ اِس صلاحیت کو استعمال کرے، گدھے کی طرح ہمیشہ اپنا حلق اور لوگوں کے کان پھاڑنے ہی کی کوشش نہ کرے۔'' (تدبر قرآن ۶/۱۳۳)

۳۳؎ یعنی لقمان کی اِس حکمت کو۔ یہاں سے سلسلۂ کلام پھر اُسی مضمون سے مربوط ہو گیا ہے جس کی تائید میں لقمان کی حکمت کا حوالہ دیا گیا ہے۔

وَاَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيۡرٍ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ

آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب تمھارے کام میں لگا دیا ہے اور اپنی ہر قسم کی ظاہری اور باطنی[۳۴] نعمتیں تم پر پوری کر دی ہیں[۳۵]؟ اِس کے باوجود لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے بارے میں[۳۶] بغیر کسی دلیل[۳۷]، بغیر کسی ہدایت[۳۸] اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ ہم اُسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے

لقمان ۳۱

۳۴؎ یعنی مادی بھی اور عقلی اور روحانی بھی۔

۳۵؎ اِس جملے میں استفہام کا اسلوب زجر اور اظہار تعجب کے لیے ہے۔

۳۶؎ یعنی اُس کی توحید کے بارے میں۔ اِس فقرے میں مضاف محذوف ہے۔

۳۷؎ اصل میں لفظ 'عِلۡم' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد یہاں کوئی ایسی چیز ہے، خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی، جو آدمی کے اندر یقین و اعتماد پیدا کر سکے۔

۳۸؎ یہ خاص سے پہلے عام کا ذکر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ کی ہدایت خلق کو انبیا علیہم السلام کی زبانی تعلیم کے ذریعے سے بھی پہنچی ہے اور روشن صحیفوں کے ذریعے سے بھی، مثلاً تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید کے ذریعے سے۔ میرا خیال ہے کہ 'ھُدًى' سے یہاں پہلی قسم کی دلیل مراد ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دلیل کی یہ نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ مشرکین اپنے موقف کی تائید میں جو کچھ کہتے تھے، اُس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اُس کی نوعیت مجرد تقلید کی ہے اور مجرد تقلید کوئی دلیل نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۱۳۹)

اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ الشَّيۡطٰنُ يَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ﴿٢١﴾ وَمَنۡ يُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ﴿٢٢﴾ وَمَنۡ كَفَرَ فَلَا يَحۡزُنۡكَ كُفۡرُهٗ ؕ اِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ فَنُنَبِّئُهُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿٢٣﴾ نُمَتِّعُهُمۡ قَلِيۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّهُمۡ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿٢٤﴾

لقمان
٣١

اپنے باپ دادا کو پایا ہے[٣٩]۔ کیا اُس صورت میں بھی، جب کہ شیطان اُنھیں آگ کے عذاب کی طرف بلا رہا ہو؟ ٢٠-٢١

(نہیں، یہ کچھ نہیں، البتہ) جو اپنا رخ فرماں بردارانہ اللہ کی طرف کرے گا[٤٠] اور وہ خوبی سے عمل کرنے والا بھی ہے تو اُس نے مضبوط رسی تھام لی ہے اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں[٤١]۔ اور جس نے انکار کیا ہے تو اُس کا انکار تمھارے لیے باعث غم نہ ہو، (اے پیغمبر)۔ اِن سب کی واپسی ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم اِنھیں بتا دیں گے جو کچھ یہ کرتے رہے۔ یقیناً اللہ دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ ہم اِن کو تھوڑے دن برومند کریں گے، پھر اِنھیں سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے[٤٢]۔ ٢٢-٢٤

٣٩؎ یہ اُن کے مجادلہ بلا علم کی تفصیل ہے۔

٤٠؎ یعنی شرک اور منافقت کو چھوڑ کر پورے اخلاص کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ آیت میں 'اَسۡلَمَ' کے ساتھ 'اِلٰی' ہے۔ اِس صلے کے ساتھ یہ اِسی مفہوم میں آتا ہے۔

٤١؎ مطلب یہ ہے کہ کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا سہارا بھی اُس کے کام آ سکتا ہے۔ ہر گز نہیں، تمام معاملات بالآخر خدا ہی کے آگے پیش ہوں گے اور اُسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو گا۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٦﴾

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٧﴾

اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے ۔ کہو، شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے[۴۳]۔ (یہ جو کچھ مانتے ہیں، خود اُسی کو جھٹلا رہے ہیں)۔ نہیں، بلکہ اِن میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں[۴۴]۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کا ہے۔ (وہ اِن کی شکر گزاری کا محتاج نہیں ہے)۔ بے شک، اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ ۲۵-۲۶

(حقیقت یہ ہے کہ) زمین میں جتنے درخت ہیں، اگر وہ سارے قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائے، اِس طرح کہ اِس کے بعد اُسے سات سمندر اور روشنائی مہیا کریں، اللہ کی باتیں[۴۵] تب بھی لکھی نہیں جا سکتیں[۴۶]۔ بے شک، اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۲۷

۴۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ'۔ اِن میں 'اِلٰى' کا صلہ دلیل ہے کہ 'اِضْطَرَّ' یہاں کشاں کشاں لے جانے کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔

۴۳؎ لہٰذا کوئی دوسرا اِس کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے کہ اُسے معبود بنایا جائے اور اپنا آقا و مالک سمجھا جائے؟

۴۴؎ یعنی اِس بات کو نہیں جانتے کہ اِن کے خود اپنے تسلیم کردہ مقدمات کے بدیہی نتائج و لوازم کیا ہیں۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۫ كُلٌّ يَّجْرِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى

تم سب کو پیدا کر دینا اور (مرنے کے بعد) تمھارا اٹھا کھڑا کرنا (اُس کے لیے) ایسا ہی ہے، جیسے ایک شخص کا پیدا کرنا اور اٹھا کھڑا کرنا۔ بے شک، اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے[47]۔ تم نے دیکھا نہیں[48] کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو اُس نے تمھارے لیے مسخر کر رکھا

۴۵؎ یعنی وہ باتیں جن کا ظہور اُس کی قدرت و حکمت کی نشانیوں کی صورت میں ہوتا ہے۔

۴۶؎ یہ کوئی مبالغے کا اسلوب نہیں ہے، بلکہ بیان حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگر سمندر روشنائی بن جائے تو یہ روشنائی خود سمندر ہی کے عجائب کو قلم بند کرنے کے لیے کافی نہیں ہوگی، چہ جائیکہ اِس پوری کائنات کے عجائب۔ یہ زمین جو ہمارے قدموں کے نیچے ہے، خدا کی لامتناہی کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر حصہ ہے، لیکن سائنس کی تمام ترقیوں کے باوجود اب تک انسان اِس کے جو عجائب دریافت کر سکا ہے، اُس کی حیثیت سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۱۴۲)

۴۷؎ یعنی اپنی مخلوقات سے بے خبر نہیں ہے، اُن کی باتوں کو سنتا اور اُن کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا جزا و سزا کا فیصلہ کرے گا تو لوگوں کا حساب کرنے میں اُسے کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔

۴۸؎ اِس سے پہلے جمع کا صیغہ تھا۔ آگے واحد کے صیغے سے اپنی آیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اِن میں اِس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ واحد کے صیغے سے مخاطبین کے گویا ایک ایک شخص کو فرداً فرداً توجہ دلائی جاتی ہے جس سے کلام میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَالۡحَـقُّ وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الۡبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَالۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿۳۰﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ الۡـفُلۡكَ تَجۡرِىۡ فِى الۡبَحۡرِ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمۡ مِّنۡ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّـكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا غَشِيَهُمۡ

البیان

لقمان ۳۱

ہے۔سب ایک مقرر وقت تک چلے جا رہے ہیں۔اور دیکھا نہیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے؟ یہ سب اِس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے[۴۹] اور جن کو یہ اُس کے سوا پکارتے ہیں، وہ باطل ہیں[۵۰] اور اِس وجہ سے کہ اللہ ہی برتر ہے، وہی بڑا ہے[۵۱]۔ ۲۸-۳۰

تم نے دیکھا نہیں کہ کشتی اللہ ہی کے فضل سے دریا میں چلتی ہے[۵۲] تاکہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔حقیقت یہ ہے کہ اِس میں ہر اُس شخص کے لیے بہت سی

۴۹؎ یعنی معبود کی حیثیت سے، اِس لیے کہ وہی حقیقی فاعل مختار اور خلق و تدبیر کے تمام اختیارات کا اصل مالک ہے۔چنانچہ کائنات کے اندر جو قدرت و حکمت اور افادیت و ربوبیت کا ظہور دیکھتے ہو، یہ اِس لیے ہے کہ تمام کائنات کی باگ تنہا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

۵۰؎ یعنی اُن کی کوئی حقیقت نہیں ہے، وہ سب تمھارے تخیلات کے آفریدہ خدا ہیں۔

۵۱؎ اِس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ عظیم کائنات نہ وجود میں آسکتی تھی اور نہ اِس نظم اور باقاعدگی کے ساتھ چل سکتی تھی، جس طرح اِسے چلتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔

۵۲؎ یعنی انسان اِسے جس قدر چاہے، اپنے ہنر کا کرشمہ سمجھے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ کشتی خدا ہی کے فضل سے دریا میں چلتی ہے۔یہ فضل شامل حال نہ ہو اور خدا کی نگاہ کرم پھر جائے تو آدمی کو لمحوں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کے ذرائع و وسائل اور کمالات علم و فن کتنے پانی میں ہیں۔

مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۫ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ

لقمان
۳۱

نشانیاں ہیں جو صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب موج سائبانوں کی طرح اُس کے مسافروں کو ڈھانک لیتی ہے تو خالص اُسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے، وہ اللہ کو پکارتے ہیں۔ پھر جب وہ اُنھیں نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو اُن میں کچھ راہ پر رہتے ہیں[۵۳] اور زیادہ بے راہ ہو جاتے ہیں[۵۴]۔ اور ہماری نشانیوں کا انکار تو وہی سب کرتے ہیں جو نہایت بدعہد اور ناشکرے ہیں[۵۵]۔ ۳۱-۳۲

لوگو، اپنے پروردگار کی گرفت سے بچو اور اُس دن سے ڈرو، جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آنے والی بن سکے گی[۵۶]۔ بے شک، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ سو دنیا کی زندگی تمھیں ہرگز دھوکے میں نہ

۵۳؎ اصل میں لفظ 'مُقْتَصِد' آیا ہے، یعنی حق و عدل کی راہ پر چلنے والا۔

۵۴؎ یہ فقرہ اصل میں محذوف ہے۔ اِسے بعد کے جملے نے کھول دیا ہے۔

۵۵؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ اِس طرح کے لوگ کسی نشانی سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ قریش کے متمردین کو بھی نہایت سخت تنبیہ ہے، اِس لیے کہ یہ بات اُنھی کے بارے میں کہی گئی ہے۔

۵۶؎ یہ آخری تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ

ڈالے[57] اور نہ وہ دھوکے باز[58] تمھیں اللہ کے معاملے میں[59] کبھی دھوکا دینے پائے۔
(پوچھتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ کہو)، اُس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔
(دیکھتے نہیں ہو کہ) وہی بارش برساتا ہے[60] اور جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے[61]۔ کوئی

''یہاں اسلوب بیان کی یہ ندرت ملحوظ رہے کہ بیٹے کے کام نہ آسکنے کی نفی میں شدت پائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے: 'وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا'۔ زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ مبتدا کے اعادے اور فعل کی جگہ اسم کے استعمال نے اِس جملے میں بڑا زور پیدا کر دیا ہے۔ اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اول تو ہر باپ کو فطری طور پر اپنے بیٹے سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ پیری میں اُس کا سہارا بنے گا، دوسری یہ کہ بیٹا اپنی عمر اور صلاحیت کے اعتبار سے باپ کے مقابل میں زیادہ اِس بات کا اہل ہوتا ہے کہ اپنے ناتواں باپ کی مدد کر سکے، تیسری یہ کہ بیٹے کے اندر جوانی کے سبب سے فتوت وحمیت کا جذبہ بھی زیادہ قوی ہوتا ہے، لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود اُس دن نفسی نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ بیٹا بھی اپنے باپ کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔'' (تدبر قرآن ۱۴۶/۶)

۵۷۔ دنیا کا نظام چونکہ مجازات کے اصول پر نہیں، بلکہ امتحان کے اصول پر قائم کیا گیا ہے، اِس لیے بالعموم فریب نظر کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ اِسی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

۵۸۔ یعنی شیطان جس نے اِسی کا عہد کر رکھا ہے۔

۵۹۔ یعنی اِس معاملے میں کہ خدا نے یہ دنیا کسی مقصد کے پیش نظر نہیں بنائی اور اِس میں جو کچھ ہو رہا ہے، اُس سے اب خدا کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے، لہٰذا یہ اِسی طرح چلتی رہے گی یا بغیر کسی نتیجے کے ایک دن ختم ہو جائے گی۔ شیطان نے انسان کو جس دھوکے میں ڈال رکھا ہے، وہ اصلاً یہی ہے۔

۶۰۔ لیکن تمھیں بتا کر نہیں برساتا کہ ٹھیک کس وقت اور کتنی مقدار میں اور کہاں کہاں برساؤں گا؟

۶۱۔ لیکن تمھیں اِس پر مطلع نہیں کرتا کہ رحموں میں کیا ہے اور اپنا وقت پورا کرے گا یا وقت

لقمان ۳۱

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾

سورة السجدة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ﴿۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ

نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا۔ (لیکن کوئی عاقل کیا اِن سب باتوں کا انکار کر سکتا ہے)؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی علیم و خبیر ہے[۶۲]۔ ۳۳-۳۴

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'الٓمّٓ' ہے[۶۳]۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس کتاب کی تنزیل جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اِسے خود گھڑ لیا ہے[۶۴]؟ ہرگز نہیں،

سے پہلے باہر آ جائے گا اور اگر پورا کرے گا تو اُس کے وضع کا ٹھیک وقت کیا ہو گا؟

۶۲؎ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا آخری اور قطعی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ تم اتنی قریب کی اور ایسی واضح حقیقتوں سے بھی بارہا بے خبر رکھے جاتے ہو، لیکن اُن کا انکار نہیں کر دیتے۔ پھر قیامت کے بارے میں اگر یہ نہیں بتایا جا رہا کہ کب آئے گی تو اُسے کیوں مشتبہ ٹھیرا یا جائے؟

۶۳؎ یہ سورہ کا نام ہے۔ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ا کے تحت بیان کر دیا ہے۔

مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا

بلکہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق آیا ہے[65]، اِس لیے کہ تم اُن لوگوں کو خبردار کرو[66] جن کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا، اِس لیے کہ وہ راہ پر آ جائیں۔ ۱-۳

(یہ اُس کے شریک بناتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی ہے جس نے زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ دن میں[67] پیدا کیا، پھر اپنے عرش پر متمکن ہو گیا[68]۔ اُس کے سوا نہ تمھارے لیے کوئی کارساز ہے، نہ اُس کے مقابل میں

۶۴؎ یہ استفہام حیرت واستعجاب کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا ایسے اندھے بہرے ہو گئے ہیں کہ قرآن جیسی کتاب کو تمھارا افترا قرار دے رہے ہیں۔

۶۵؎ یعنی اِس لحاظ سے بھی حق کہ فی الواقع خدا کی طرف سے ہے اور اِس لحاظ سے بھی کہ جو کچھ اُس میں بیان کیا گیا ہے، اُس میں کسی باطل کی آمیزش کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۶۶؎ یعنی قریش مکہ کو، جن کے اندر اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آیا تھا، دراں حالیکہ وہ زمین پر خدا کے اولین معبد کے متولی بنائے گئے تھے۔

۶۷؎ اِس سے خدائی ایام مراد ہیں جو ہمارے ہزاروں لاکھوں سال کے برابر بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ بات اِس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بتائی جاتی ہے کہ خدا نے یہ دنیا نہایت تدریج واہتمام کے ساتھ بنائی ہے، لہٰذا اِسے کھیل تماشا خیال نہ کرو، اِس کا ایک مقصد ہے اور یہ اُسی کے پیش نظر وجود میں آئی ہے۔

۶۸؎ یعنی پیدا کر کے اُس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے، بلکہ اپنے عرش حکومت پر متمکن ہو کر بالفعل اُس کا انتظام بھی فرما رہا ہے۔

شَفِيعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۶ۙ
الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ

السجدة
۳۲

سفارش کرنے والا، پھر کیا دھیان نہیں کرتے ہو؟ ۴

آسمان سے زمین تک وہی تمام معاملات کی تدبیر فرماتا ہے[۶۹]، پھر وہ اوپر اُس کی طرف لوٹتے ہیں[۷۰]، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھاری گنتی سے ہزار سال کے برابر ہے[۷۱]۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم ہے[۷۲]۔ ۵-۶

(وہی کہ) جس نے جو چیز بھی بنائی ہے، خوب ہی بنائی ہے[۷۳]۔ انسان کی تخلیق کا آغاز اُس

۶۹۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اُس کی حکومت صرف آسمان تک محدود ہے اور زمین کا انتظام اُس نے کچھ دوسرے لوگوں کے سپرد کر رکھا ہے، جیسا کہ بعض احمق سمجھتے ہیں۔

۷۰۔ یعنی اُس کے حضور پیش کیے جاتے ہیں اور وہ براہ راست دیکھتا ہے کہ کارکنان قضا و قدر نے کیا فرائض انجام دیے اور کس طرح انجام دیے ہیں۔

۷۱۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ خدا کے معاملات کو سمجھنے میں انسان بعض اوقات جلد بازی کرنے لگتا ہے، دراں حالیکہ وہ ہزار ہزار سال کے لیے ایک ہی مرتبہ طے کر کے کارکنان قضا و قدر کے سپرد کر دیے جاتے ہیں اور خدا کی متعین کردہ حکمت کے مطابق سامنے آتے رہتے ہیں، لوگوں کی خواہش کے مطابق اُن میں ہر روز ترمیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۷۲۔ اِس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ وہ پورے حسن ظن کے ساتھ اُسی پر بھروسا رکھیں، تھڑدلے ہو کر دوسروں کے دروازے پر نہ چلے جائیں۔

مِنْ طِيْنٍ ۚ ﴿٧﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ﴿٨﴾
ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

نے مٹی سے کیا،[4] پھر اُس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے چلائی،[5] پھر اُس کے نوک پلک سنوارے اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونک دیا[6] اور تمھارے (سننے کے) لیے

٣؎ یعنی ایسی متناسب، موزوں اور اپنے اوصاف و خصائص کے لحاظ سے ایسی کامل بنائی ہے کہ اُس میں نہ کسی نقص کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، نہ کوئی ترمیم پیش کی جا سکتی ہے۔

۴؎ یہ پہلے مرحلے کا بیان ہے، جب انسان کا حیوانی وجود تخلیق ہوا۔ اِس کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو انسان کی پیدایش کے لیے اب اختیار کیا جاتا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ اب جو عمل ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، اُس وقت زمین کے پیٹ میں ہوا۔ چنانچہ مٹی کے وہی اجزا جو غذا کی صورت میں ہمارے اندر جاتے اور حقیر پانی کے خلاصے میں تبدیل ہو کر اُس عمل کی ابتدا کرتے ہیں جس سے انسان بنتے ہیں، اُس وقت سڑے ہوئے گارے کے اندر اِسی عمل سے گزرے۔ یہاں تک کہ جب خلقت پوری ہو گئی تو اوپر سے وہی گارا انڈے کے خول کی طرح خشک ہو گیا جس کے ٹوٹنے سے جیتی جاگتی ایک مخلوق نمودار ہوئی جسے انسان کا حیوانی وجود کہنا چاہیے۔ اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دوسری تمام مخلوقات بھی پہلی مرتبہ اِسی طریقے سے وجود میں آئیں۔

۵؎ یہ دوسرا مرحلہ ہے جس میں اِس طرح بنائی جانے والی مخلوق نے اپنی نسل آپ پیدا کرنی شروع کر دی۔ چنانچہ وہی عمل جو زمین کے پیٹ میں ہوا تھا، اب وہ ماں کے پیٹ میں ہونے لگا۔ یہ انسان کا وہ دور ہے، جب وہ علم و ادراک سے محروم محض ایک ناتراشیدہ حیوان تھا۔

۶؎ یہ تیسرا مرحلہ ہے جس میں غالباً کئی نسلوں کے اختلاط سے انسان کے حیوانی وجود کو نک سک سے درست کیا گیا، یہاں تک کہ وہ اِس قابل ہو گیا کہ اُسے انسان کی شخصیت عطا کی جائے۔ چنانچہ اِس مخلوق کے جو افراد اُس وقت موجود تھے، اُن میں سے دو کا انتخاب کر کے خدا کی طرف سے ایک لطیف پھونک کے ذریعے سے جسے قرآن میں روح کہا گیا ہے، یہ شخصیت اُسے

وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۹﴾
وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ بَلۡ ہُمۡ

کان اور (دیکھنے کے لیے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لیے) دل بنا دیے[۷] ـــــ تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو[۸]! ۷-۹

(یہ اُس خدا کی شانیں ہیں جس نے اِنھیں پیدا کیا ہے۔ اِس کے باوجود) کہتے ہیں[۹] کہ جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو کیا پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں

عطا کر دی گئی۔ یہی آدم و حوا تھے۔ اِس کے بعد جو انسان پیدا ہوئے، وہ سب اِنھی کی اولاد ہیں۔

قرآن کے اِس بیان سے، اگر غور کیجیے تو اُن تمام آثار کی نہایت معقول توجیہ ہو جاتی ہے جو سائنسی علوم کے ماہرین نے اب تک دریافت کیے ہیں اور جنھیں ڈارونیت کے علم بردار اپنی تائید میں پیش کرتے اور اِس طرح اُن گتھیوں کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کے نظریے میں نہ پہلے حل ہوئی ہیں، نہ آیندہ کبھی ہوں گی۔

۷؎ یہ نفخ روح کا نتیجہ ہے جس نے بصیرت و ادراک سے محروم ایک حیوان کے اندر سمع و بصر اور دل و دماغ کی وہ صلاحیتیں پیدا کر دیں جو تمام حیوانات کے مقابل میں اُس کے لیے وجہ امتیاز ہیں۔ چنانچہ اب وہ اِس قابل ہو گیا کہ اُسے مخاطب کر کے یہ کہا جا سکے کہ ہم نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے۔ قرآن نے اِسی بنا پر صیغۂ غائب کو یہاں پہنچ کر صیغۂ خطاب میں تبدیل کر دیا ہے۔

۸؎ یعنی اِس کے باوجود کہ اِن سب مراحل سے گزر کر اُس مقام تک پہنچے ہو، جہاں اب اپنے آپ کو دیکھ رہے ہو، لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔ چنانچہ کبھی خدا کا انکار کرتے اور کبھی اُس کے شریک ٹھیرانے لگتے ہو۔

۹؎ یعنی طنز و استہزا کے ساتھ سوال کرتے ہیں۔

بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا

گے؟ نہیں، یہ اِس کو بعید نہیں سمجھتے،[۸۰] بلکہ یہ اپنے پروردگار کے حضور پیشی کے منکر ہیں۔[۸۱] اِن سے کہو، تمھاری جان وہی موت کا فرشتہ قبض کرے گا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[۸۲] اگر تم دیکھتے، (اے پیغمبر، تو اِن کی بے بسی کا کچھ اندازہ کر پاتے)، جب یہ مجرم اپنے رب کے حضور سر

السجدة
۳۲

۸۰؎ یعنی ایسے غبی نہیں ہیں کہ خدا کی یہ شانیں دیکھتے ہوئے اپنے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اُس کی قدرت سے بعید سمجھیں۔

۸۱؎ یعنی اِس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ایک دن خدا کے آگے پیش ہو کر اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بسا اوقات انسان انکار تو کسی اور چیز کا کرنا چاہتا ہے، لیکن اُس کے انکار کے لیے بہانہ کسی اور چیز کو بناتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ براہ راست اُس حقیقت کے انکار کی کچھ زیادہ گنجایش وہ نہیں پاتا۔ مشرکین عرب کا حال بھی یہی تھا۔ وہ خدا کے قائل تھے، اِس وجہ سے خدا کے آگے پیشی کا صریح انکار اُن کے لیے مشکل تھا، لیکن اُس کو ماننے سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، وہ اُن کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اِس وجہ سے اُس سے گریز کے لیے اول تو وہ قیامت پر اُس قسم کے شبہات وارد کرتے تھے جس کی ایک مثال اوپر گزری اور بدرجۂ آخر اُس کو مانتے بھی تھے تو اُس کے نتائج سے بچاؤ کے لیے اُنھوں نے شرکا وشفعا ایجاد کر لیے تھے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۱۶۲)

۸۲؎ مطلب یہ ہے کہ انکار تو کر سکتے ہیں کہ خدا نے ہر شخص کو دنیا میں اِس کی آزادی دے رکھی ہے، مگر اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا کے حضور میں پیشی سے فرار بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر گز نہیں، خدا نے ہر ایک کے لیے موت کا فرشتہ مقرر کر رکھا ہے۔ جب اِن کا وقت آئے گا تو کوئی اور نہیں، وہی

رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ

السجدة ۳۲

جھکائے کھڑے ہوں گے اور اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے رب، ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا، اب تو ہمیں واپس بھیج دے کہ ہم نیک کام کریں، ہمیں پورا یقین آ گیا ہے۔ (جواب میں ارشاد ہوگا: پھر امتحان کی کیا ضرورت تھی)؟ اگر ہم چاہتے تو ہر ایک کو اُس کی ہدایت خود ہی دے دیتے۔[۸۳] لیکن (ہم نے تمھیں امتحان میں ڈالا اور تم نے ہدایت پر گم راہی کو ترجیح دی، سو) میں نے جو بات کہی تھی، پوری ہوگئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر کر چھوڑوں گا۔[۸۴] اِس لیے اب چکھو اِس کا مزہ

فرشتہ اِن کی روح قبض کر کے اِنھیں حاضر کر دے گا۔ اِس سے کسی کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔

۸۳؎ مدعا یہ ہے کہ حقائق کو اِس طرح بے نقاب کر دینے کے بعد لوگوں کا ایمان اللہ کو پسند ہوتا تو اُس امتحان کی کوئی ضرورت نہیں تھی جس کے لیے تمھیں دنیا میں بھیجا گیا۔ اِس طرح کا ایمان لانے پر تو اُس وقت بھی تمھیں مجبور کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ ہماری اسکیم نہیں تھی۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ علم و عقل کی جو نعمت ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہے، اُس سے کام لے کر تم اِن حقائق کا اعتراف کرتے ہو یا نہیں؟ تم اِس امتحان میں ناکام ہو چکے ہو۔ اب دوبارہ اُسی امتحان کے لیے تمھیں دنیا میں بھیج دیا جائے تو اُس کا نتیجہ کچھ بھی مختلف نہ ہوگا۔ اِس وقت جو کچھ دیکھ رہے ہو، اُس کی یاد ذہن سے محو ہوتے ہی تم وہی کچھ کرو گے جو پہلے کرتے رہے ہو۔

۸۴؎ یعنی اُن سب جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا جو شیطان کے بہکانے سے اِس امتحان میں ناکام ہو جائیں گے۔ یہ اُس بات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾
اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا
بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿١٥﴾ السجدة تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ

کہ تم نے اپنے اِس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تمھیں بھلا دیا ہے۔[85]
اب چکھو اپنے کرتوتوں کی پاداش میں ہمیشہ کا عذاب۔ ۱۰-۱۴

ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں، (اے پیغمبر) کہ اُنھیں جب اِن کے ذریعے سے یاددہانی کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں[86] اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں[87] اور وہ ہرگز تکبر نہیں کرتے۔[88] اُن کے پہلو بستروں سے

جواب میں روز ازل کہی تھی، جب اُس نے چیلنج دیا تھا کہ میں اِن سب کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔ ابلیس کا یہ چیلنج سورۂ ص (۳۸) کی آیات ۸۲-۸۵ میں نقل ہوا ہے۔ فرمایا کہ وہ بات پوری ہوگئی اور اُسے پورا ہونا ہی تھا، اِس لیے کہ جب لوگوں کو امتحان میں ڈالا گیا تو اُس امتحان کے نتائج بھی لازماً سامنے آنا تھے۔

۸۵؎ یعنی نظر انداز کر دیا ہے، لہٰذا تمھاری کوئی درخواست اور التجا اب ہمارے نزدیک درخور اعتنا نہیں رہی۔

۸۶؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ اپنی برتری کے زعم میں تمھارے ساتھ جھگڑ رہے ہیں، اُن سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، ہماری آیتوں پر تو ایسی خشیت وانابت کے حاملین ہی ایمان لائیں گے جو اُنھیں سن کر اپنا سر خدا کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔

۸۷؎ یعنی اُس کے لیے تمام اعلیٰ صفات کا اقرار کرتے اور اُسے ہر عیب اور نقص سے پاک قرار دیتے ہیں۔

۸۸؎ یعنی کسی حق کے مقابلے میں، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کبھی اکڑتے نہیں ہیں۔

الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۫ نُزُلًۢا

السجدة
۳۲

الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں[۸۹] اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی کو پتا نہیں کہ اُن کے اعمال کے صلے میں اُن کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے[۹۰]۔ ۱۵-۱۷

(یہ اِس کو نہیں مانتے) تو (اِن سے پوچھو کہ) کیا جو مومن ہے، وہ اُس شخص کی طرح ہو جائے گا جو نافرمان ہے[۹۱]؟ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے[۹۲]۔ جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے راحت کے باغ ہیں[۹۳]، پہلی ضیافت کے

۸۹۔ اِس لیے کہ اُنھیں خدا کے حضور پیشی اور آخرت کی باز پرس کا خوف بھی رہتا ہے اور وہ امید بھی اپنے پروردگار ہی سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ آرام کو تج کر اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اِسی خوف اور امید کے ساتھ اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے اور اُس کی نمازیں پڑھتے ہیں۔

۹۰۔ یہ اُس ابدی بادشاہی کی طرف اشارہ ہے جو نیکوکاروں کو اُن کی چند روزہ مساعی کے صلے میں ملنے والی ہے۔

۹۱۔ یعنی اپنے انجام کے لحاظ سے۔

۹۲۔ اِس لیے کہ اگر ایسا نہ ہو تو اِس کے معنی تو پھر یہ ہوئے کہ یہ کارخانۂ کائنات بالکل عبث بنایا گیا ہے، اِس کی حیثیت ایک لیلا اور تماشا گاہ سے زیادہ نہیں ہے اور اِس کا خالق رحمت و حکمت اور عدل و انصاف جیسی اعلیٰ صفات سے بالکل تہی ہے۔

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٠﴾

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ

طور پر، اُن کے اعمال کے صلے میں۔ اور جو نافرمانی کرتے رہے، اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب کبھی اُس سے نکلنا چاہیں گے، اُسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور اُن سے کہا جائے گا کہ اب چکھو آگ کے اُس عذاب کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ۱۸-۲۰

اِس بڑے عذاب سے پہلے ہم کسی قریب کے عذاب کا مزہ[۹۴] بھی اُن کو ضرور چکھائیں گے تاکہ وہ رجوع کریں۔ اُن سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جنھیں اُن کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے سے یاددہانی کی جائے، پھر وہ اُن سے اعراض

۹۳؎ یہ اُن باغوں کا ذکر ہے، جہاں اصل جنت میں داخل ہونے سے پہلے اولین ضیافت کے لیے ایمان والوں کو ٹھیرایا جائے گا۔ اِن کے لیے 'جَنّٰت' کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ تمام اہل جنت کے لیے الگ الگ ہوں گے۔ قرآن نے دوسری جگہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ 'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى' کے پاس ہیں جو عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان آخری نقطۂ اتصال ہے۔

۹۴؎ یعنی جو اِسی دنیا میں آکر اِنھیں جھنجھوڑے گا۔ قریش کے لیے اِس قریب کے عذاب کا سلسلہ غزوۂ بدر سے شروع ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جن قوموں کی طرف اپنا رسول بھیجتے ہیں، اُن کے لیے یہی سنت الٰہی ہے کہ بڑے عذاب سے پہلے اُنھیں اِسی طرح قریب کے عذابوں سے تنبیہ کی جائے۔

عَنۡهَا ؕ اِنَّا مِنَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۲۲﴾
وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ فَلَا تَكُنۡ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡ لِّقَآئِهٖ
وَجَعَلۡنٰهُ هُدًى لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۲۳﴾ ۚ وَجَعَلۡنَا مِنۡهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ
بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ؕ وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ

کریں؟ ایسے مجرموں سے[۹۵] تو ہم ضرور انتقام لیں گے۔ ۲۱-۲۲

ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی (اور اُس کے جھٹلانے والوں سے بھی اِسی طرح انتقام لیا تھا)[۹۶]، اِس لیے، (اے پیغمبر)، تم اِس کے متعلق کسی شک میں نہ رہو کہ اُس دن سے دوچار ہونا ہے[۹۷]۔ اور بنی اسرائیل کے لیے ہم نے اُسی کتاب کو ہدایت بنایا تھا اور جب اُنھوں نے ثابت قدمی دکھائی اور وہ ہماری آیتوں پر یقین بھی رکھتے تھے تو اُن کے اندر ایسے پیشوا اٹھائے تھے جو ہمارے حکم سے اُن کی رہنمائی کرتے تھے[۹۸]۔ (پھر وہ

---

۹۵ یعنی جن کی طرف خدا کے رسول کی بعثت ہوئی اور اُس نے اُنھیں خدا کی آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اُن پر ہر لحاظ سے اتمام حجت کر دیا، لیکن پھر بھی نہیں مانے۔

۹۶ یعنی فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر سے۔

۹۷ یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس میں جو تنبیہ ہے، اُس کا رخ اُنھی مکذبین کی طرف ہے جو سورہ کے مخاطب ہیں۔ گویا بات اُن سے منہ پھیر کر کہی گئی ہے۔

۹۸ یعنی اِس وقت کے ائمۂ ضلالت کی طرح شیطان کے پیرو نہیں بن گئے تھے۔ یہ مسلمانوں کو بشارت دی ہے کہ وہ بھی اگر خدا کی کتاب کو قبول کریں گے اور پورے یقین کے ساتھ اُس پر ثابت قدم رہیں گے تو اُن کے اندر بھی ایسے ہی ائمۂ ہدایت پیدا ہوں گے جو دنیا اور آخرت، دونوں میں اُن کے لیے سرفرازی کا باعث بنیں گے۔

يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۲۵﴾
اَوَلَمۡ يَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ يَمۡشُوۡنَ
فِىۡ مَسٰكِنِهِمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۶﴾
اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا نَسُوۡقُ الۡمَآءَ اِلَى الۡاَرۡضِ الۡجُرُزِ فَنُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا
تَاۡكُلُ مِنۡهُ اَنۡعَامُهُمۡ وَاَنۡفُسُهُمۡ ؕ اَفَلَا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾

السجدة
۳۲

اختلافات میں پڑ گئے تو) اِس میں کچھ شک نہیں کہ (اب) تیرا پروردگار ہی قیامت کے دن اُن کے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ ۲۳-۲۵

کیا یہ چیز بھی اِن کے لیے ہدایت کا ذریعہ نہیں بنی کہ اِن سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا؟ اُنھی کے (اجڑے ہوئے) گھروں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں[99]۔ اِس میں، یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں[100]۔ پھر کیا یہ سنتے نہیں ہیں[101]! ۲۶

(اِنھیں تعجب ہے کہ قیامت کس طرح ہو گی! اِن سے پوچھو)، کیا اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم پانی (کے بادلوں) کو چٹیل میدان کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں، پھر اُس سے کھیتی اگاتے ہیں جس سے اِن کے چوپایے بھی کھاتے ہیں اور یہ

---

۹۹ قوم فرعون کے بعد اب یہ عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کے انجام کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

۱۰۰ یعنی اُس سنت کے ظہور کی نشانیاں ہیں جو رسولوں کے باب میں اِنھیں بتائی جا رہی ہے۔

۱۰۱ مطلب یہ ہے کہ اِن قوموں کی سرگذشتیں جب قرآن میں اِنھیں سنائی جاتی ہیں تو سنتے نہیں ہیں؟ 'سننا' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سمجھنے اور عبرت حاصل کرنے کے مفہوم میں ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

خود بھی۔ پھر کیا دیکھتے نہیں ہیں[۱۰۲]! ۲۷

پوچھتے ہیں[۱۰۳] کہ یہ فیصلہ کب ہوگا، اگر تم سچے ہو[۱۰۴]؟ (کیا یہ اُس کو دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں)؟ اِن سے کہو، فیصلے کے دن انکار کرنے والوں کا ایمان اُنھیں کچھ بھی نفع نہ دے گا اور نہ (اُس کے بعد) اُنھیں مہلت دی جائے گی۔ سو اِن کا خیال چھوڑو، (اے پیغمبر)، اور انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہی ہیں۔ ۲۸-۳۰

۱۰۲؎ یعنی ہماری قدرت اور ربوبیت کی اِس غیر معمولی نشانی کو دیکھنے کے بعد بھی اِنھیں تعجب ہے؟ کیا اندھے ہو چکے ہیں کہ آئے دن مردہ زمین کو زندہ ہوتے دیکھتے ہیں، پھر بھی اِس شک میں مبتلا ہیں کہ خدا اِن کو دوبارہ کس طرح اٹھائے گا؟

۱۰۳؎ یعنی تاریخ اور آفاق کے اِن سارے شواہد کو دیکھنے کے باوجود پوچھتے ہیں۔

۱۰۴؎ یہ سوال طنز و استہزا کے انداز میں کیا جاتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں جس فیصلے کی وعید سنا رہے ہو، آخر وہ کب صادر ہوگا؟ اُس کے لیے اگر کوئی دن مقرر ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتا؟ اگر تم سچے ہو تو اُسے لا کر دکھاؤ یا کم سے کم اُس کے آنے کا وقت ہی بتا دو، ہم اُس کے بعد ہی مانیں گے۔

کوالالمپور

۲۱/ مارچ ۲۰۱۴ء

الاحزاب
۳۳

الاحزاب

یہ ایک منفرد سورہ ہے جس پر قرآن کے اِس چوتھے باب کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اِس باب کا موضوع اثبات رسالت اور اِس کے حوالے سے قریش کو انذار و بشارت ہے۔ چنانچہ اِسی تعلق سے یہ سورہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق و فرائض بیان کرتی اور آپ اور آپ کی ازواج مطہرات کے بارے میں جو رویہ اُس زمانے کے منافقین و منافقات نے اختیار کر رکھا تھا، اُس پر اُنھیں شدید تنبیہ کرتی ہے۔ نیز مسلمانوں کو ہدایت کرتی ہے کہ اِن کے مقابلے میں وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھیں، اُس کی مدد شامل حال رہی تو یہ اُن کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے، جیسا کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ و اختیار کے ساتھ عہد اطاعت کی جو عظیم امانت انسان کو دے رکھی ہے، اُس کے حقوق کی یاددہانی بھی اِسی مناسبت سے کی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے یہ سورہ بالکل اُسی طرح اِس باب کی تمام سورتوں کا تکملہ و تتمہ ہے، جس طرح سورۂ نور پچھلے باب کا تکملہ و تتمہ ہے۔

اِس کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور اہل ایمان بھی، اور اِس کے مضمون سے واضح ہے کہ ہجرت کے بعد یہ مدینۂ طیبہ میں اُس وقت نازل ہوئی ہے، جب مسلمانوں کی ایک باقاعدہ حکومت وہاں قائم ہو چکی تھی اور منکرین کے خلاف

آخری اقدام سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماننے والوں کا تزکیہ وتطہیر کر رہے تھے۔

سورۃ الاحزاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَ لَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۙ﴿۱﴾ وَّ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ۙ﴿۲﴾ وَّ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ﴿۳﴾

الاحزاب ۳۳

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اے نبی، اللہ سے ڈرو اور اِن منکروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو[1]۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ علیم و حکیم ہے[2]۔ تم اُس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اُن سب چیزوں سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو[3]۔ اور اللہ پر بھروسا رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۱-۳

۱؎ یہ اُن باتوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر آگے آئے گا اور جنھیں کفار اور منافقین نے آپ کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ اِس میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کی تنبیہ کا رخ درحقیقت اُنھی کی جانب ہے۔

۲؎ یعنی اُس نے اگر کوئی حکم دیا ہے تو وہی علم و حکمت کا تقاضا ہے۔ اُس کے خلاف کسی کی کوئی چیز بھی لائق التفات نہیں ہے۔

۳؎ اِن آیتوں میں خطاب تمام تر واحد کے صیغے میں ہے، لیکن یہاں جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔ اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دین کے معاملے میں وہی رویہ ہر مسلمان کو اختیار کرنا چاہیے، جس کی یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین کی جا رہی ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے ہیں (کہ ایک ہی وقت میں وہ دو متضاد باتوں کو مانتا رہے)۔[۴] چنانچہ نہ اُس نے تمھاری اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار[۵] کر بیٹھتے ہو، تمھاری مائیں بنایا ہے[۶] اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا بنا دیا

الاحزاب
۳۳

۴۔ یعنی ایک ہی وقت میں مومن بھی ہو اور منافق بھی، خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے اور اُس کے شریک بھی ٹھیرائے، خدا کے پیغمبر سے اطاعت و وفاداری کا عہد بھی باندھے اور اُس کے خلاف سازشوں میں بھی شامل ہو۔ ایک وقت میں آدمی کی ایک ہی حیثیت ہو سکتی ہے، اِس لیے کہ اُس کے سینے میں ایک ہی دل دھڑکتا ہے، خدا نے اُسے دو دلوں کے ساتھ پیدا نہیں کیا ہے۔ اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کوئی غیر فطری چیز کبھی خدا کے دین میں جائز نہیں ہو سکتی، وہ اُسے ہر حال میں ممنوع ٹھیرائے گا۔ چنانچہ اِسی اصول پر متفرع کر کے آگے جاہلیت کی بعض رسوم کی لغویت واضح فرمائی ہے۔

۵۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ شوہر نے بیوی کے لیے 'أنت علی کظھر أمی' (تجھے ہاتھ لگایا تو گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگایا) کے الفاظ زبان سے نکال دیے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں بیوی کو اِس طرح کی بات کہہ دینے سے ایسی طلاق پڑ جاتی تھی جس کے بعد بیوی لازماً شوہر سے الگ ہو جاتی تھی۔ اہل عرب سمجھتے تھے کہ یہ الفاظ کہہ کر شوہر نہ صرف یہ کہ بیوی سے اپنا رشتہ توڑ رہا ہے، بلکہ اُسے ماں کی طرح اپنے اوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ لہٰذا اُن کے نزدیک طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجایش ہو سکتی تھی، لیکن ظہار کے بعد اِس کا کوئی امکان باقی نہ رہتا تھا۔

۶۔ یعنی اگر کوئی شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے یا اُس کے کسی عضو کو ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دیتا ہے تو اِس سے بیوی ماں نہیں ہو جاتی اور نہ اُس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں

اَبۡنَآءَکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ قَوۡلُکُمۡ بِاَفۡوَاہِکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَقُوۡلُ الۡحَقَّ وَھُوَ یَھۡدِی السَّبِیۡلَ ﴿۴﴾ اُدۡعُوۡھُمۡ لِاٰبَآئِھِمۡ ھُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَھُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَمَوَالِیۡکُمۡ ؕ وَلَیۡسَ

ہے[7]۔ یہ سب تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں[8]، مگر اللہ حق کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ تم منہ بولے بیٹوں کو اُن کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے[9]۔ پھر اگر اُن کے باپوں کا تم کو پتا نہ ہو تو وہ تمھارے

الاحزاب ۳۳

کو حاصل ہے۔ ماں کا ماں ہونا ایک امر واقعی ہے، اِس لیے کہ اُس نے آدمی کو جنا ہے۔ اُس کو جو حرمت حاصل ہوتی ہے، وہ اِسی جننے کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ابدی اور فطری حرمت ہے جو کسی عورت کو محض منہ سے ماں کہہ دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

۷۔ مطلب یہ ہے کہ اُنھیں بالکل صلبی بیٹوں کا درجہ نہیں دیا ہے کہ اُن کے لیے میراث کا حق قائم ہو جائے یا اُن کی بیویوں کے ساتھ اُن کی وفات یا طلاق کے بعد نکاح کرنا ممنوع سمجھا جائے۔

۸۔ یعنی اِن کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ اِن پر شریعت کے کسی حکم کی بنیاد رکھی جائے۔ خدا کی شریعت انسان کی فطرت پر مبنی ہے، اُس میں اِس طرح کے رسوم کی کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

۹۔ اِس لیے کہ اِسی سے نسب کا امتیاز قائم رہتا اور وہ معاشرت وجود میں آتی ہے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے رحمی رشتوں کے تقدس اور انسان کے فطری جذبات و داعیات پر رکھی ہے۔ اِس سے ہٹ کر جو کام بھی کیا جائے گا، وہ حق و انصاف کے خلاف ہو گا جسے خدا کی شریعت کبھی قبول نہیں کر سکتی۔

عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ ۙ وَلٰـكِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ ؕ

دینی بھائی اور تمھارے حلیف ہیں[10]۔ تم سے جو غلطی اِس معاملے میں ہوئی ہے[11]، اُس کے لیے تو تم پر کوئی گرفت نہیں، لیکن تمھارے دلوں نے جس بات کا ارادہ کر لیا[12]،

الاحزاب ۳۳

۱۰؎ یعنی حلف اور ولا کا جو طریقہ تمھارے ہاں موجود ہے، اُس کے مطابق تم اُنھیں اپنا مولیٰ بنا سکتے ہو۔ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن کسی کو بالکل اُسی حیثیت سے بیٹا یا بیٹی نہیں بنا سکتے جو تمھاری صلبی اولاد کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...دینی اخوت کے رشتے سے تو عربوں کو اول اول اسلام نے آشنا کیا، جاہلیت میں عرب اِس سے بالکل نا آشنا تھے، لیکن خاندانوں اور قبیلوں کے ساتھ وابستہ ہونے کا ایک طریقہ حلف اور ولا کا اِن کے ہاں موجود تھا۔ خاندان یا قبیلے سے باہر کا کوئی شخص اگر کسی خاندان یا قبیلے میں شامل ہونا چاہتا اور اُس خاندان والے اُس کو شامل کر لیتے تو وہ اُس خاندان کا 'مولیٰ' سمجھا جاتا اور جملہ حقوق اور ذمہ داریوں میں شریک خاندان وقبیلہ بن جاتا۔ اگر وہ قتل ہو جاتا تو جس خاندان یا قبیلہ کا وہ مولیٰ ہوتا، اُس کو یہ حق حاصل ہوتا کہ وہ اُس کے قصاص کا مطالبہ کرے۔ اِسی طرح اگر وہ کوئی اقدام کر بیٹھتا جس کی بنا پر کوئی ذمہ داری عائد ہونے والی ہوتی تو اِس ذمہ داری میں بھی پورے خاندان وقبیلہ کو حصہ لینا پڑتا۔ 'مولی القوم منھم' (قوم کا مولیٰ اُنھی کے اندر کا ایک فرد شمار ہوگا) عربوں میں ایک مسلّم سماجی اصول تھا اور اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھی اِس کو برقرار رکھا۔''

(تدبر قرآن ۶/۱۸۹)

۱۱؎ یعنی اب تک ہوتی رہی ہے۔

۱۲؎ یعنی تعلیم وتنبیہ کے بعد بھی اِسی غلط طریقے پر قائم رہنے پر اصرار کیا۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ یہ قصد وارادہ کے ساتھ خدا کی نافرمانی کا ارتکاب ہوگا، اِسے سہو ونسیان یا غلطی پر محمول نہیں کیا جا سکتا جس پر خدا کی شریعت میں کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵﴾

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ

اُس پر ضرور گرفت ہے۔ اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۴-۵

(اِسی اصول کے مطابق)، نبی کا حق تو اُس کے ماننے والوں پر خود اُن کی ذات سے بھی مقدم ہے اور اُس کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں[۱۳]، مگر رحمی رشتے رکھنے والے خدا کے قانون میں دوسرے تمام مومنین اور مہاجرین کی بہ نسبت ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں[۱۴]، الا یہ کہ اپنے تعلق کے لوگوں سے تم کوئی حسن سلوک کرنا چاہو۔

۱۳؎ مطلب یہ ہے کہ آدمی کا دل اگر کسی شخص کو خدا کا پیغمبر مان لیتا ہے تو اُس پر وہ کسی رشتے کو، یہاں تک کہ خود اپنی جان کو بھی مقدم نہیں ٹھیرا سکتا۔ پھر اِس تعلق کا قدرتی نتیجہ ہے کہ اُس کے جذبات پیغمبر کی ازواج مطہرات کے معاملے میں بھی وہی ہوں جو شریف بیٹوں کے اپنی ماؤں کے لیے ہوتے ہیں۔ اِس سے الگ ہو کر اگر کوئی سوچتا ہے تو وہ ایمان کے ساتھ نفاق کو جمع کرتا ہے جو ایک ہی دل میں جمع نہیں ہو سکتے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا، خدا نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں۔

۱۴؎ یعنی پیغمبر اور آپ کی ازواج کا معاملہ الگ ہے، مگر اُن کے بعد کسی کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اُسے خدا کے بنائے ہوئے رشتوں پر مقدم ٹھیرایا جائے۔ لہٰذا باقی سب لوگوں کے تعلقات کی بنیاد یہ ہے کہ رحمی رشتے رکھنے والے الاقرب فالاقرب کے اصول پر ایک دوسرے کے حق دار اور دوسرے سب لوگوں سے مقدم ہوں گے، یہاں تک کہ اُن مومنین اور مہاجرین سے بھی جنھیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ اِس لیے کہ یہی فطرت کا تقاضا ہے۔

فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿٦﴾
وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿٧﴾ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٨﴾

یہ اِسی کتاب میں لکھا ہوا ہے[15]۔ ٦

(تم اِس کی پیروی کرو، اے پیغمبر)، اور یاد رکھو، جب ہم نے سب نبیوں سے اُن کا عہد[16] لیا اور تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، اور ہم نے اُن سے نہایت پختہ عہد لیا (کہ ہمارا پیغام بے کم و کاست پہنچا دو[17]) تاکہ اللہ راست بازوں سے اُن کی راست بازی کے بارے میں سوال کرے اور منکروں اور منافقوں سے اُن کے کفر و نفاق کے بارے میں[18]، اور منکروں کے لیے تو اُس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ٧-٨

١۵؎ یعنی قرآن میں۔ یہ اُن ہدایات کی طرف اشارہ ہے جو سورۂ نساء (٤) کی ابتدا اور سورۂ انفال (٨) کے آخر میں بیان ہوئی ہیں اور جن میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ وراثت وغیرہ کے حقوق میں رشتہ دار احق ہیں، اُن پر کسی دوسرے کو مقدم نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

١٦؎ اِس عہد کا حوالہ قرآن میں کئی مقامات پر آیا ہے، خاص طور پر سورۂ مائدہ میں، جہاں اِس کی پوری تاریخ بیان کی گئی ہے۔

١٧؎ اِس لیے کہ آگے جس سوال کا ذکر ہے، وہ اتمام حجت کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے اور اتمام حجت کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی ہدایت لوگوں تک بے کم و کاست پہنچ جائے۔

١٨؎ یہ فقرہ تقابل کے اسلوب پر اصل میں محذوف ہے۔

الاحزاب
٣٣

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا

ایمان والو، (تم اِن کی پروا نہ کرو، تمھارے لیے اللہ کافی ہے، اور) اپنے اوپر خدا کی عنایت کو یاد رکھو، جب تم پر فوجیں کی فوجیں چڑھ آئیں[19] تو ہم نے

[19] آگے کی آیات سے واضح ہے کہ یہ غزوۂ احزاب کے واقعات کا حوالہ ہے۔ یہ غزوہ شوال ۵ ھ ہجری میں واقع ہوا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہود بنی نضیر کے کچھ لیڈروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ اُنھوں نے مکہ جا کر قریش کے لیڈروں سے فریاد کی اور اُن کو آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں۔ قریش حملے کے لیے پہلے سے پر تول رہے تھے۔ جب اُن کو یہود کی شہ بھی حاصل ہو گئی تو گویا مانگی مراد مل گئی۔ اِس کے بعد غطفان اور ہوازن کے لیڈروں کو بھی اُنھوں نے ہموار کر لیا۔ اِس طرح تقریباً دس ہزار کا ایک لشکر جرار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ قریش کا لشکر ابو سفیان کی سرکردگی میں تھا اور غطفان و ہوازن عیینہ بن حصن اور عامر بن طفیل کی قیادت میں نکلے۔ مزید برآں حیی بن اخطب نضری نے یہود بنی قریظہ کو بھی اِس متحدہ محاذ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اگرچہ اُنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن وصلح کر رکھا تھا، لیکن اِس موقع کو اُنھوں نے غنیمت جانا اور معاہدے کی پروا نہ کی۔ اِن کی تعداد کم وبیش آٹھ سو تھی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمنوں کی اِن تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے مسلمانوں کو مدینہ کی اُن سمتوں میں خندق کھودنے کا حکم دیا جن سے حملہ کا خطرہ تھا۔ چنانچہ شہر کی شمالی اور مغربی سمت میں ساڑھے تین میل لمبی ایک خندق کھودی گئی اور یہ کام نہایت سرگرمی کے ساتھ اُن تین ہزار مجاہدوں نے انجام دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بہ نفس نفیس اِس کام میں حصہ لیا۔

تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرًا ﴿۹﴾ اِذۡ جَآءُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ وَمِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ

اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی[20] اور ایسی فوجیں جو تم کو نظر نہیں آئیں[21] اور (یقین رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس کو برابر دیکھنے والا ہے۔ یاد کرو، جب وہ تمھارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمھارے نیچے کی طرف سے بھی تم پر چڑھ آئے تھے،[22] جب (خوف

دشمنوں نے مدینے کا محاصرہ کرلیا اور یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا، لیکن اِس دوران میں سنگ باری اور تیراندازی کے اکادکا واقعات کے سوا دوبدو جنگ کی کوئی نوبت نہیں آئی۔ دشمن نے یہ اندازہ کرلیا کہ مسلمانوں نے مدافعت کی پوری تیاری کررکھی ہے۔ پھر محاذ میں پھوٹ بھی پڑگئی اور مزید برآں ایک طوفانی ہوا نے اُن کے خیمے وشامیانے، سب اکھاڑ کے پھینک دیے جس کے بعد اُن کے حوصلے پست ہوگئے اور ابوسفیان نے واپسی کا اعلان کردیا۔*'' (تدبرقرآن ۶/ ۱۹۳)

۲۰؎ یہ آندھی اُس وقت آئی تھی، جب محاصرے کو تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی طوفانی آندھی تھی کہ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس سے خیموں کی چوبیں اور طنابیں اکھڑ گئیں، دیگیں الٹ گئیں، سواری کے جانور تتربتر ہوگئے، سردی کی شدت کے باوجود آگ جلانا ناممکن ہوگیا، تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

۲۱؎ یہ فرشتوں کی فوجوں کی طرف اشارہ ہے جو ہمیشہ پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کے ہم رکاب رہتی ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ مسلمانوں نے تو، جیسا کہ بیان ہوا، اِن کو نہیں دیکھا، لیکن قریش کو یہ فوجیں نظر آئیں جس سے اُنھوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کی جمعیت بہت بڑی ہے۔ چنانچہ آندھی کے ساتھ یہ چیز بھی اُن کی مرعوبیت کا باعث ہوئی۔

۲۲؎ مدینہ کی مشرقی سمت بلند اور مغربی سمت نشیبی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ غطفان وغیرہ کا حملہ مشرق کی طرف سے اور قریش اور اُن کے حلیفوں کا مغرب کی طرف سے ہوا

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۱۹۵۔

الاحزاب ۳۳

وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا

کے مارے) آنکھیں بہک گئی تھیں[۲۳] اور کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور اللہ کے بارے میں تم لوگ طرح طرح کے گمان کرنے لگے تھے[۲۴]۔ اُس وقت ایمان والے امتحان میں ڈالے گئے اور بری طرح ہلا دیے گئے[۲۵]۔ ۹-۱۱

الاحزاب ۳۳

اور[۲۶] جب منافقین کہتے تھے اور وہ بھی جن کے دلوں میں روگ ہے[۲۷] کہ اللہ اور

تھا[*]۔ یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۳۔ یہ اُس صورت حال کی تعبیر ہے، جب منظر ایسا دہشت ناک ہو کہ نگاہ اُس پر ٹکنے نہ پائے اور بے قابو ہو کر بار بار بہک جائے۔

۲۴۔ آگے کی آیتوں سے واضح ہو جائے گا کہ یہ اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جو ضعف ایمان اور منافقت کی بیماری میں مبتلا تھے۔ اُن کے اوسان یہ منظر دیکھ کر خطا ہو گئے اور خدا کی نصرت اور اُس کے وعدوں کے بارے میں جو کچھ اُنھیں بتایا گیا تھا، وہ سب اُن کے لیے مشکوک ہو کر رہ گیا۔

۲۵۔ اِس لیے کہ ایک طرف دشمنوں کی یورش تھی اور دوسری طرف اُن کی اپنی صفوں کے اندر بعض لوگوں کا وہ حال ہو رہا تھا جو یہاں بیان کیا گیا ہے۔

۲۶۔ یہاں سے آگے اب اُس اجمال کی تفصیل ہے جس کے لیے پیچھے 'تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا' کے الفاظ آئے ہیں۔

۲۷۔ یعنی بغض و عناد اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ یہ منافقین کے اُس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو محض منافق ہی نہیں تھا، اِس کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دلی عناد بھی رکھتا تھا۔

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۰۰۔

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ

اُس کے رسول نے جو وعدے[28] ہم سے کیے تھے، وہ نرا فریب ہی تھے۔ اور جب اُن میں سے ایک گروہ[29] نے کہا کہ یثرب والو، تمھارے لیے اب ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، اِس لیے لوٹ جاؤ[30]۔ اور اُن میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں، دراں حالیکہ وہ خطرے میں نہیں تھے۔ وہ صرف بھاگنا چاہتے تھے[31]۔ اُن کے گھروں کے اطراف سے اگر اُن پر حملہ ہو

الاحزاب ۳۳

۲۸؎ یعنی اِس بات کے وعدے کہ اللہ کی مدد آئے گی اور آخر کار غلبہ اہل ایمان ہی کو حاصل ہوگا۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اِسی گروہ کے بعض شریروں نے یہ تک کہہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمیں قیصر و کسریٰ کے خزانوں پر قبضے کی نوید سنا رہے تھے اور یہاں حال یہ ہے کہ رفع حاجت کے لیے بھی نکلنا مشکل ہو رہا ہے*۔

۲۹؎ یہ غالباً منافقین اعراب کا گروہ ہے جن کے لیے قرآن میں 'اَشَدُّ کُفْرًا وَّ نِفَاقًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِس کا قرینہ یہ ہے کہ اِنھوں نے مدینہ کے لوگوں کو 'یثرب والو' کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یہ اگر مدینہ کے باشندے ہوتے تو اپنے ہی شہر کے لوگوں کو اِس طرح مخاطب نہ کرتے۔

۳۰؎ اُن کا مدعا یہ تھا کہ اِس صورت میں ممکن ہے کہ حملہ آور فوجیں تمھارے ساتھ کچھ نرمی کا معاملہ کریں، لیکن نوبت اگر جنگ کی آگئی تو پھر تمھاری خیر نہیں ہے۔

۳۱؎ یہ بھی اُنھی منافقین اعراب کا ایک دوسرا گروہ ہے جس نے جنگ سے بھاگنے کے

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۰۲۔

دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ

جاتا، پھر اُنھیں فتنے[۳۲] کی دعوت دی جاتی تو وہ اُس میں جا پڑتے اور اِس میں بہت کم توقف کرتے۔ اِس سے پہلے اُنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے[۳۳] اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس تو (ایک دن) ہونی ہے[۳۴]۔ اُن سے کہو،

الاحزاب ۳۳

لیے یہ عذر پیش کیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... پہلے گروہ نے مدینہ والوں کو پست ہمت کر کے اُن کو محاذ سے ہٹانے کی کوشش کی اور اِس گروہ نے خود اپنے لیے راہ فرار تلاش کرنے کی تدبیر کی تاکہ دشمن کے لیے میدان بالکل صاف ہو جائے۔ اِس گروہ کا یہ عذر بھی کہ ''ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں''، اِس بات کا قرینہ ہے کہ اِن کا تعلق اطراف مدینہ کے دیہاتوں سے تھا۔ جہاں تک اہل مدینہ کا تعلق ہے، اُن کے لیے اِس قسم کے کسی بہانے کی گنجایش نہیں تھی۔ اِس جنگ سے متعلق جو تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۰۲)

۳۲؎ یعنی اِس بات کی دعوت دی جاتی کہ خدا کے دین کو خود بھی چھوڑیں اور دوسروں کو بھی اِسے چھوڑنے کے لیے مجبور کریں۔

۳۳؎ یہ خاص طور پر اُس عہد کی طرف اشارہ ہے جو اِن لوگوں نے اِس سے پہلے غزوات میں شرکت سے گریز کے بعد اپنے اوپر اعتماد کی بحالی کے لیے کیا تھا۔ قرآن میں اِس کا ذکر ایک سے زیادہ مقامات پر ہوا ہے۔

۳۴؎ یہ بڑی سخت وعید ہے۔ مدعا یہ ہے کہ باز پرس تو ہر جرم کی ہو سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اِس عہد کا معاملہ معمولی نہیں ہے، اِس کی باز پرس لازماً ہونی ہے۔

فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٦﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ

اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو یہ بھاگنا تمھارے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور اگر بچ بھی گئے تو چند دنوں ہی کے لیے کچھ فائدہ اٹھا لو گے۔ اُن سے پوچھو، کون ہے جو تمھیں خدا سے بچا سکے گا، اگر وہ تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا اُس کی رحمت کو روک سکے گا،[۳۵] اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے؟ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقابل میں وہ اپنے لیے کوئی حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔[۳۶] ۱۶-۱۷

اللہ تم میں سے اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (اُس کی راہ میں) اِس جنگ سے دوسروں کو روکتے اور اپنے بھائیوں سے کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ[۳۷] اور

۳۵۔ یہ فقرہ اصل میں محذوف ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: 'أَوْ يُمْسِكُ رَحْمَتَهُ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' (یا اِس کی رحمت کو روک سکے، اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے)۔ عربی میں حذف کے اِس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ 'متقلدًا سيفًا ورمحًا' میں بھی یہی اسلوب ملحوظ ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۰۴)

۳۶۔ یہاں سیاق کلام چونکہ تنبیہ کا ہے، اِس وجہ سے آخر میں تنبیہ کے پہلو ہی کو نمایاں کیا ہے، دراں حالیکہ اوپر رحمت کا ذکر بھی ہوا ہے۔

۳۷۔ یعنی خطرے کی جگھوں سے دور اپنے آپ کو بچا کر جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں، وہاں آ جاؤ۔ غزوۂ خندق کے موقع پر دفاعی لائن چونکہ بہت طویل تھی، اِس لیے جنگ سے گریز و

البیان

الاحزاب ۳۳

اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٨﴾ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ ۖ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٩﴾ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ

تم سے جان چراتے ہوئے وہ خود بھی لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ جب خطرے کا موقع آجاتا ہے تو تم اُن کو دیکھتے ہو کہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں، اِس طرح کہ اُن کی آنکھیں گردش کر رہی ہیں، جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ پھر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو مال کی حرص میں وہ تم پر تیز زبانوں سے چڑھ چڑھ کر بولتے ہیں[۳۸]۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو اللہ نے اِن کے اعمال اکارت کر دیے اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے[۳۹]۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دشمن کے لشکر ابھی

فرار کے لیے اِس طرح کی جگہیں تلاش کر لینا مشکل نہیں تھا۔

۳۸؎ یعنی اپنی شجاعت و شہامت کے دعوے کرتے اور دوسروں کو ہدف مطاعن بناتے ہیں تاکہ مال غنیمت میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں۔

۳۹؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ کوئی اِس مغالطے میں نہ رہے کہ خدا اپنی شان کریمی سے اِن کے چھدا اتارنے والے اعمال کو بھی قبول کر لے گا۔ ہرگز نہیں، وہ بڑا غیور ہے اور اِن کے کسی عمل کا محتاج بھی نہیں ہے، لہٰذا اُس کے لیے بہت آسان ہے کہ جو عمل خالص اُس کی رضا جوئی کے لیے اور خوبی کے ساتھ نہیں کیا گیا، اُسے اِن کے منہ پر پھینک مارے کہ جاؤ، اِس کا صلہ وہیں تلاش کرو، جہاں یہ کر کے آئے ہو۔

يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٢٠﴾ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿٢١﴾ ؕ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

الاحزاب
۳۳

گئے نہیں ہیں[۴۰] اور اگر یہ لشکر پھر آ جائیں تو اِن کی تمنا ہوگی کہ بدووں کے ساتھ کہیں دیہات میں ہوں اور وہیں سے تمھاری خبریں پوچھتے رہیں۔ (یہی بہتر ہے، اِس لیے کہ) اگر یہ تمھارے درمیان ہوتے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔ ۱۸-۲۰

(لوگو)، اللہ کے رسول میں تمھارے لیے (اُس وقت ثبات و استقامت کا) ایک بہترین نمونہ موجود تھا، اُن کے لیے جو اللہ سے ملاقات[۴۱] اور روز آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے ہیں[۴۲]۔ اور سچے اہل ایمان (کا حال اُس وقت یہ تھا کہ اُنھوں) نے جب لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ تو وہی چیز

۴۰؎ یعنی ایسے خوف زدہ ہو چکے ہیں کہ لشکر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں اور یہ ابھی تک یہی خیال کر رہے ہیں کہ وہ اُسی طرح پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

۴۱؎ آیت میں یہاں مضاف محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۴۲؎ روے سخن منافقین ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے اگر رسول کی پیروی نہیں کی تو اِس کی وجہ یہ تھی کہ نہ خدا اور آخرت پر تمھارا ایمان تھا، نہ خدا کی یاد سے تمھارے دل آباد تھے اور یہ سعادت اُنھی کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر خدا اور آخرت پر سچا ایمان ہو اور اپنے اِس ایمان کو وہ خدا کی یاد سے تازہ رکھیں۔

وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ

ہے جس کا اللہ اور اُس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اُس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی[43]۔ اور (اُن کے اندر کوئی کم زوری پیدا کرنے کے بجائے) اِس چیز نے اُن کے ایمان واطاعت ہی کو اور بڑھا دیا۔ ۲۱-۲۲

ایمان والوں میں وہ مردانِ حق[44] بھی ہیں کہ اُنھوں نے اللہ سے جس چیز پر عہد کیا تھا، اُسے پورا کر دکھایا ہے۔ پھر اُن میں سے کوئی اپنا ذمہ پورا کر چکا اور کوئی منتظر ہے[45]۔ اُنھوں نے اِس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔ (یہ امتحان اِسی لیے برپا کیا گیا تھا) تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا بدلہ دے اور منافقوں کو، اگر چاہے تو عذاب

۴۳؎ اوپر منافقین کا قول گزر چکا ہے۔ یہ اُس کے مقابل میں اب سچے مسلمانوں کا تاثر بیان کیا ہے کہ خدا اور اُس کے رسول کا وعدہ یہی تو تھا کہ اُس کی راہ میں اِسی طرح کے صبرآزما امتحان پیش آئیں گے جن سے گزرنے کے بعد ہی تم کامیابی کی منزل تک پہنچو گے۔ لہٰذا یہ وعدہ پورا ہوا اور یہ بات بالکل سچی ثابت ہوگئی۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۱۴ اور سورۂ عنکبوت (۲۹) کی آیات ۲-۳ میں اللہ تعالیٰ نے اِسی وضاحت کے ساتھ اِسے بیان کیا ہے۔

۴۴؎ اصل میں لفظ 'رِجَال' استعمال ہوا ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ ہم نے اِسی کو 'مردانِ حق' کے الفاظ سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۵؎ یعنی سر ہتھیلی پر لیے ہوئے انتظار کر رہا ہے کہ کب موقع آئے اور وہ بھی اپنا عہد پورا کرے۔

الاحزاب ۳۳

شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾
وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ
ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ

دے اور چاہے[۴۶] تو اُن پر عنایت فرمائے اور اُن کی توبہ قبول کر لے، (اگر وہ توبہ کریں)۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۲۳-۲۴

(تم نے دیکھا نہیں کہ) اللہ نے منکروں کو اُسی طرح اپنا غصہ دلوں میں لیے ہوئے بالکل بے نیل مرام پھیر دیا[۴۷] اور مسلمانوں کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا۔ اللہ بڑی قوت والا ہے، بڑا زبردست ہے۔ اور اہل کتاب میں سے جنھوں نے اُن کی مدد کی تھی[۴۸]، اللہ اُنھیں بھی اُن کی گڑھیوں سے اتار لایا[۴۹] اور اُن

۴۶؎ آیت میں 'يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' کے بعد بھی 'اِنْ شَآءَ' کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر محذوف ہیں۔ یہ اُنھی کا ترجمہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... اِس ٹکڑے میں منافقین کے لیے دعوت استغفار ہے کہ اُن کے لیے اب بھی گنجایش باقی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو استغفار و توبہ کے ذریعے سے پھر خدا کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ یاددہانی بھی ہے کہ تمام امور کا انحصار اللہ واحد کی مشیت ہی پر ہے، اِس وجہ سے جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالے کریں۔" (تدبر قرآن ۶/ ۲۱۰)

۴۷؎ یعنی جس بغض و عناد میں بھرے ہوئے آئے تھے، اُسی کے ساتھ لوٹ گئے، نہ اُس کو نکالنے کا موقع ملا اور نہ کوئی دوسرا فائدہ حاصل ہوا۔ اُن کے تمام منصوبے ناکام ہو گئے اور جس طرح آئے تھے، خائب و خاسر ہو کر اُسی طرح واپس چلے گئے۔

۴۸؎ یعنی یہود بنی قریظہ، جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن و صلح کا معاہدہ

الرُّعۡبَ فَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ وَتَاۡسِرُوۡنَ فَرِيۡقًا ﴿٢٦﴾ وَاَوۡرَثَكُمۡ اَرۡضَهُمۡ وَدِيَارَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا ﴿٢٧﴾

کے دلوں میں اُس نے رعب ڈال دیا، اُن کے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے تھے اور ایک گروہ کو قید کر رہے تھے۔[50] اور اُن کی زمین اور اُن کے گھروں اور اُن کے اموال کا تمھیں وارث بنا دیا اور ایک ایسی زمین کا بھی جس کو تمھارے قدموں نے چھوا بھی نہیں ہے۔[51] حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۲۵-۲۷

کر رکھا تھا، لیکن منکرین کے دل بادل لشکروں کو دیکھ کر اُنھوں نے یہ معاہدہ توڑ دیا اور یہودی لیڈر حیی بن اخطب نضری کے بہکانے سے حملہ آوروں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ چیز، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشانی کا باعث بن گئی۔*

۴۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کی واپسی کے بعد جب اِن کے نقض عہد اور غداری کی سزا دینے کے لیے اِن پر حملہ کیا تو یہ اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے اور کم و بیش ۲۵ دن تک محصور رہے۔ لیکن محاصرے سے تنگ آ کر بالآخر اِنھیں اپنے قلعوں اور گڑھیوں سے نکلنا پڑا۔** یہ اُسی کا ذکر ہے۔

۵۰۔ یہ اُسی رعب کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب اِنھی کے مقرر کردہ حکم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ سنایا کہ اِن کے تمام قابل جنگ افراد قتل کر دیے جائیں اور بقیہ کو قیدی بنا لیا جائے تو اِن میں سے کسی کو اِس کے خلاف چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی۔***

۵۱۔ یہ خیبر، مکہ اور روم و شام کی فتوحات کی بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نقد عاجل تو

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/۲۰۰۔

** السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/۲۱۶۔

*** السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/۲۱۷۔

الاحزاب ۳۳

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

(اِس طرف سے مایوس ہو کر اب یہ منافقین تمھارے گھروں میں فتنے اٹھانا چاہتے ہیں، اِس لیے)، اے نبی، اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اُس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں دے دلا کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اِن سب چیزوں سے بے نیاز ہو کر اُسی کے لیے سرگرم رہو، اِس لیے کہ اللہ نے تم میں سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں[۵۲] کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے[۵۳]۔ ۲۸-۲۹

جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، وہ تم نے دیکھ لیا، لیکن ابھی اور زمینیں بھی ہیں، جن کی وراثت ہم نے تمھارے لیے مقدر کر رکھی ہے۔

۵۲؎ اصل میں لفظ 'مُحْسِنٰت' استعمال ہوا ہے۔ اِس میں 'نباہ کرنے والیوں' کا مفہوم موقع کلام نے پیدا کر دیا ہے۔

۵۳؎ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ یہ سوال جب امہات المومنین، خاص کر سیدہ عائشہ صدیقہ کے سامنے رکھا گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں اور اُن سے کہا گیا کہ اِس کے جواب میں وہ جلدی نہ کریں، بلکہ اپنے والدین سے بھی مشورہ کر لیں تو اُنھوں نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا کہ مجھے اِس معاملے میں کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، میں اللہ اور اُس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ باقی امہات المومنین کا جواب بھی یہی تھا۔*

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۳/۶۲۸۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تدبیر اُس فتنے کے سدباب کے لیے کی گئی جو منافقین اٹھانا چاہتے تھے۔ اِس میں ازواج مطہرات کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو دنیا اور اُس کے عیش کی طلب میں حضور سے الگ ہو جائیں اور چاہیں تو اللہ و رسول اور قیامت کے فوز و فلاح کی طلب گار بن کر پورے شعور کے ساتھ ایک مرتبہ پھر یہ فیصلہ کرلیں کہ اُنھیں اب ہمیشہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ ازواج مطہرات نے اِس کے جواب میں جو کچھ کہا، اُن سے وہی متوقع تھا۔ چنانچہ یہ تدبیر نہایت کارگر ثابت ہوئی اور ہر شخص پر واضح ہو گیا کہ اہل بیت رسالت کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اِس حرم کے اندر کسی کے لیے دراندازی کی گنجایش نہیں ہے۔

منافقین یہ فتنہ جس طریقے سے اٹھا رہے تھے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس پوری سورہ پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دور میں منافقین کی ریشہ دوانیاں جس طرح عام مسلمانوں کو اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان و برگشتہ کرنے کے لیے بہت بڑھ گئی تھیں، اُسی طرح منافقات کے ذریعے سے اُنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے بھی بڑی خطرناک مہم چلا رکھی تھی۔ منافق عورتیں امہات المومنین کے گھروں میں جاتیں اور نہایت ہمدردانہ انداز میں اُن سے کہتیں کہ آپ لوگ شریف اور معزز گھرانوں کی بیٹیاں ہیں، لیکن آپ لوگوں کی زندگی ہر راحت ولذت سے محروم بالکل قیدیوں کی طرح گزر رہی ہے۔ اگر آپ دوسرے گھروں میں ہوتیں تو آپ کی زندگی 'بیگمات' کی طرح نہایت عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرتی۔ ساتھ ہی وہ یہ وسوسہ اندازی بھی کرتیں کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو طلاق دے دیں تو بڑے بڑے رئیس اور سردار آپ لوگوں سے نکاح کریں گے اور آپ لوگوں کی زندگیاں قابل رشک ہو جائیں گی۔ آگے کی آیات سے یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ منافقین کو بھی جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں جانے اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر اُن کے اندر کچھ نہ کچھ وسوسہ اندازی

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ

نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے گی[54]، اُس کے لیے

کی ضرور کوشش کرتے۔ اِن کوششوں سے اُن کا اصلی مقصد تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے اندر کوئی اُس طرح کا فتنہ کھڑا کرنا تھا، جس طرح کا فتنہ اُنھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کھڑا کر دیا تھا جس کی تفصیلات سورۂ نور میں آپ پڑھ چکے ہیں، ورنہ ادنیٰ درجے میں یہ فائدہ تو اُن کو بدیہی طور پر نظر آتا تھا کہ اِس سے ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے اندر بے اطمینانی پیدا ہوگی اور کیا عجب کہ اِس طرح کوئی ایسی شکل نکل آئے کہ وہ آپ کی ازواج کے ساتھ نکاح کرنے کا جو مذموم ارادہ رکھتے ہیں، وہ پورا ہو جائے۔

منافقین و منافقات کی اِن چالوں سے اگرچہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن بالکل بے خبر نہیں تھیں، بعض تلخ تجربے اُن کو ہو چکے تھے، لیکن شریف، کریم النفس اور باحیا لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اُن کے سامنے اگر ہم دردی و خیر خواہی کے انداز میں بات کرتا ہے تو وہ اُس کے کھوٹ سے واقف ہوتے ہوئے بھی، اُس کو جواب نرمی ہی سے دیتے ہیں۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن بھی اپنی کریم النفسی کے سبب سے اُن لوگوں کو نرمی ہی سے جواب دیتیں، جس سے یہ کمینے لوگ اِس طمع خام میں مبتلا ہو جاتے کہ اُن کا پروپیگنڈا کامیاب ہو رہا ہے اور وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۱۶)

۵۴ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ازواج مطہرات سے، معاذ اللہ، کسی فحش حرکت کا اندیشہ تھا۔ قرآن نے یہ الفاظ فتنہ پردازوں کے مخفی ارادوں کو سامنے رکھ کر استعمال کیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...وہ رات دن اِسی تگ و دو میں تھے کہ اہل بیت رسالت سے متعلق کوئی اسکینڈل (scandal) پیدا کریں تاکہ اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ برباد ہو۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو آگاہ کر دیا کہ منافقین ہم دردی و خیر خواہی کے بھیس میں درحقیقت اپنے بہت بڑے شیطانی منصوبے کی فکر میں ہیں۔''

(تدبر قرآن ۶/۲۱۹)

الاحزاب ۳۳

لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

دہرا عذاب ہے[55] اور یہ اللہ کے لیے آسان سی بات ہے[56]۔ اور تم میں سے جو اللہ اور اُس کے رسول کی فرماں بردار بنی رہیں گی اور نیک عمل کریں گی، اُنھیں ہم اُن کا دہرا اجر عطا فرمائیں گے[57] اور اُن کے لیے ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے[58]۔ ۳۰-۳۱

الاحزاب ۳۳

۵۵؎ یہ اِس قانون کے مطابق ہے کہ جس کا خدا کے ہاں جو درجہ و مرتبہ ہے، اُس کا محاسبہ بھی اُسی کے لحاظ سے ہوگا۔ اِس سے قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو یہ احساس دلایا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں اُن کا مقام کس قدر بلند ہے اور اِس مقام بلند سے کسی پستی کی طرف اترنے کا نتیجہ اُن کے لیے کیسا سنگین ہو سکتا ہے۔

۵۶؎ یعنی تم میں کوئی اِس بھلاوے میں نہ رہے کہ نبی کی بیویاں ہونا تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا سکتا ہے یا تمھارا مرتبہ کچھ ایسا بلند ہے کہ اُس کی وجہ سے تمھیں پکڑنے میں اللہ کو کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔ ہرگز نہیں، خدا کا قانون بے لاگ ہے، وہ کسی کے درجے اور مرتبے یا نسبت و تعلق کی بنا پر کوئی رعایت نہیں کرے گا۔

۵۷؎ یعنی سزا بھی دگنی ہے اور جزا بھی دگنی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِن آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ خدا کے ہاں مواخذہ اتمام حجت کے اعتبار سے ہوگا اور اعمال کا صلہ اُن حالات کے اعتبار سے ملے گا جن میں وہ انجام دیے گئے ہیں۔ ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کو چونکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت حاصل ہوئی اور رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اِس وجہ سے اُن سے مواخذہ سخت ہوگا۔ اِسی طرح رسول کی رفاقت پوری وفاداری کے ساتھ چونکہ بڑا کٹھن کام ہے، اِس وجہ سے اُس کا صلہ بھی دگنا ہے۔ جرموں کے مواخذہ اور اعمال کے صلے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿٣٢﴾

نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو[59]۔ اگر تم خدا سے ڈرو[60] تو (اِن لوگوں کے ساتھ) نرمی کا لہجہ اختیار نہ کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے[61]، وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور معروف کے مطابق بات کرو[62]۔ ۳۲

یہی ہے اور یہ بالکل مبنی بر عدل و حکمت ہے۔'' (تدبر قرآن ۲۱۹/۶)

۵۸ قرآن میں یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کی تعبیر ہے اور اِس کے ساتھ باعزت، یعنی 'کَرِیْم' کی صفت اِس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ یہ رزق و فضل اُن کے حق کے طور پر، ہمیشہ کے لیے اور کسی قید و شرط اور اندیشۂ احتساب و مواخذہ کے بغیر ملے گا۔

۵۹ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت و تعلق کی وجہ سے تمھاری ایک خاص حیثیت ہے جس کو تمھیں ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہیے اور کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو اِس مرتبے اور مقام کے منافی ہو۔ تمھارے ہر طرز عمل کے اثرات اُس دعوت اور مشن پر ہوں گے جس کے لیے خدا نے اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا ہے۔

۶۰ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ آگے جو ہدایات دی جا رہی ہیں، اُن پر اِس تقویٰ کے بغیر اُن کی روح کے مطابق عمل نہیں کیا جا سکتا۔

۶۱ اِس سے وہ کینہ و حسد مراد ہے جو اشرار منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ اِس کے سبب سے وہ اِس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طریقے سے وہ آپ کی ازواج مطہرات کو بدنام کرنے کی کوئی صورت پیدا کر سکیں۔

۶۲ یعنی جیسے اُن لوگوں سے کی جاتی ہے جن سے کسی فتنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ جو کچھ کہنا ہو، بغیر کسی رو رعایت کے سیدھے صاف طریقے سے کہہ دیا جاتا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ ہدایت بھی خاص اُنھی حالات کے لحاظ سے کی گئی جو اُس وقت امہات المومنین کو درپیش تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی

تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور اگلی جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔[٦٣]

”...عام حالات میں تو پسندیدہ طریقۂ کلام یہی ہے کہ آدمی تواضع کا انداز اختیار کرے، لیکن بعض اوقات حالات ومصالح کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اِس سے مختلف روش اختیار کی جائے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اِس دور میں منافقین ومنافقات رات دن اِس تگ ودو میں تھے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے کوئی ایسی بات نکالیں جس کو ایک فتنہ بنا سکیں۔ اِن لوگوں کی باتیں ہم دردانہ رنگ میں ہوتی تھیں، اِس وجہ سے امہات المومنین رضی اللہ عنہن بھی اُن کا جواب اپنی شرافت نفس کے سبب سے نرم انداز ہی میں دیتی تھیں جس سے یہ مفسدین دلیر ہوتے جا رہے تھے اور اِن کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اِن خاص حالات کی بنا پر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو اپنا رویہ بدل دینے کی ہدایت ہوئی۔ فرمایا کہ اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ نبی کے ساتھ نسبت کے باعث تمھاری نیکی اور بدی، دونوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ تمھاری نیکی دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ بنے گی اور تم سے کوئی غلطی صادر ہو گی تو اُس کو بھی اصحاب الاغراض حجت بنائیں گے۔ اِس وجہ سے تمھارے لیے احتیاط کی روش اولیٰ ہے۔ اگر منافقین تمھارے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے کی کوشش کریں تو بربنائے مروت وشرافت اُن کی بات کا جواب نرمی وتواضع سے نہ دو کہ جس کے دل میں اللہ اور اُس کے رسول کے خلاف بغض وحسد ہے، وہ کوئی غلط توقع کر بیٹھے، بلکہ صاف انداز میں اُس سے اِس طرح بات کہو کہ اگر وہ اپنے دل میں کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو اُس کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ یہاں اُس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ٦/٢٢٠)

٦٣۔ یہ ہدایت بھی اُسی منصب اور اُس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہے جو ازواج مطہرات کو حاصل تھا کہ اُنھیں زمانۂ جاہلیت میں بڑے لوگوں کی بیگمات کے طریقے پر اپنی زیب وزینت کی نمایش کرتے ہوئے باہر نہیں نکلنا چاہیے، بلکہ جو حالات اُنھیں درپیش ہیں، اُن میں باہر نکلنے ہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اِس لیے کہ منافقین شب وروز اِسی کوشش میں لگے ہوئے

الاحزاب ٣٣

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۳۳

اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔[64] اللہ تو یہی چاہتا ہے، اِس گھر کی بیبیو کہ تم سے (وہ) گندگی دور کرے (جو یہ منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں) اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔[65]

ہیں کہ وہ اُن سے متعلق کوئی اسکینڈل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ عام عورتوں کے ساتھ اِس ہدایت کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے حالات اور اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اُس زمانے میں بھی، جہاں چاہیں، جاسکتی تھیں اور اب بھی جاسکتی ہیں۔ اجنبیوں کے سامنے زیب و زینت کی نمایش، البتہ اُن کے لیے بھی ممنوع ہے، اِس لیے کہ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے اِس کی ہدایت اُنھیں الگ فرما دی ہے۔ یہاں اتنی بات مزید واضح ہوئی کہ اجنبی مردوں کے سامنے زیب و زینت کی نمایش جاہلیت کا طریقہ ہے، اِس کا اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۴ یعنی گھروں میں رہ کر اِنھی کاموں میں سرگرم رہو تا کہ اپنی وہ ذمہ داری کما حقہٗ پوری کرسکو جو رسول کی بیویوں کی حیثیت سے تم پر عائد ہوتی ہے۔ آگے وضاحت فرما دی ہے کہ یہ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ہے جس کے لیے علما اُٹھیں یا پیغمبر کے گھرانے کے لوگ، اُنھیں سب سے بڑھ کر اِنھی چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

۶۵ مطلب یہ ہے کہ تمھارے باطن کی پاکیزگی میں شبہ نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تمھارے منصب کے لحاظ سے تمھیں لوگوں کی نگاہ میں بھی ہر طرح کی اخلاقی نجاست سے بالکل پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو نہایت شفقت و محبت کے ساتھ خطاب کرکے یہ اب اُن ہدایات کا مقصد بتایا ہے جو اُنھیں یہاں دی جارہی ہیں اور اُن کے لیے 'اہل بیت' کا لفظ استعمال کرکے واضح کر دیا ہے کہ اِس کا شرف اصلاً اُنھی کو حاصل ہے۔ دوسروں کی شمولیت اِس میں ہوسکتی ہے تو اصلاً نہیں، بلکہ تبعاً و ضمناً ہوسکتی ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿٣٤﴾

اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور اُس کی حکمت کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اُس کا چرچا کرو۔[66] بے شک، اللہ بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔[67] ۳۳-۳۴

۶۶؎ یعنی جو آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی اور اُن کے ذریعے سے ایمان و اخلاق کے جو حقائق واضح کیے جاتے ہیں، اُن کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس طرح مردوں کی رہنمائی کے لیے ہوئی تھی، اُسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوئی تھی۔ آپ جس طرح باہر لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے تھے، اُسی طرح اپنے گھروں کے اندر بھی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ وحی جس طرح باہر آپ پر نازل ہوتی تھی، اُسی طرح گھر کے اندر بھی نازل ہوتی تھی۔ نیز جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا، اُسی طرح آپ کا ہر فعل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی 'پرائیویٹ' اور 'پبلک' کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھی، بلکہ آپ کی حیات مبارک کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا، اِس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح آپ کی باہر کی زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ کرنے کے لیے آپ کے جاں نثار سایے کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہیں، اُسی طرح آپ کے گھر کے اندر کی زندگی کا بھی ایک ایک پہلو محفوظ رکھنے کا انتظام ہو۔ یہ کام، ظاہر ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ہی کے ذریعے سے ممکن تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و عمل جتنا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ذریعے سے پھیلا ہے، اُس کی مقدار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعے پھیلے ہوئے علم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اِس آیت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اِس مشن پر آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اللہ تعالیٰ نے خود مامور فرمایا تھا کہ اُن کا کام دنیا کے خزف ریزے جمع کرنا نہیں، بلکہ علم و حکمت کے اُن خزانوں کو خلق کے اندر لٹانا ہے جن کی بارش اُن کے گھروں کے اندر ہو رہی ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۲۲۳)

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِينَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِينَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِينَ وَالصّٰبِرٰتِ

(تاہم اُس کا تمام فضل ورحمت صرف اِسی گھر کے ساتھ خاص نہیں ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مرد اور جو عورتیں مسلمان ہیں[68]، مومن ہیں[69]، بندگی کرنے والے ہیں[70]، سچے

الاحزاب ۳۳

[67] چنانچہ کوئی گھر کے اندر ہو یا باہر، اُس کی کوئی خدمت اُس سے مخفی نہیں رہتی۔ وہ اُس کا صلہ دنیا اور آخرت میں ضرور دیتا ہے۔

[68] یعنی جنھوں نے اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ 'اسلام' کا لفظ جب اِس طریقے سے 'ایمان' کے ساتھ آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے تو اِس سے دین کا ظاہر مراد ہوتا ہے، یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے کی وہ کیفیت جو انسان کے قول وفعل اور اعضا و جوارح سے نمایاں ہوتی ہے اور اُس کو دیکھ کر ہر شخص جان لیتا ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کو اُس نے پوری طرح اختیار کر لیا ہے، اُس کی زندگی کا کوئی گوشہ اب اُس سے باہر نہیں ہے۔

[69] ایمان دین کا باطن ہے اور یہاں اِس سے مراد وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے وعدوں کے بارے میں اُس کی حقیقی معرفت کے ساتھ پایا جائے۔ چنانچہ جو خدا کو اِس طرح مانے کہ تسلیم و رضا کے بالکل آخری درجے میں اپنے دل و دماغ کو اُس کے حوالے کر دے، قرآن اپنی اصطلاح میں اُسے مومن کہتا ہے۔

[70] اصل میں لفظ 'قُنُوت' استعمال ہوا ہے۔ یہ وہ قلبی کیفیت ہے جو انسان کو پورے اخلاص اور یک سوئی کے ساتھ دائماً اپنے پروردگار کی اطاعت پر قائم رکھتی ہے۔ بندۂ مومن کے نہاں خانۂ وجود میں عبد و معبود کے تعلق کا سب سے نمایاں ظہور یہی ہے۔ چنانچہ 'قٰنِتِیْن' وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ بندگی میں رہیں۔ غم، خوشی، جوش، ہیجان اور لذت و الم کی کسی حالت میں بھی اپنے خالق سے سرکش نہ ہوں۔ شہوت کا زور، جذبات کی یورش اور خواہشوں کا ہجوم بھی اُنھیں

وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ

ہیں[1]، صبر کرنے والے ہیں[2]، اللہ کے آگے جھک کر رہنے والے ہیں[3]، خیرات کرنے

خدا کے سامنے کبھی بے ادب نہ ہونے دے۔ اُن کا دل خدا کا عرش ہو اور اُس کی شریعت کو وہ حضوری میں دیا گیا حکم سمجھیں جس سے سرتابی کا تصور بھی دربار میں کھڑا ہوا کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

۱؎ یعنی قول و فعل اور ارادہ، تینوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن نے اِس کے ضد کردار کو نفاق اور اِسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے۔

۲؎ نفس کو اضطراب اور بے چینی سے روک لیا جائے تو عربی زبان میں اِسے صبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اِس کا ابتدائی مفہوم ہے۔ پھر اِسی سے مشکلات اور موانع کے علی الرغم پامردی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنے کے معنی اِس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ آیت میں جس صبر کا ذکر ہے، وہ عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جسے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں مجبوراً اختیار کیا جائے، بلکہ عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔ اِس سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوش گوار تجربات پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجائے وہ اُنھیں رضامندی کے ساتھ قبول کر لے اور خدا کی طرف سے مان کر اُن کا استقبال کرے۔ اِس مفہوم کے لحاظ سے 'صَابِر' وہ شخص ہے جو ہر خوف و طمع کے مقابل میں اپنے موقف پر قائم اور اپنے پروردگار کے فیصلوں پر راضی اور مطمئن رہے۔

۳؎ آیت میں اِس کے لیے 'خٰشِعِيْن' کا لفظ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اُس کی عظمت و جلال کے صحیح تصور سے جو تواضع، عجز اور فروتنی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، قرآن اُسے خشوع سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے جو اُسے خدا کے سامنے بھی جھکاتی ہے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی اُس کے دل میں رحمت و رأفت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ

والے ہیں[4]، روزہ رکھنے والے ہیں[5]، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں[6]

۴ے اللہ کی راہ میں انفاق کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہو، اُسے معاشرے کا حق سمجھے اور جب کوئی مطالبہ سامنے آئے تو اُسے فراخ دلی کے ساتھ پورا کرے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضرورتوں میں ایثار کر کے بھی وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے۔ خیرات کرنے والوں کی تعبیر اِن سب صورتوں کو شامل ہو سکتی ہے، لیکن بیان اوصاف کے موقع پر جب کسی شخص کو 'مُتَصَدِّق' کہا جائے گا تو اِس سے اشارہ اصلاً اُس کے درجۂ کمال کی طرف ہوگا، یعنی جو سخی اور فیاض ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دے۔ بندوں کے تعلق سے یہ اُسی خشوع کا اظہار ہے جو اِس سے پہلے مذکور ہے۔ نماز اور انفاق کا ذکر قرآن میں اِسی بنا پر ساتھ ساتھ آتا ہے۔

۵ے یہ ضبط نفس اور تربیت صبر کی خاص عبادت ہے۔ قرآن میں اِس کا مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ اِس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ 'صَآئِمِیْن' سے مراد وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے ایسے حریص ہیں کہ اِس کے لیے زیادہ تر روزے سے رہتے ہیں۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ معلوم ہوئی کہ وہ منکرات سے بچتے، فواحش سے اجتناب کرتے اور اپنی زندگی میں تمام اخلاق عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔

۶ے یہ ضبط نفس اور تقویٰ کا ثمر ہے۔ برہنگی، عریانی اور فواحش سے اجتناب کرنے والوں کے لیے یہ تعبیر قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عفت و عصمت کی بالکل آخری درجے میں حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی ہے، اُس کے سوا خلوت و جلوت میں اپنا ستر وہ کسی کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ کوئی ایسا لباس کبھی پہنتے ہیں جو اُن اعضا کو نمایاں کرنے والا ہو جو اپنے اندر کسی بھی لحاظ سے

كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے ہیں،[77] اللہ نے اُن کے لیے بھی مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔[78] ۳۵

جنسی کشش رکھتے ہیں۔ فواحش سے اجتناب کا یہی درجہ ہے جس سے وہ تہذیب پیدا ہوتی ہے جس میں حیا فرماں روائی کرتی اور مرد و عورت، دونوں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے بجاے، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔

۷۷؎ بندۂ مومن کے دل میں جب اپنے پروردگار کا خیال پوری طرح بس جاتا ہے تو پھر وہ مقررہ اوقات میں کوئی عبادت کر لینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ ہمہ وقت اپنی زبان کو خدا کے ذکر سے تر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی دیکھتا ہے تو 'سبحان اللہ' کہتا ہے۔ کسی کام کی ابتدا کرتا ہے تو 'بسم اللہ' سے کرتا ہے۔ کوئی نعمت پاتا ہے تو 'الحمد للہ' کہہ کر خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ 'ان شاء اللہ' اور 'ما شاء اللہ' کے بغیر اپنے کسی ارادے اور کسی عزم کا اظہار نہیں کرتا۔ اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد چاہتا ہے۔ ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا طلب گار ہوتا ہے۔ ہر مشکل میں اُس سے رجوع کرتا ہے۔ سوتا ہے تو اُس کو یاد کر کے سوتا ہے اور اٹھتا ہے تو اُس کا نام لیتے ہوئے اٹھتا ہے۔ غرض ہر موقع پر اور ہر معاملے میں اُس کی زبان پر اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر یہی نہیں، وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، انفاق کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، برائی سے بچتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، اُس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے اور فوراً اُس سے رجوع کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔

اِس ذکر کی ایک صورت فکر بھی ہے۔ خدا کی اِس دنیا کو دیکھیے تو اِس میں ہزاروں مخلوقات ہیں، اُن کی رنگارنگی اور بوقلمونی ہے، پھر عقل انسانی اور اُس کے کرشمے ہیں، سمندروں کا تلاطم ہے، دریاؤں کی روانی ہے، لہلہاتا سبزہ اور آسمان سے برستا ہوا پانی ہے، لیل و نہار کی گردش ہے، ہوا اور بادلوں کے تصرفات ہیں، زمین و آسمان کی خلقت اور اُن کی حیرت انگیز ساخت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

(یہ منافقین اب خدا اور اُس کے رسول کے فیصلوں کو بھی ہدف مطاعن بنا رہے ہیں۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے گنجایش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو اُن کے لیے اپنے

الاحزاب ۳۳

ہے، اُن کی نفع رسانی اور فیض بخشی ہے، اُن کی مقصدیت اور حکمت ہے، پھر انفس و آفاق میں خدا کی وہ نشانیاں ہیں جو ہر آن نئی شان سے نمودار ہوتی ہیں۔ بندۂ مومن اِن آیات الٰہی پر غور کرتا ہے تو اُس کے دل و دماغ کو یہ خدا کی یاد سے بھر دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ پروردگار، یہ کارخانہ تو نے عبث نہیں بنایا۔ تیری شان علم و حکمت کے منافی ہے کہ تو کوئی بے مقصد کام کرے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس جہان رنگ و بو کا خاتمہ لازماً ایک روز جزا پر ہو گا جس میں وہ لوگ عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوں گے جو تیری اِس دنیا کو کھلنڈرے کا کھیل سمجھ کر اُس میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کے انجام سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

۸۷ انسان کے اخلاقی وجود کا حسن جب خُلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں درجۂ کمال کو پہنچتا ہے تو اُس سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں یا قرآن مجید کی رو سے ہونے چاہییں، وہ یہی دس اوصاف ہیں۔ پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اِن پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دین کا جمال و کمال قرآن کے نزدیک یہی ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اِسی تک پہنچنے اور اِسی کو پانے کی دعوت دیتا ہے۔ اِس کا صلہ خدا کی مغفرت اور وہ اجر عظیم ہے جس کی بندۂ مومن تمنا کر سکتا ہے۔ اِس سے آگے اگر کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے اور اُس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اخذ و اکتساب کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے، یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے۔

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا ﴿۳۶﴾

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ

اُس معاملے میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور (معلوم ہونا چاہیے کہ) جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گم راہی میں پڑ چکا۔ ۳۶

(اِنھوں نے یہ فتنہ اُس وقت اٹھایا)[۹۷]، جب تم اُس شخص سے بار بار کہہ رہے تھے

۹۷۔ یہاں سے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے واقعے کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کا نکاح حضور نے بہ اصرار اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش سے محض اِس لیے کرا دیا تھا کہ غلاموں کا مرتبہ معاشرے میں بڑھایا جائے اور اُن سے متعلق لوگوں کے تصورات میں تبدیلی پیدا ہو۔ لیکن اِس قسم کی معاشرتی اصلاحات کو لوگ آسانی سے قبول نہیں کرتے، اِس وجہ سے اِس نکاح کے خلاف ایک مخالفانہ فضا پیدا ہو گئی جس میں، ہو سکتا ہے کہ اِس طرح کی باتیں بھی کہی گئی ہوں کہ زینب ایک معزز گھرانے کی خاتون ہیں، مگر اُن پر یہ کیسا ظلم ہے کہ اُنھیں ایک ایسے شخص کے حبالۂ عقد میں دے دیا گیا ہے جو ابھی کل تک ایک زر خرید غلام تھا۔ یہ زید بن حارثہ کون تھے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''حضرت زید بن حارثہ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ یہ بچپن میں دشمن کی کسی غارت گری میں گرفتار ہوئے اور غلام بنا لیے گئے۔ حکیم بن حزام نے اِن کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ کے لیے خریدا۔ حضرت خدیجہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد نکاح میں آئیں تو اُنھوں نے اِن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ اِس طرح اِن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔ حضور کی غلامی کی جو قدر و عزت اِن کی نگاہوں میں تھی، اُس کا اندازہ اِس سے کیجیے کہ جب اِن کے والد اور چچا نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن کی آزادی کا مطالبہ کیا تو حضور نے اِن کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو اپنے باپ کے پاس چلے جائیں، چاہیں تو حضور کی خدمت میں رہیں۔ اِس موقع پر حضرت زید نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت کی جو مثال پیش کی، وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اُنھوں نے

عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخۡفِيۡ فِيۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِيۡهِ

جس پر اللہ نے انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا[۸۰] کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو[۸۱]، اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر

آزادی کا اختیار نامہ پا جانے کے باوجود اِس آزادی پر حضور کی غلامی کو ترجیح دی۔ خواجہ حافظ نے شاید اِسی واقعے کو سامنے رکھ کر اپنا یہ لاجواب شعر کہا ہو:

بولاے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی

از سر خواجگی کون و مکاں بر خیزم

اِس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کو آزاد کر دیا۔ اِن سے محبت تو اِن کی خوبیوں کے سبب سے حضور کو شروع ہی سے تھی، اِس واقعے کے بعد وہ دوچند ہو گئی، یہاں تک کہ حضور کے غیر معمولی التفات واعتماد کو دیکھ کر لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ آپ نے اِن کو منہ بولا بیٹا بنالیا ہے*۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۲۷)

۸۰؎ زید رضی اللہ عنہ کا یہ بڑا ہی دل نواز تعارف ہے، یعنی اللہ و رسول کے انعام یافتہ اور منظور نظر اور اِن الفاظ میں غالباً اِس لیے کرایا گیا ہے کہ منافقین کو تنبیہ ہو جو اُن کی غلامی کی وجہ سے قریش کی ایک شریف زادی کے ساتھ اُن کے نکاح کا مذاق اڑاتے رہے ہوں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا انعام یوں تو ہر فرد پر ہے۔ بندہ جو کچھ بھی پاتا ہے، خدا ہی سے پاتا ہے۔ لیکن حضرت زید کے حالات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اُن کے ساتھ بالکل اُس طرح کا معاملہ ہوا، جس طرح کا معاملہ حضرت یوسف کے ساتھ ہوا۔ یہ ایک غارت گری میں گرفتار ہوئے، (غالباً ایک نصرانی کے) غلام رہے، پھر غلام ہو کر بکے، بالآخر درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے اِن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جس کے بعد اِن کے لیے دین و دنیا کی سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انعام اِن پر یہ ہوا کہ آپ کے فیض خدمت سے اِن کو اسلام کی نعمت حاصل ہوئی۔ آپ نے اِن کو محبت و اعتماد کا وہ مقام بخشا کہ لوگ اِن کو حضور کا منہ

* الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ابن حجر العسقلانی ۱/۵۶۳۔

وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا

کرنے والا تھا[82]۔ اور تم لوگوں سے ڈر رہے تھے[83]، حالاں کہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ

بولا بیٹا سمجھنے لگے۔ آپ نے اِن کو غلامی سے آزادی بخشی۔ اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے شادی کر دی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضور نے اِن کو اپنے اہل بیت میں شامل کر لیا جس سے بڑا خاندانی شرف کوئی اور نہیں ہو سکتا۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۳۴)

۸۱۔ یعنی بغیر کسی معقول وجہ کے طلاق نہ دو، یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ آپ نے یہ اِس لیے فرمایا کہ زید اپنے ارادے کے حق میں اِس سے زیادہ کوئی بات نہیں بتا رہے تھے کہ میرے مقابل میں وہ اپنے خاندانی شرف کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں۔ اِس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اِس میں حضرت زینب کے رویے سے زیادہ حضرت زید کی شدت احساس کو دخل ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دل داریوں کے باوجود وہ اپنی غلامی کے دور کو بھولے نہیں تھے۔ پھر حضرت زینب کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ اُن کے مزاج میں فی الجملہ تمکنت اور تیزی بھی تھی اور منافقین نے فضا بھی بہت کچھ بدگمانی کی بنا دی تھی۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تمام فتنہ اور بدمزگی اُن کے نکاح کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور اِس کا علاج اب یہی ہے کہ اِسے ختم کر دیا جائے تاکہ زینب کی کبیدگی بھی رفع ہو اور وہ بھی اپنے سر کا بوجھ اتار کر اطمینان کا سانس لیں۔

آیت میں 'اِذْ تَقُوْلُ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ زید رضی اللہ عنہ نے اپنے ارادے کا اظہار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کئی بار کیا اور حضور ہر بار اُنھیں اِس سے روکتے رہے۔ یہ بات اگر نہ ہوتی تو عربیت کی رو سے 'قُلْتَ' کافی تھا، اِس کے لیے 'تَقُوْلُ' کی ضرورت نہیں تھی۔

۸۲۔ وہ کیا بات تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''...یہ نکاح چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ایک دینی مصلحت کے تحت کرایا تھا، اِس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ یہ کامیاب ہو۔ چنانچہ آپ نے حضرت زید کو ارادۂ طلاق سے بہ تاکید روکنے کی کوشش کی۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زید نے

وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ

تم اُس سے ڈرو۔[84] پھر جب زید نے اپنا رشتہ بیوی سے منقطع کر لیا[85] تو ہم نے اُس کو

طلاق دے دی تو زینب کو دہرا غم ہوگا کہ اُنھوں نے اِس نکاح کی بدولت دشمنوں کے طعنے بھی سنے اور بالآخر ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ بن کر اپنی حیثیت عرفی بھی ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھیں۔ اِن کی دل داری اور اِس نقصان کی تلافی کی واحد شکل پھر صرف یہ رہ جاتی تھی کہ حضور خود اُن کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ لیکن ایسا کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ منافقین اِس کو ایک اور اِس سے بھی بڑے فتنے کا ذریعہ بنا لیتے اور لوگوں میں یہ پھیلاتے کہ آپ نے اپنے متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ اِس فتنے سے بچنا چاہتے تھے، اِس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ طلاق کی نوبت نہ آئے، لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ نوبت آئے تاکہ آپ کے ہاتھوں جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح ہو اور انبیا علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری جو ڈالی ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی کی ملامت و مخالفت کی کوئی پروا نہ کریں، آپ اپنے عمل سے اُس کا مظاہرہ کریں۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۳۵)

۸۳؎ یعنی منافقین اور منافقات سے۔ اِس لیے کہ وہ پروپیگنڈے کا طوفان اٹھا دیتے کہ لیجیے اِنھوں نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لیا ہے اور اِس بات کا بھی خیال نہیں کیا کہ اِن کے نکاح میں اِس وقت چار بیویاں موجود ہیں، جب کہ خود ہی اعلان فرما چکے ہیں کہ ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار بیویاں حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ تھیں*۔

۸۴؎ یہ کوئی عتاب نہیں، بلکہ ایک اصولی حقیقت کی یاددہانی ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کو دین کے معاملے میں اپنے رب کے سوا ہر خوف و مصلحت سے بے پروا رہنا چاہیے، اِس لیے کہ اِس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ لوگوں کا خوف اور مصالح کا لحاظ ہی ہے۔

۸۵؎ آیت میں 'قَضٰی زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'وَطَر' کا لفظ

* الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۵۲۔

اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا ؕ وَکَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾

تم سے بیاہ دیا[۸۶] تاکہ مسلمانوں پر اُن کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے،[۸۷] جب وہ اپنا رشتہ اُن سے منقطع کر لیں۔ اور خدا کا حکم تو ہو کر ہی رہنا تھا۔[۸۸] ۳۷

اصلاً غرض کے معنی میں آتا ہے۔ اردو زبان میں جس طرح ہم کہتے ہیں کہ مجھے اب اُس سے کوئی غرض نہیں ہے اور اِس سے رشتہ و تعلق کا انقطاع مراد لیتے ہیں، اُسی طرح یہاں مراد لیا گیا ہے۔

۸۶۔ یعنی اُس کے ساتھ تمھارے نکاح کا فیصلہ کر دیا۔ یہی وہ بات ہے جس کے لیے پیچھے 'تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ' (تم اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے) کے الفاظ آئے ہیں۔ اللہ نے اُسے ظاہر کر دیا، دراں حالیکہ لوگوں کی ملامت کے اندیشے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گریز کرنا چاہتے تھے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اِس کے بعد حضور نے حضرت زید ہی کے واسطے سے حضرت زینب کو پیغام بھیجا جسے اُنھوں نے استخارے کے بعد منظور کر لیا۔ چنانچہ اُن کے بھائی ابو احمد بن جحش نے اُنھیں آپ کے نکاح میں دیا۔ اُن کا مہر چار سو درہم مقرر کیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت اہتمام کے ساتھ اِس نکاح کا ولیمہ بھی کیا۔*

۸۷۔ یعنی وہ اُن کے ساتھ بغیر کسی تردد کے نکاح کر سکیں اور ایک خلاف فطرت رسم جو قائم ہو گئی ہے، اُس کی اصلاح ہو جائے۔

۸۸۔ اِس لیے کہ خدا جب کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اُس کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ منافقین نے اِس نکاح کے خلاف جو فتنے اٹھائے، اُن سب کے علی الرغم یہ معاملہ اُسی طرح ہوا، جس طرح اللہ نے چاہا تھا کہ اِسے ہونا چاہیے۔

* الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۱۰۱۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/۲۵۹۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۣ ﴿۳۸﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾
مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ

نبی کے لیے جو بات اللہ نے ٹھیرا دی ہو، اُس میں اُس پر کوئی تنگی نہیں ہے[89]۔ (اُس کے پیغمبر) جو پہلے گزرے ہیں، اُن کے معاملے میں بھی اللہ کی یہی سنت رہی ہے اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے[90]۔ وہ جو اللہ کے پیغام پہنچاتے تھے اور اُسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ (لہٰذا تم بھی اُسی سے ڈرو، اے پیغمبر، اور مطمئن رہو کہ) حساب کے لیے اللہ کافی ہے[91]۔ ۳۸-۳۹

(حقیقت یہ ہے کہ) محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں[92]، بلکہ

۸۹؎ یعنی اُس کو کسی زحمت میں ڈالنا مقصود نہیں ہے، بلکہ خدا کی کوئی حکمت ہے جس کے تحت اِس طرح کی چیزیں اُس کے لیے مقسوم کی گئی ہیں کہ اُس کی زندگی میں پیش آئیں۔

۹۰؎ یعنی ایک ایسا فیصلہ ہوتا ہے جس کے ظہور کا وقت پہلے سے طے کر دیا جاتا ہے اور اُس کا حکم اُسی وقت پر اور اُس کے لیے طے شدہ پروگرام کے مطابق صادر ہوتا ہے۔ وہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہوتا جو اتفاق سے پیش آ گیا ہو اور آدمی اُس سے پریشان ہو جائے۔

۹۱؎ یعنی جب وہ کافی ہے تو پھر کسی اور کی باز پرس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۹۲؎ لہٰذا زید کے باپ کیوں ہونے لگے کہ اُس کی مطلقہ کے ساتھ نکاح پر یہ فتنہ اٹھایا جائے۔ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ اُن کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔

وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ (اِس لیے یہ ذمہ داری اُنھی کو پوری کرنی تھی)[۹۳]،

۹۳ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول ہیں، لہٰذا اللہ کی طرف سے جو ذمہ داری اُن پر ڈالی جائے گی، اُسے لازماً ادا کریں گے اور چونکہ آخری پیغمبر ہیں، اِس وجہ سے ضروری تھا کہ وہی اِسے ادا کریں۔ اُن کے بعد کوئی اور نبی آنے والا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اللہ اِس معاملے کو آیندہ کے لیے اٹھا رکھتا، لیکن اب کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، اِس لیے یہ ذمہ داری اُنھی کو پوری کرنی تھی اور خدا کے حکم پر اُنھوں نے اِسے پورا کر دیا ہے۔

آیت میں آپ کے لیے 'خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ 'خَاتِم' بکسر التاء نہیں، بلکہ 'خَاتَم' بفتح التاء ہے اور اِس کے معنی عربی زبان میں مہر کے ہیں۔ یہ لفظ جب اِس طرح آتا ہے تو ہمیشہ کسی چیز کو بند کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے اور آیت کا مدعا یہ ہے کہ یہ کام آپ ہی کو کرنا تھا، اِس لیے کہ آپ کے ذریعے سے سلسلۂ نبوت کو مہر بند کر دیا گیا ہے۔ آپ کے بعد اب کسی نبی یا رسول کو نہیں آنا ہے۔ یہ وہی مفہوم ہے جسے ہم انگریزی زبان میں 'seal of the prophets' کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ قرآن نے یہاں 'خَاتَمُ الرُّسُل' نہیں کہا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہر رسول لازماً نبی ہوتا ہے، لیکن ہر نبی کا رسول ہونا لازمی نہیں ہے۔ چنانچہ جب خاتم النبیین کہا جائے گا تو اِس سے 'خَاتَمُ الرُّسُل' بدرجۂ اولیٰ مراد ہوگا، اِسے الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اعلان فرمایا ہے کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ بلکہ اِس سے آگے یہ بات بھی آپ نے واضح کر دی ہے کہ آپ پر نبوت کا منصب ہی ختم نہیں ہوا، اُس کی حقیقت بھی ختم ہو گئی ہے، لہٰذا اب کسی شخص کے لیے نہ وحی و الہام کا امکان ہے، نہ مخاطبہ و مکاشفہ کا۔ ختم نبوت کے بعد اِس طرح کی سب چیزیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہیں۔*

* بخاری، رقم ۳۳۳۵، ۳۴۵۵، ۶۹۹۰۔

الاحزاب ۳۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ

اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے[94]۔ ۴۰

ایمان والو، (اِن کے شوروغوغا سے بے پروا ہو جاؤ اور) اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے رہو[95]۔ وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اُس کے فرشتے بھی تمھارے لیے اِس کی دعائیں کرتے ہیں[96] تاکہ تم کو تاریکیوں سے

الاحزاب ۳۳

۹۴ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے سارا غوغا برپا کیا ہے، اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ساری چیزوں سے اُن سے زیادہ باخبر ہے۔ وہ زید کو بھی جانتا ہے، زینب کو بھی جانتا ہے، اپنے پیغمبر سے بھی واقف ہے اور زید و زینب کے ساتھ اُن کے رشتے کی نوعیت سے بھی باخبر ہے۔ اِن باتوں میں سے کسی سے بھی وہ بے علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے، سب اُس کے اذن و ایما سے ہوا ہے، اِس وجہ سے اُس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنا جہالت و حماقت ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر بھروسا کیا جائے اور جو اصلاح عمل میں آئی ہے، اُس کی قدر کی جائے۔ خدا کا محیط کل علم ہی ہر چیز کی باریکیوں اور حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے اُس کی ساری حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔" (تدبر قرآن ۲۳۹/۶)

۹۵ یہ نماز کی تعبیر اور عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ راہ حق پر ثابت قدمی کے لیے قرآن میں یہ تلقین جگہ جگہ کی گئی ہے، اِس لیے کہ شیطان اور اُس کی ذریات کے مقابل میں بندۂ مومن کی اصل سپر یہی خدا کی یاد ہے۔

۹۶ خدا اور فرشتوں کے لیے اصل میں ایک ہی لفظ 'يُصَلِّيْ' استعمال ہوا ہے۔ یہ عربیت کے اُس اسلوب پر ہے، جس میں نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ﴿۴۳﴾ تَحِیَّتُھُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۖۚ وَاَعَدَّ لَھُمْ اَجْرًا کَرِیْمًا ﴿۴۴﴾
یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ

الاحزاب ۳۳

نکال کر روشنی میں لے آئے اور وہ ایمان والوں پر بہت مہربان ہے[۹۷]۔ جس دن وہ اُس سے ملیں گے، اُن کا تحیّہ (اُس کی طرف سے) سلام ہوگا اور اُن کے لیے اُس نے بڑی عزت کا صلہ تیار کر رکھا ہے۔ ۴۱-۴۴

اے نبی، (تم بھی بے پروا ہو جاؤ)، ہم نے تمھیں گواہی دینے والا اور خوش خبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا اور اللہ کے اذن سے اُس کی طرف دعوت دینے والا اور (لوگوں کو تاریکیوں سے نکالنے کے لیے) ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے[۹۸]۔ (تم اپنی یہ ذمہ داریاں

۹۷؎ یعنی جب وہ ایسا مہربان ہے تو تمھاری زبان کو بھی اُس کے ذکر و شکر سے ہمیشہ تر رہنا چاہیے۔

۹۸؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب دعوت ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر بھی دنیا میں آئے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے اذن سے اور اُس کی طرف سے مامور ہو کر اِسی دعوت الی اللہ اور انذار و بشارت کے لیے آئے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت 'کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ*' میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔ اِن نبیوں میں سے اللہ تعالیٰ نے جنھیں رسالت کے منصب پر فائز کیا، اُن کے بارے میں، البتہ قرآن بتاتا ہے کہ وہ اِس انذار کو اپنی قوموں پر شہادت کے مقام تک پہنچا دینے کے لیے بھی مامور تھے۔

* ۲: ۲۱۳۔ ''لوگ ایک ہی امت تھے۔ (اُن میں اختلاف پیدا ہوا) تو اللہ نے نبی بھیجے بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے۔''

بِاَنَّ لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ فَضۡلًا كَبِيۡرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَدَعۡ اَذٰىهُمۡ وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۴۸﴾

ادا کرو) اور اپنے ماننے والوں کو بشارت دو کہ اللہ کی طرف سے اُن کے لیے بہت بڑا فضل ہے۔ تم اِن منکروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو اور اِن کی سب اذیتیں نظر انداز کر دو اور اللہ پر بھروسا رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے[99]۔ ۴۵-۴۸

الاحزاب ۳۳

قرآن کی اصطلاح میں اِس کے معنی یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اِس طرح واضح کر دیا جائے کہ اِس کے بعد کسی شخص کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو: 'لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ'* (تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہ رہے)۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اِس سے انحراف کریں گے تو اُس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ بچشم سر دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہی شہادت ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی ان آیات میں 'شَاهِدًا' کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِسی منصب کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے اور غور کیجیے تو 'خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ' ہی کی طرح موقع کلام کی رعایت سے نہایت موزوں استعمال ہوا ہے۔

* النساء۴: ۱۶۵۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ

(اِس نکاح کے لیے کسی عدت کی ضرورت نہیں ہے، جس کا حکم ہم نے پیغمبر کو دیا ہے)۔ ایمان والو، (اِس لیے کہ) جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرتے ہو[100]، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے اُن کو طلاق دے دیتے ہو تو اُن پر تمھاری خاطر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تم شمار کرو گے[101]۔ لیکن (اِس صورت میں بھی ضروری ہے کہ) اُنھیں

۹۹۔ یہ انذار بھی ہے اور بشارت بھی۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس آیت کے اندر حضور کے لیے جو تسلی ہے، وہ بھی لفظ لفظ سے نمایاں ہے اور مخالفوں کے لیے جو قہر و غضب ہے، وہ بھی حرف حرف سے ابلا پڑ رہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ تمھارا کام اتمام حجت ہے، اِس کے بعد اِن کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو، وہ اِن سے نمٹنے کے لیے کافی ہے۔

۱۰۰۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ نکاح اصلاً مسلمان عورتوں ہی سے جائز ہے۔ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ اِس کی اجازت ایک استثنا ہے جس سے اُسی صورت میں فائدہ اٹھانا چاہیے، جب ماحول میں اسلام اور اسلامی تہذیب کا غلبہ ہو۔

۱۰۱۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عدت کی پابندی کا حکم دیا ہی اِس لیے گیا ہے کہ عورت کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہو جائے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ حمل کا امکان ہو تو عدت عورت پر ایک حق واجب ہے، جیسا کہ 'عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ' کے الفاظ سے واضح ہے۔ لیکن اِس کا امکان نہ ہو تو عدت کی کوئی پابندی نہیں ہے، اِس صورت میں طلاق کے فوراً بعد عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں اِس قانون کا حوالہ اصلاً تو اُنھی اعتراضات کے سدباب کے لیے دیا ہے جو فتنہ پردازی کے اُس ماحول میں اِس بات پر بھی کیے جا سکتے تھے کہ اُدھر زید نے طلاق دی اور اِدھر سیدہ زینب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں

فَمَتِّعُوۡهُنَّ وَسَرِّحُوۡهُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴿۴۹﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ الّٰتِيۡۤ اٰتَيۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ

کچھ سامان زندگی دو اور اُن کو بھلے طریقے سے رخصت کرو۔[۱۰۲] ۴۹

(اور اِس کے لیے کسی بیوی کو طلاق دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس نکاح کے باوجود) ہم نے تمھاری سب بیویوں کو، جن کے مہر تم ادا کر چکے ہو، تمھارے لیے

دینے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن اِس کے ساتھ یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح کر دی ہے کہ وہ کیا صورت حال تھی جس میں زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار روکنے کے باوجود بالآخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ اُنھیں سیدہ کو طلاق دے دینی چاہیے۔ قرآن کے اِس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ کم و بیش ایک سال اُن کے نکاح میں رہیں، مگر اُن کی شخصیت سے زید رضی اللہ عنہ کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ اِس پورے عرصے میں وہ اُن کے ساتھ ایک مرتبہ بھی زن و شو کا تعلق قائم کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ چنانچہ خود بیان کرتے ہیں کہ طلاق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھے آپ کی طرف سے نکاح کا پیغام دینے کے لیے بھیجا تو اُن کو دیکھ کر اُن کی ایسی عظمت میرے دل میں پیدا ہوئی کہ میں اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکا۔*

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات صرف اِس چیز کی وضاحت کے لیے بیان فرمائی ہے کہ طلاق کے فوراً بعد سیدہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں دینے کا اعلان کیوں کیا گیا۔ آپ اُن کو اپنے گھر میں کب لائے؟ اِس کا اِس وضاحت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۰۲۔ یعنی اِس صورت میں بھی کہ تم نے اُنھیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ اِس کی وضاحت سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۴۱ کے تحت ہو چکی ہے۔

* مسلم، رقم ۳۴۹۱۔

وَمَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ

جائز ٹھیرا دیا ہے[۱۰۳]، اے نبی۔ اور (صرف اُنھی کو نہیں، اُن کے ساتھ) اُن (خاندانی عورتوں[۱۰۴]) کو بھی جائز ٹھیرا دیا ہے جو اللہ نے تمھیں غنیمت میں دیں اور وہ اُن میں سے تمھاری

۱۰۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خواہش سے اور ازدواج کی فطری ضرورتوں کے تحت پوری زندگی میں صرف تین نکاح کیے ہیں: ایک حضرت خدیجہ سے، دوسرا اُن کی وفات کے بعد اپنی بچیوں کی نگہداشت اور گھر در کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ایک بیوہ اور سن رسیدہ خاتون حضرت سودہ سے اور تیسرا حضرت عائشہ سے جو اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کی بنا پر اُس علم و حکمت کی سب سے بڑی معلّمہ بن کر آپ کے گھر میں رہیں جو خدا نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اِس کے علاوہ آپ نے جتنے نکاح کیے ہیں، خدا کے رسول کی حیثیت سے اپنی دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے کیے ہیں۔ چنانچہ سیدہ حفصہ سے آپ نے اپنے انتہائی قریبی ساتھی سیدنا عمر کی دل داری کے لیے نکاح کیا جو اپنی بیٹی کے بیوہ ہو جانے کے بعد اُس کی شادی کے لیے سخت پریشان تھے اور سیدہ زینب بنت خزیمہ اور سیدہ ام سلمہ سے اِس لیے کہ دونوں کے شوہر اُن جنگوں میں شہید ہو گئے تھے جو آپ ہی پر ایمان لانے کی وجہ سے اُن کو لڑنی پڑی تھیں*۔

زینب بنت جحش کے ساتھ نکاح کا حکم آپ کو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تالیف قلب اور ایک رسم جاہلی کی اصلاح کے لیے دیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اِس کا حکم آپ کو دیا گیا تو اُس وقت چار بیویاں، حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ آپ کے نکاح میں موجود تھیں۔ یہ معلوم ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں کسی مسلمان کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اِس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اِس حکم کی تعمیل کے لیے کیا پہلے سے موجود کسی بیوی کو طلاق دینا پڑے گی؟ قرآن نے یہ اِسی سوال کا جواب دیا ہے کہ آپ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے اور آگے مزید وضاحت کر دی ہے کہ عام مسلمانوں سے الگ نکاح و طلاق کا ایک خصوصی قانون

* الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۹۶، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۳۲۔

عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ز

ملکیت میں آ گئی ہوں اور تمھارے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور ماموؤں

آپ کے لیے نازل کیا جا رہا ہے جس کی رو سے آپ اگر چاہیں تو درج ذیل مقاصد سے مزید نکاح بھی کر سکتے ہیں:

۱۔ اُن خاندانی عورتوں کی عزت افزائی کے لیے جو آپ کے کسی جنگی اقدام کے نتیجے میں قیدی بن کر آپ کے قبضے میں آ جائیں۔

۲۔ اپنی اُن چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں کی تالیف قلب کے لیے جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی اور اِس طرح اپنا گھر بار اور اپنے اعزہ واقربا، سب کو چھوڑ کر آپ کا ساتھ دیا ہے۔

۳۔ اُن خواتین کی دل داری کے لیے جو محض حصول نسبت کی غرض سے آپ کے ساتھ نکاح کی خواہش مند ہوں اور آگے بڑھ کر اپنے آپ کو ہبہ کر دیں۔

چنانچہ سیدہ جویریہ اور سیدہ صفیہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مقصد سے نکاح کیا۔ سیدہ ام حبیبہ دوسرے مقصد سے آپ کی ازواج میں شامل ہوئیں اور سیدہ میمونہ کے ساتھ آپ کا نکاح تیسرے مقصد کے پیش نظر ہوا۔

۱۰۴؎ آیت میں 'وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ' کے بعد 'مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ' کے الفاظ بھی ہیں۔ یہ اِسی وضاحت کے لیے آئے ہیں کہ 'مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ' سے یہاں لونڈیاں نہیں، بلکہ وہ خاندانی عورتیں مراد ہیں جو کسی جنگ میں قید ہو کر آئیں اور اپنے حالات اور اپنی خاندانی وجاہت کی بنا پر اِس کی مستحق ہوں کہ حضور ہی اُن کے ساتھ نکاح کریں جس سے اُن کے اُس صدمے کا مداوا ہو سکے جو جنگ میں اسیر ہو جانے سے اُنھیں پہنچا ہے۔ یہ نکاح، ظاہر ہے کہ اُن عورتوں کو آزاد کر کے اُن کی رضامندی سے کیے جائیں گے۔

وَامۡرَاَةً مُّؤۡمِنَةً اِنۡ وَّهَبَتۡ نَفۡسَهَا لِلنَّبِىِّ اِنۡ اَرَادَ النَّبِىُّ اَنۡ يَّسۡتَنۡكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ قَدۡ عَلِمۡنَا

کی بیٹیاں اور تمھاری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی مسلمان عورت، اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ کر دے، اگر نبی اُس کو نکاح میں لینا چاہے۔[105] یہ حکم دوسرے مسلمانوں سے الگ خاص تمھارے لیے ہے۔[106]

الاحزاب ۳۳

۱۰۵؎ ہبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہر حق سے دست بردار ہو کر کوئی عورت اپنے آپ کو کسی کے حوالے کر دے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ ایک انتہائی ایثار نفس کی صورت ہے جس کا جذبہ، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض شرف نسبت حاصل کرنے کے لیے متعدد صحابیات کے اندر موجود تھا اور اُنھوں نے حضور سے اِس کا اظہار بھی کیا۔ حضور کی گھریلو زندگی، ہر شخص کو معلوم ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔...امہات المومنین کی غریبانہ زندگی ہی کی بنا پر منافقات اُن کے اندر وسوسہ اندازی کرتی رہتی تھیں کہ اگر وہ طلاق حاصل کر لیں تو وقت کے بڑے بڑے سردار اُن کو نکاح کے پیغام دیں گے اور اُن کی یہ فقر و فاقہ کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی سے بدل جائے گی۔ اِس طرح کی غریبانہ زندگی کے لیے، ظاہر ہے کہ کوئی عورت دنیا کی کوئی طمع پیش نظر رکھ کر یہ بازی نہیں کھیل سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے۔ یہ قربانی تو وہی خواتین کر سکتی تھیں جن کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عقیدت و فدویت کا ایسا جذبہ ہو کہ وہ حضور کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ہر ارمان قربان کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ جذبہ ایک نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ جذبہ تھا، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِس کا لحاظ فرمایا اور حضور کو یہ اجازت دی کہ اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو اِس طرح ہبہ کر دے اور حضور اُس کو اپنے عقد نکاح میں لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ 'اِنۡ اَرَادَ النَّبِىُّ اَنۡ يَّسۡتَنۡكِحَهَا' کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر چند یہ جذبہ نہایت محمود اور پاکیزہ ہے، لیکن اِس کی حوصلہ افزائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ اِس وجہ

مَا فَرَضۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيٓ اَزۡوَاجِهِمۡ وَمَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ لِكَيۡلَا يَكُوۡنَ عَلَيۡكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۵۰﴾ تُرۡجِيۡ مَنۡ تَشَآءُ

ہم کو معلوم ہے جو کچھ ہم نے اُن کی بیویوں اور اُن کی لونڈیوں کے معاملے میں اُن پر فرض کیا ہے۔ اِس لیے خاص تمھارے لیے ہے کہ (اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں) تم پر کوئی تنگی نہ رہے[107]، اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ (اور بیویوں کے حقوق زوجیت میں برابری بھی اب تمھارے لیے ضروری نہیں ہے)[108]۔

الاحزاب ۳۳

سے یہ معاملہ کلیتاً آپ کی صواب دید پر منحصر ہے کہ کسی کی اِس طرح کی پیش کش کو آپ قبول کریں یا نہ کریں۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۵۵)

۱۰۶؎ یعنی ایک خاص دائرے میں نکاح کی پابندی اور چار سے زیادہ بیویوں کی یہ اجازت صرف تمھارے لیے ہے، یہ عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں، ان میں دوسرے مسلمان آپ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

۱۰۷؎ یعنی جن دینی اور اخلاقی مصالح کی خاطر یہ اجازت دی گئی ہے، اُنھیں آپ بغیر کسی زحمت کے پورا کر سکیں۔ اِن مصالح کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی ہے۔

۱۰۸؎ یعنی جب یہ نکاح آپ نے اپنی خواہش سے نہیں کیے، بلکہ دوسروں کی تالیف قلب اور دل داری کے لیے یا خدا کے کسی حکم کی تنفیذ کے لیے کیے ہیں تو یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے کہ بیویوں کے ساتھ بالکل یکساں تعلق رکھنے کا حکم آپ کے لیے بدستور قائم رکھا جائے۔ چنانچہ یہ پابندی بھی آپ سے اٹھا دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک رعایت تھی اور حضور اگر چاہتے تو اِس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، لیکن آپ کے تمام سیرت نگار اِس پر متفق ہیں کہ اِس آزادی کے باوجود آپ نے اپنے اوپر عدل و انصاف کی پابندی پوری طرح قائم رکھی اور آخر عمر تک کبھی اِس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

مِنۡهُنَّ وَتُـْٔوِیۡۤ اِلَیۡكَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡكَ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُهُنَّ وَلَا یَحۡزَنَّ وَیَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا

تم اُن میں سے جسے چاہو الگ رکھو اور جسے چاہو اپنے پاس رکھو اور جن کو (کسی وقت) الگ رکھا تھا، اُن میں سے پھر کسی کو بلوا لو تو اِس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (ہم نے یہ وضاحت اِس لیے کر دی ہے کہ اِس کے بعد) یہ زیادہ قرین ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ تم اُن کو دو گے، سب اُس پر راضی رہیں گی۔[109] اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے

۱۰۹؎ چنانچہ خانگی زندگی میں آپ کے لیے کوئی الجھن اِس کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوگی اور آپ پورے سکون کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر سکیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یہ ازواج مطہرات کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اپنے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلق کو عام میاں بیوی کے تعلق کی کسوٹی پر نہ پرکھیں، بلکہ پیغمبر کی اصل ذمہ داری اور اپنی اصل حیثیت کو سامنے رکھ کر جانچیں۔ اصل چیز زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر اُس میں تبدیلی ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھ جائیں گی کہ پیغمبر کے ساتھ اُن کا اصل تعلق صرف میاں بیوی کا نہیں، بلکہ خدمت دین کا ہے تو پھر حقوق کے معاملے میں نہ باہم ازواج میں کوئی رقابت ہوگی اور نہ پیغمبر ہی سے کوئی گلہ وشکوہ رہے گا، بلکہ اپنے مصروف لمحات میں سے پیغمبر جو کچھ جس کو بخش دیں گے، وہ اُسی پر قناعت کریں گی۔ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے بعد دینی خدمت کے اعتبار سے جس کا مرتبہ بلند ہوگا، اُس کی قدر جس طرح نبی کی نظروں میں ہوگی، اُسی طرح آپ کی ازواج کی نگاہوں میں بھی ہوگی اور باہمی رشک و رقابت کی تمام تلخیاں کافور ہو جائیں گی۔“

(تدبر قرآن ۶/۲۵۷)

حَلِيْمًا ﴿٥١﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِيْبًا ﴿٥٢﴾

اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ اِن کے بعد اب دوسری عورتیں تمھارے لیے جائز نہیں ہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ اِن کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، اگرچہ اُن کا حسن تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔[۱۱۰] تمھاری لونڈیاں، البتہ مستثنیٰ ہیں۔[۱۱۱] اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔[۱۱۲] ۵۰-۵۲

۱۱۰؎ یعنی آپ کے لیے جو دائرہ مقرر کر دیا گیا ہے، اُس سے باہر نہ آپ اب کوئی نکاح کر سکتے ہیں اور نہ ازواج میں مجرد پسند اور ناپسند کی بنا پر کوئی تبدیلی فرما سکتے ہیں۔ یہ پابندی، ظاہر ہے کہ عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ آپ کو اگرچہ بعض معاملات میں آزادی دی گئی، لیکن دوسری طرف آپ پر ایسی پابندیاں بھی عائد کر دی گئی ہیں کہ نکاح و طلاق، دونوں ہی کے معاملے میں آپ دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کہیں زیادہ پابند ہو گئے ہیں۔

۱۱۱؎ اُس وقت کے حالات میں یہ استثنا ضروری تھا، اِس لیے کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی ممانعت کے باوجود غلامی ابھی عملاً ختم نہیں ہوئی تھی۔ قرآن نے اِسی بنا پر اِسے عام مسلمانوں کے معاملے میں بھی ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ حضرت ماریہ اِسی حیثیت سے آپ کے پاس رہیں اور اُن کے بطن سے آپ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

۱۱۲؎ اِس تذکیر و تنبیہ کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اوپر اِسی نوعیت کی تذکیر و تنبیہ ازواج مطہرات کو کی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں ہر ایک مسئول ہے اور جو جتنا ہی بڑا ہے، اتنا ہی زیادہ مسئول ہے۔ اِس وجہ سے ہر ایک کے لیے ضروری ہوا کہ خدا کے مواخذے سے پہلے اپنا محاسبہ کرتا رہے اور اِس یقین کے ساتھ محاسبہ کرتا رہے کہ اُس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/۲۵۸)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ

(یہ منافقین اپنی شرارتوں سے باز نہیں آ رہے، اِس لیے) ایمان والو[۱۱۳]، تم اب نبی کے گھروں میں نہ جایا کرو، الّا یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے، جب بھی اِس طرح کہ اُس کی تیاری کے منتظر نہ رہو۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو (وقت کے وقت) داخل ہو، پھر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو[۱۱۴]۔ اِس سے پیغمبر کو اذیت ہوتی ہے، مگر وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ حق بات کہنے

۱۱۳۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن اِس کے پس پردہ وہی منافقین ہیں جن کا ذکر سورہ کی ابتدا سے ہو رہا ہے۔ تدریجی انکشاف کے اصول پر یہ چیز آگے کی آیتوں سے واضح ہو جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو اُن کی شرارتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں چند مزید ہدایات دی ہیں۔

۱۱۴۔ یہ پہلی ہدایت ہے کہ اب کوئی مسلمان بغیر اجازت اور بن بلائے حضور کے گھروں میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ لوگوں کو کھانے کی دعوت بھی دی جائے گی تو وہ وقت کے وقت آئیں گے اور کھانا کھانے کے بعد منتشر ہو جائیں گے۔ کھانے کی تیاری کے انتظار میں وہ نہ پہلے جا کر بیٹھ جائیں گے اور نہ کھانے کے بعد بغیر کسی وجہ کے باتوں میں لگے ہوئے وہاں بیٹھے رہیں گے۔ یہ اِس لیے بھی ضروری تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے ساتھ کوئی مردانہ بیٹھک نہیں تھی۔ لوگ خواتین کے قریب ہی صحن میں کہیں جا کر بیٹھ جاتے تھے اور منافقین اِس سے فائدہ اٹھا کر اپنی کوششوں میں لگ جاتے تھے کہ اُن کو ازواج مطہرات کے اندر کوئی موقع وسوسہ اندازی اور ریشہ دوانی کا ہاتھ آئے۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ

میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا[115]۔ اور تمھیں جب نبی کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو[116]۔ یہ تمھارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور اُن کے دلوں کے لیے بھی[117]۔ تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ اُس کے بعد تم اُس کی بیویوں سے کبھی نکاح کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ

الاحزاب
۳۳

۱۱۵ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کم زوری کا ذکر نہیں ہے، بلکہ آپ کی ایک پسندیدہ خصلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ نہایت کریم النفس اور ذی مروت ہیں۔

۱۱۶ یہ دوسری ہدایت ہے کہ ازواج مطہرات اب پردے میں رہیں گی اور تم میں سے کوئی اُن کے سامنے نہ آئے گا۔ جس کو کوئی چیز لینا ہو گی، وہ بھی پردے کے پیچھے ہی سے لے گا، دندناتا ہوا اُن کے سامنے نہیں چلا جائے گا۔

۱۱۷ یہ ایک دفع دخل مقدر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ بظاہر یہ بات ایک غیر ضروری تکلف محسوس ہوتی ہے کہ کسی کو اُن سے ایک گلاس پانی مانگنے کی بھی ضرورت پیش آئے تو اُس کے لیے بھی پردے کا اہتمام کرے، لیکن یہ کوئی تکلف نہیں ہے، بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کی ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ انسان کا دل جس نے بنایا ہے، وہ اُس کی کم زوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کن کن مخفی راستوں سے یہ دل برے اثرات قبول کرتا ہے اور دل ہی وہ چیز ہے جس پر انسان کی تمام اخلاقی صحت کا انحصار ہے۔ اِس وجہ سے ضروری ہے کہ جن کو اپنے دل کی صحت مطلوب ہو، وہ اُس کو اُن تمام چیزوں سے محفوظ رکھیں جو اُس کو غبار آلود کر سکتی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۶۴)

عَظِيمًا ﴿۵۳﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۵۴﴾

بڑی سنگین بات ہے۔ تم کسی چیز کو ظاہر کرو یا اُس کو چھپاؤ، اللہ کے لیے برابر ہے، اِس لیے کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے[۱۱۸]۔ ۵۳-۵۴

۱۱۸؎ یہ تیسری ہدایت ہے کہ پیغمبر کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں، جو منافقین اُن سے نکاح کے ارمان اپنے دلوں میں رکھتے ہیں، اُن پر واضح ہو جانا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اُن کی یہ حرمت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئی ہے۔ لہٰذا ہر صاحب ایمان کے دل میں احترام وعقیدت کا وہی جذبہ اُن کے لیے ہونا چاہیے جو وہ اپنی ماں کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لوگوں کی یہ باتیں باعث اذیت رہی ہیں۔ اب وہ متنبہ ہو جائیں کہ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ بڑی ہی سنگین بات ہے۔ یہاں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی کسی نازیبا سے نازیبا حرکت کے لیے بھی کوئی عذر تراش لے، لیکن وہ پروردگار جو دلوں کے بھید تک سے واقف ہے، یہ باتیں اُس کے حضور میں کسی کے کام نہ آسکیں گی۔

اوپر کی آیتوں میں حضور کا ذکر بار بار 'نَبِی' کے لفظ سے ہوا ہے، لیکن یہاں 'رَسُوْلَ اللّٰهِ' کا لفظ ہے۔ اِس سے اِس تنبیہ کی شدت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمھارا معاملہ خدا کے رسول سے ہے اور رسول اپنی قوم کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے، وہ محض وعظ سنانے کے لیے نہیں آتا۔ چنانچہ متنبہ ہو جاؤ، تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ تم اپنے لیے کس انجام کو دعوت دے رہے ہو۔

اِس میں، اگر غور کیجیے تو اُن لوگوں کے چہرے سے اللہ تعالیٰ نے نقاب اٹھا دی ہے، جن کو پیش نظر رکھ کر یہ ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اِس لیے کہ یہ منافقین ہی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کے درپے رہتے اور اپنے دلوں میں یہ ارمان رکھتے تھے کہ آپ کی ازواج سے نکاح کریں تاکہ اللہ و رسول کے خلاف فتنہ انگیزی کا کوئی ذریعہ میسر ہو سکے، کسی سچے مسلمان سے اِس طرح کی کوئی چیز متصور نہیں ہو سکتی تھی۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

نبی کی بیویوں پر اپنے باپوں کے سامنے ہونے میں، البتہ کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ اپنے بیٹوں کے، نہ اپنے بھائیوں کے، نہ اپنے بھتیجوں کے، نہ اپنے بھانجوں کے، نہ اپنے میل جول کی عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے سامنے ہونے میں کوئی گناہ ہے۔ تم اللہ سے ڈرتی رہو، (بیبیو)۔ بے شک، اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے[119]۔ ۵۵

(یہ منافقین نہیں جانتے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے نبی پر رحمت

۱۱۹؎ یہ اوپر کے حکم سے استثنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں اب یہی لوگ بے تکلفی کے ساتھ داخل ہوسکیں گے یا جو اِن کے حکم میں ہوں گے۔ باقی سب لوگوں کے لیے آپ کی بیویاں اب حجاب میں رہیں گی۔ پیغمبر کے دشمنوں اور منافقین نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے، اُس میں یہ پابندی ضروری ہے اور یہ پوری خدا ترسی اور تقویٰ کے ساتھ ہونی چاہیے، اِس سے محض خانہ پری مقصود نہیں ہے۔

اِس سے واضح ہے کہ لوگوں سے حجاب میں رہنے کا یہ حکم ایک خصوصی حکم ہے جو منافقین کی پیدا کردہ ایک خاص صورت حال میں اُن کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو دیا گیا تاکہ پیغمبر کا گھرانا کسی اسکینڈل کی زد میں نہ آجائے۔ اِس کا عام عورتوں اور عام حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ

بھیج رہے ہیں۔ ایمان والو، (تمھارے لیے بھی صحیح رویہ یہ ہے کہ) تم بھی اُس پر درود و سلام بھیجو۔[۱۲۰] اللہ اور اُس کے رسول کو جو لوگ اذیت پہنچا رہے ہیں، اُن پر اللہ نے دنیا اور آخرت، دونوں میں لعنت کر دی ہے[۱۲۱] اور اُن کے لیے اُس نے

۱۲۰۔ اِس آیت سے جو حقیقتیں سامنے آتی ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک یہ کہ جس نبی کا مرتبہ اللہ اور اُس کے فرشتوں کی نظروں میں یہ ہے کہ اللہ اُس پر رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے اُس پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، حیف ہے اگر انسانوں میں سے کچھ لوگ اُس کے درپے آزار ہوں، درآں حالیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی احسان انسانوں ہی پر ہے، نہ کہ خدا اور اُس کے فرشتوں پر۔

دوسری یہ کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان نہیں کرتے، بلکہ خدا اور اُس کے فرشتوں کی ہم نوائی کر کے وہ اپنے کو سزاوار رحمت بناتے ہیں۔ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے، جب آپ کو اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں تو وہ دوسروں کی دعاؤں کے محتاج نہیں ہیں۔

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا مرض نفاق کا علاج ہے۔ اِس لیے کہ یہاں جس محل میں اِس کی ہدایت فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ منافقوں کی طرح نبی کو ایذا پہنچانے کے بجائے اہل ایمان کو نبی پر درود بھیجنا چاہیے۔ اِس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ جو لوگ درود کا اہتمام رکھتے ہیں، اُن کے اندر نفاق راہ نہیں پاتا۔

چوتھی یہ کہ مقصود درود و سلام کی تکثیر ہے۔ موقع و محل بھی اِس مفہوم کا متقاضی ہے اور آیت کے الفاظ بھی اِسی کے شاہد ہیں۔ اِس لیے کہ 'سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا' میں مصدر تاکید و تکثیر کے مفہوم پر دلیل ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۶۷)

يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۸﴾

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا

رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو (اِسی طرح اُن پر تہمتیں لگا کر)، بغیر اِس کے کہ اُنھوں نے کچھ کیا ہو، اذیت دے رہے ہیں، اُنھیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے۔[۱۲۲] ۵۶-۵۸

(اِن کی شرارتوں سے اپنی حفاظت کے لیے)، اے نبی، تم اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور سب مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ (اندیشے کی جگہوں پر جائیں تو) اپنی چادروں میں سے کوئی بڑی چادر اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔[۱۲۳] اِس سے امکان

۱۲۱۔ دنیا میں بھی اِس لیے کہ معاملہ خدا کے رسول کا تھا اور رسولوں کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔

۱۲۲۔ اِس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گھر والے ہی نہیں، دوسرے مسلمان مرد اور عورتیں بھی اُس زمانے میں منافقین کی شرارتوں کا ہدف بنے ہوئے تھے اور اُن کی اخلاقی ساکھ کو مجروح کرنے کے لیے وہ اُنھیں بھی کسی نہ کسی طریقے سے متہم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ آگے جو حکم دیا گیا ہے، اُس میں عام مسلمان عورتوں کو اِسی بنا پر شامل کر دیا ہے۔ تاہم اُس طرح کے خطرات اُن کے لیے نہیں تھے، جن کا پیچھے ازواج مطہرات سے متعلق ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ وہاں شامل نہیں کیا گیا۔

۱۲۳۔ اصل میں 'يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں تبعیض ہمارے نزدیک 'جِلْبَابًا مِّنْ جَلَابِيْبِهِنَّ' کے مفہوم پر دلالت کے لیے ہے، یعنی اپنے گھروں میں موجود چادروں میں سے کوئی بڑی چادر جو بالعموم اوڑھنی کے اوپر لی جاتی تھی۔

يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ

ہے کہ الگ پہچانی جائیں گی تو ستائی نہ جائیں گی۔[۱۲۴] اِس کے باوجود (کوئی خطا ہوئی تو) اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۵۹

یہ منافقین اگر (اِس کے بعد بھی) اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے اور وہ بھی جن کے دلوں میں بیماری ہے[۱۲۵] اور جو مدینہ میں لوگوں کو بھڑکانے کے لیے جھوٹ اڑانے والے

۱۲۴۔ اِن الفاظ سے بھی واضح ہے اور حکم کا سیاق وسباق بھی بتا رہا ہے کہ یہ عورتوں کے لیے پردے کا کوئی حکم نہیں تھا، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے اُن کی الگ شناخت قائم کر دینے کی ایک وقتی تدبیر تھی جو اوباشوں اور تہمت تراشنے والوں کے شر سے اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ وہ اندیشے کی جگہوں پر جائیں تو دوسری عورتوں سے الگ پہچانی جائیں اور اُن کے بہانے سے اُن پر تہمت لگانے کے مواقع پیدا کر کے کوئی اُنھیں اذیت نہ دے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں جب رات کی تاریکی میں یا صبح منہ اندھیرے رفع حاجت کے لیے نکلتی تھیں تو منافقین کے اشرار اُن کے درپے آزار ہوتے اور اِس پر گرفت کی جاتی تو فوراً کہہ دیتے تھے کہ ہم نے تو فلاں اور فلاں کی لونڈی سمجھ کر اُن سے فلاں بات معلوم کرنا چاہی تھی۔*

۱۲۵۔ یعنی حسد، کینہ اور بغض وعناد کی بیماری ہے۔ یہ بھی منافقین ہی کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جو صرف منافق ہی نہیں تھا، اِس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے بارے میں اپنے دل میں سخت عناد بھی رکھتا تھا اور مسلمانوں کے اندر داخل ہو کر اُن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

---

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۳/ ۵۱۸۔

اِلَّا قَلِيْلًا ۛۚ ﴿٦٠﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۛۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾
سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾
يَسْــَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ

ہیں[126] تو ہم اُن پر تمھیں اکسا دیں گے،[127] پھر وہ تمھارے ساتھ اِس شہر میں کم ہی رہنے پائیں گے۔ اُن پر پھٹکار ہوگی، جہاں ملیں گے، پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کر دیے جائیں گے۔[128] یہی اُن لوگوں کے بارے میں اللہ کی سنت ہے جو پہلے گزر چکے ہیں[129] اور اللہ کی اِس سنت میں تم ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔[130] ۶۰-۶۲

الاحزاب ۳۳

(تم اِس انجام سے خبردار کرتے ہو تو) لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ جس سے ڈرا رہے ہو، وہ کہاں رہ گئی)؟[131] اِن سے کہو کہ اُس کا علم تو صرف

۱۲۶؎ اصل میں لفظ 'اِرجاف' استعمال ہوا ہے، یعنی لوگوں کے اندر اضطراب اور بے چینی پھیلانے کے ارادے سے فتنہ انگیز خبروں کا پروپیگنڈا کرنا۔ اِس گروہ کا کردار پیچھے کئی مقامات پر زیر بحث آچکا ہے۔ سیدہ زینب کے نکاح کے معاملے میں بھی یہی سب سے بڑھ کر فتنہ انگیزی کر رہا تھا۔

۱۲۷؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ اِن کے معاملے میں اب تک عفو و درگذر ہی کی ہدایت کی گئی تھی۔

۱۲۸؎ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اوپر کا حکم کس طرح کے اشرار سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنے کے لیے دیا گیا ہے۔

۱۲۹؎ یعنی جن کی طرف اِس سے پہلے رسولوں کی بعثت ہوئی۔

۱۳۰؎ اِس لیے کہ تم بھی خدا کے رسول ہو اور تمھارے دشمنوں کے ساتھ بھی خدا وہی کرے گا جو رسولوں کے دشمنوں کے ساتھ اِس سے پہلے کرتا رہا ہے۔

۱۳۱؎ یعنی ابھی تک آئی کیوں نہیں؟ اور آنی ہے تو اُس کا وقت کیوں نہیں بتاتے؟ اِس طرح کے سوالات، ظاہر ہے کہ مذاق اڑانے کے لیے پوچھے جاتے تھے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴿٦٣﴾
إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكٰفِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ﴿٦٤﴾ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۖ لَّا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿٦٥﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَآ أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوا رَبَّنَآ إِنَّآ

اللہ کے پاس ہے اور تمھیں کیا پتا، شاید قیامت قریب ہی آلگی ہو۔[132] ۶۳

حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے منکروں پر اللہ نے لعنت کر چھوڑی ہے اور اُن کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ وہ اُس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ اپنے لیے کوئی حامی پائیں گے، نہ مددگار۔[133] جس دن اُن کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے،[134] وہ کہیں گے: اے کاش، ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے اُس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب،

الاحزاب ۳۳

۱۳۲؎ مطلب یہ ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کے بارے میں کہ زمین و آسمان جس سے بوجھل ہو رہے ہیں، یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟ خدا کا آخری پیغمبر آچکا ہے۔ اِس کے بعد اب دنیا کی عدالت کے لیے قیامت ہی کا مرحلہ باقی ہے۔ اُس کا انکار کرنے کے لیے کیا یہ کافی ہے کہ تمھیں وہ اُس کا وقت نہیں بتا سکتا؟

۱۳۳؎ یعنی اپنے جن شرکا و شفعا پر اعتماد کر کے بے خوف بیٹھے ہیں اور اپنی جس جماعت اور جمعیت پر انھیں بڑا ناز ہے، اُن میں سے کوئی بھی وہاں اِن کے کام نہ آئے گا۔

۱۳۴؎ یہ گوشت کو آگ پر بھوننے کی تصویر ہے کہ اُسے کبھی ایک طرف سے بھونا جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف سے۔ فرمایا کہ دوزخ کی آگ میں یہ لوگ بھی اِسی طرح بھونے جائیں گے۔ اِس کے لیے چہروں کا ذکر خاص طور پر اِس وجہ سے کیا ہے کہ انسان کے اندر حق کے مقابل میں رعونت اور استکبار کا سب سے نمایاں اظہار اُس کے چہرے ہی سے ہوتا ہے۔

اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِہِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَالۡعَنۡہُمۡ لَعۡنًا کَبِیۡرًا ﴿۶۸﴾

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اٰذَوۡا مُوۡسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوۡا ؕ وَکَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ وَجِیۡہًا ﴿۶۹﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ

الاحزاب ۳۳

ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں[۱۳۵] کی بات مانی تو اُنھوں نے ہمیں راستے سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے رب، اُن کو دوہرا عذاب دے اور اُن پر بھاری لعنت کر۔[۱۳۶] ۶۷-۶۸

ایمان والو، (اِس سے عبرت حاصل کرو اور اپنے پیغمبر کے معاملے میں) اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی[۱۳۷] تو اللہ نے اُن کی تہمتوں سے اسے بری ثابت کیا اور وہ اللہ کے نزدیک بڑی عزت رکھتا تھا۔[۱۳۸] ایمان والو،

۱۳۵؎ بڑوں سے یہاں اُن کے خاندانی اور مذہبی پیشوا مراد ہیں۔

۱۳۶؎ اِس کا جواب سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۳۸ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نقل ہوا ہے کہ تم اور تمھارے لیڈر، دونوں ہی دوہرے عذاب کے سزاوار ہو۔

۱۳۷؎ یہود کی طرف اشارہ ہے جن کی اذیتوں کا شکوہ خود حضرت موسیٰ کی زبان سے قرآن میں بھی نقل ہوا ہے اور کتاب استثنا میں بھی*۔ اِس کے واقعات قرآن اور بائیبل، دونوں میں جگہ جگہ مذکور ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِنھیں اِسی آیت کے تحت ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ تفصیل کے طالب وہاں دیکھ لے سکتے ہیں۔

۱۳۸؎ یعنی باوقار اور سرخ رو تھا۔ اُس کی یہ وجاہت دنیا نے بھی دیکھی اور آخرت میں بھی اور نمایاں ہو کر سامنے آئے گی۔ اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ

* الصف ۶۱: ۵۔ استثنا ۹: ۷۔

وَ قُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا ﴿ۙ۷۰﴾ یُّصۡلِحۡ لَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ﴿۷۱﴾
اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ

اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو۔[۱۳۹] اللہ اِس کے صلے میں تمھارے اعمال تمھارے لیے سدھارے گا[۱۴۰] اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کی، اُس نے بڑی کامیابی حاصل کرلی ہے۔ ۶۹-۷۱

(اطاعت کا یہ تقاضا اُس ارادہ و اختیار کی بنا پر کیا جاتا ہے جو ہم نے انسان کو عطا فرمایا ہے)۔ ہم نے یہ امانت[۱۴۱] زمین اور آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی

نے جس طرح حضرت موسیٰ کو ہر الزام سے بری کیا، ہر تہمت کے مقابل میں اُن کی سچائی اور راست بازی مزید آشکارا ہوئی اور اُن کے سب دشمن رسوا ہو کر رہ گئے، خدا نے چاہا تو آپ کے ساتھ بھی یہی ہوگا اور آپ کے دشمن بھی اُسی طرح ذلیل و رسوا ہو کر رہ جائیں گے۔

۱۳۹۔ یعنی وہی بات جو اہل ایمان کے شایان شان اور اُن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ اُن کا کلمہ اور شعار یہی ہو کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ پیرے کے آخر میں 'وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ' کے الفاظ سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے کہ 'قَوۡلٌ سَدِیۡدٌ' کا لفظ یہاں سمع و طاعت کے اِسی اقرار کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۱۴۰۔ یعنی ایسا درست کر دے گا کہ جو قدم بھی اٹھاؤ گے، صحیح سمت میں اٹھے گا۔

۱۴۱۔ اِسے امانت سے اِس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ یہ اصلاً ایک خدائی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے کہ اِسے وہ خدا ہی کی دی ہوئی ایک چیز سمجھ کر استعمال کرے۔ چنانچہ اُس کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے بھی اِس کی حفاظت کا عہد لیا گیا اور بعد میں بھی صدیوں تک انبیا علیہم السلام اِسی عہد کی تجدید اور یاددہانی کے لیے بھیجے جاتے رہے۔ انسان اِس عہد کا امین ہے اور اِس کے لیے مسئول بنایا گیا ہے۔

اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ

تو اُنھوں نے اُس کو اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور اُس سے ڈر گئے تھے، مگر انسان نے اُس کو اٹھا لیا۔[۱۴۲] حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی ظالم اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔[۱۴۳] یہ اِس لیے پیش کی گئی تھی کہ اللہ (اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر) منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے،

الاحزاب ۳۳

۱۴۲۔ زمین و آسمان اور پہاڑوں کی یہ معذرت زبانِ قال سے بھی ہو سکتی ہے اور زبانِ حال سے بھی، جس طرح مثال کے طور پر ہم کہتے ہیں کہ پاؤں سے کہتا ہوں، مگر وہ اُس طرف جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے یا ملنے تو چلا جاؤں، مگر طبیعت ابا کرتی ہے یا کھاتا تو ہوں، مگر معدہ اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ اپنے مادی وجود کے اعتبار سے انسان اگرچہ ایک مشت استخواں اور ایک حقیر سی ہستی ہے، لیکن معنوی صلاحیتوں اور باطنی کمالات کے اعتبار سے ایسا مضبوط اور توانا ہے کہ جس بارِ امانت کو اُس نے اٹھا لیا ہے، اُس کا تحمل زمین و آسمان اور بلند و بالا پہاڑ بھی نہیں کر سکتے۔

۱۴۳۔ یہ انسان کی فطرت کا بیان ہے جس کی بنا پر اُس نے یہ بارِ امانت اٹھایا ہے۔ چنانچہ انسان کے سامنے اگر اُس کی کوئی محبوب چیز پیش کی جائے، جیسے علم، حسن، اقتدار، ابدیت، عز و جاہ اور مال و دولت وغیرہ تو اُس کے لیے بسا اوقات وہ ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتا اور اِس طرح اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ علم و تحقیق، کشف و الہام، عشق و عاشقی، جرأت و عزیمت اور حرص و طمع کی تمام داستانیں اِس کی شہادت دیتی ہیں کہ کسی چیز کی محبت انسان کو دیوانہ بنا سکتی ہے۔ انسان کی تمام ترقی، خواہ وہ آخرت کے حوالے سے ہو یا دنیا کے، اِسی دیوانگی کی مرہونِ منت ہے۔ آیت میں 'ظَلُوْمًا جَهُوْلًا' کے الفاظ اِسی لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ امام حمید الدین فراہی کے الفاظ میں، 'فاجترأ

وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٣﴾

اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو اللہ اپنی عنایتوں سے نوازے[144]۔ اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[145]۔ ۷۲-۷۳

علی أمر عظیم، فظلم نفسه و أوردها مهالك*'۔ مطلب یہ ہے کہ ارادہ و اختیار جیسی چیز جو خدا کی صفات میں سے ہے، جب انسان کے سامنے پیش کی گئی تو نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر اُس نے لپک کر اُسے قبول کر لیا، اِس لیے کہ اُس کی فطرت میں یہ چیز ودیعت ہے کہ کسی چیز کی کشش اُسے دیوانہ بنا سکتی ہے اور اُس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جان پر اُس کو ظلم بھی کرنا پڑے تو وہ کر گزرتا ہے۔

۱۴۴؎ آیت میں 'یَتُوْبَ' کا لفظ ہے جس میں 'عَلٰی' کے صلے نے رحمت و عنایت کا مفہوم بھی شامل کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ارادہ و اختیار کی امانت جب دی گئی تو اِسی لیے دی گئی کہ ایک دن پوچھا جائے کہ اُس کو کس طرح استعمال کیا گیا ہے؟ اور پوچھا جائے گا تو اِسی لیے پوچھا جائے گا کہ اُس کو غلط استعمال کرنے والے اِس کی سزا بھگتیں اور صحیح استعمال کرنے والے اپنے پروردگار کی رحمتوں اور عنایتوں سے نوازے جائیں، عام اِس سے کہ وہ مردوں میں سے ہوں یا عورتوں میں سے۔ انسان نے یہ بار امانت اٹھا لیا ہے تو اِس کا لازمی اقتضا یہی ہے۔

۱۴۵؎ یعنی اگرچہ یہ ذمہ داری بہت بھاری ہے، لیکن دینے والا غفور و رحیم ہے۔ وہ صحیح راہ پر چلتے ہوئے کہیں پھسل جائیں گے، پھر سنبھلنے کی کوشش کریں گے تو وہ اُن پر رحم فرمائے گا اور اُن کی توبہ قبول کر لے گا۔

کوالالمپور

۱۲/ اپریل ۲۰۱۴ء

---

* تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم ۲/ ۹۹۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمین

باب پنجم

سبا ـ الحجرات

توحید کا اثبات
اُس کے حوالے سے قریش کو انذار
نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کو غلبۂ حق کی بشارت
اور اُن کا تزکیہ و تطہیر

باب پنجم

سبا ـ الحجرات

۳۴ ـــــ ۴۹

یہ قرآن مجید کا پانچواں باب ہے۔ اِس میں 'سبا' (۳۴) سے 'الحجرات' (۴۹) تک سولہ سورتیں ہیں۔ اِن سورتوں کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے پہلی تیرہ سورتیں ام القریٰ مکہ اور آخری تین ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن مجید کے دوسرے تمام ابواب کی طرح یہ چیز اِس باب میں بھی ملحوظ ہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور مدنی سورتوں پر ختم ہو جاتا ہے۔

اِس کے مخاطب قریش مکہ ہیں، لیکن آخری سورتوں میں جب تزکیہ و تطہیر کا مضمون شروع ہوا ہے تو خطاب مسلمانوں سے ہو گیا ہے۔

اِس کا موضوع توحید کا اثبات، اُس کے حوالے سے قریش کو انذار، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کے لیے غلبۂ حق کی بشارت اور اُن کا تزکیہ و تطہیر ہے۔

قرآن کے آخری باب کی طرح اِس باب کی سورتیں بھی اِس طرح ترتیب دی گئی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مراحل اِس ترتیب سے بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ 'فاطر' (۳۵) تک مرحلۂ انذار عام ہے۔ 'یٰسٓ' (۳۶) ایک منفرد سورہ ہے جس سے مرحلۂ اتمام حجت شروع ہوتا ہے۔ اِس کا خاتمہ

سورۂ ص (۳۸) پر ہوا ہے۔ اِس کے بعد 'الاحقاف' (۴۶) تک مرحلۂ ہجرت و براءت ہے اور آخر میں اقدام کی تیاری، فتح و نصرت کی بشارت اور تزکیہ و تطہیر کے مرحلے کی سورتیں ہیں۔ یہ سورۂ محمد (۴۷) سے شروع ہوتیں اور 'الحجرات' (۴۹) پر ختم ہو جاتی ہیں جو باب کے آخر میں پھر ایک منفرد سورہ ہے۔

مرحلۂ انذار عام

سبا۔ فاطر

۳۴ —— ۳۵

سبا۔ فاطر

۳۴ــــــ۳۵

سبا۔ فاطر

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں میں انذار و بشارت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کی دعوت دی گئی اور اُس کی توحید کا اثبات کیا گیا ہے۔ چنانچہ دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ پہلی سورہ میں، البتہ تاریخی استدلال اور دوسری میں ملائکہ کی الوہیت کے ابطال کا پہلو نمایاں ہے۔ اِنھیں 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ' سے شروع کر کے اِن کے اِس تعلق کی طرف قرآن نے خود اشارہ کر دیا ہے۔

دونوں سورتوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

سورة سبا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ لَہُ الۡحَمۡدُ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱﴾ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ

— ۱ —

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

شکر کا سزاوار وہی اللہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اُسی کا ہے[1]۔ اور آخرت میں بھی اُسی کی حمد ہوگی[2] اور وہی حکیم و خبیر ہے[3]۔ جو

[1] یہ ایک بدیہی حقیقت کا بیان ہے جس سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے کہ وہی اللہ جو زمین و آسمان کی سب چیزوں کا خالق و مالک ہے، وہی اُن تمام مخلوقات کے شکر کا حقیقی سزاوار بھی ہے جو اُس کی پیدا کی ہوئی اِن سب چیزوں سے متمتع ہو رہی ہیں۔

[2] یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کی مخلوقات کا یہی تعلق آخرت میں بھی آشکارا ہوگا۔ اِس فقرے سے جو حقائق معلوم ہوتے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُن کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک یہ کہ اِس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے، اُس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اُس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ اگر آخرت نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بالکل بے معنی و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے۔ اِس نکتے کی وضاحت متعدد مقامات میں ہو چکی ہے، اِس وجہ سے یہاں اشارے پر اکتفا کیجیے۔
>
> دوسری یہ کہ یہ اہل ایمان کے اِس ترانۂ حمد کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں تمام حقائق کے ظہور اور اللہ تعالیٰ کے جملہ وعدوں کے ایفا کے بعد اُن کی زبانوں سے بلند ہوگا۔ اِس کی

وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا ؕ

کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے[۴] اور جو کچھ آسمان سے اترتا

طرف سورۂ یونس میں اشارہ ہے: 'وَاٰخِرُ دَعۡوٰهُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ *' (اور اُن لوگوں کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ، عالم کا خداوند ہے)۔

تیسری یہ کہ یہ شرکا و شفعا کی کلی نفی ہے کہ یہ تمام مزعومہ دیوی دیوتا جن کی شفاعت کی امید پر مشرکین نچنت بیٹھے ہیں، آخرت میں سب ہوا ہو جائیں گے۔ اِن میں سے کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اُس دن مشرکین اپنے معبودوں پر لعنت کریں گے اور معبود اپنے پجاریوں سے اعلان براءت کریں گے۔ سب کی پیشی اللہ واحد کے حضور میں ہوگی، اُسی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور سب پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ سزاوار حمد صرف اللہ رب العٰلمین ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۲۹۰)

۳۔ یہ اوپر کے تمام دعاوی کی دلیل ہے کہ وہ حکیم ہے، اِس وجہ سے لازم ہے کہ ایک ایسا دن لائے جس میں اُس کے بے لاگ عدل کا ظہور ہو اور اُس کے شکر گزار بندے اپنی شکر گزاری کا صلہ پائیں۔ اور اِس کے ساتھ خبیر بھی ہے، لہٰذا کوئی بات اُس سے چھپی نہ رہے گی اور نہ وہ فیصلے کے لیے کسی دوسرے کے علم و خبر کا محتاج ہوگا۔ آگے اِسی محیط کل علم کی وضاحت ہے۔ یہ اور اِس سے پہلے کی تمام باتیں حصر کے اسلوب میں فرمائی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ جب وہی خالق و مالک اور حکیم و خبیر ہے تو اُس کے سوا کوئی دوسرا اُس کی مخلوقات کے حمد و شکر کا سزاوار کس طرح ہو سکتا ہے؟

۴۔ اِس کی ایک مثال وہ دانہ ہے جو زمین میں ڈالا جاتا اور اُس سے لہلہاتے ہوئے پودے کی صورت میں برآمد ہو جاتا ہے۔

* یونس ۱۰: ۱۰۔

وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ﴿۲﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ

اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے۔[5] وہ اُس کو جانتا ہے[6] اور وہی غفور و رحیم ہے[7]۔ ۱-۲
(تمھارے) منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی۔ کہہ دو، کیوں نہیں،

۵۔ اِس کی نہایت واضح مثال لوگوں کے لیے خیر و شر کے فیصلے ہیں جو فرشتے لے کر آتے اور حاضری کے دن جن کے نفاذ کی تمام روداد اوپر لے جا کر خدا کے حضور میں پیش کر دیتے ہیں۔

۶۔ لہٰذا اُس کو ہرگز ضرورت نہیں ہے کہ اُس کے کوئی شرکا ہوں جو اِس عظیم کائنات کا نظم چلانے کے لیے اُس کی مدد کریں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...علم الٰہی کے اِس احاطے کی وضاحت اِس مقصد سے کی گئی ہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل مشرکین کا یہ مغالطہ ہے کہ بھلا اتنی ناپیدا کنار کائنات کے ہر کونے اور گوشے، ہر ایک کے قول و عمل اور ہر ایک کے دکھ اور درد سے خدا ہر لحہ کس طرح واقف رہ سکتا ہے! اِس وجہ سے اپنے تصور کے مطابق اِس کائنات کے مختلف حصوں کو اُنھوں نے الگ الگ دیوتاؤں میں تقسیم کیا۔ اُس کا تقرب حاصل کرنے اور اُس کو اپنی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لیے وسائل و وسائط ایجاد کیے۔ جنوں کو آسمان کی خبریں لانے والا مان کر اُن کی پرستش کی، فرشتوں کو شفاعت کرنے والا سمجھ کر اُن کو دیویوں کا درجہ دیا۔ اِس آیت نے اِن تمام توہمات پر ضرب لگائی کہ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے، اِس وجہ سے کوئی اُس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ وہ اپنی پوری کائنات کے سارے نظام پر خود حاوی اور تنہا کافی ہے۔" (تدبر قرآن ۶/۲۹۱)

۷۔ لہٰذا کوئی غلطی اور کوتاہی ہو جائے تو اُس کے لیے بھی کسی دوسرے کی سعی و سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر گناہ گار کو براہ راست اُسی کے دروازے پر آنا چاہیے۔

لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ ﴿٣﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٤﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿٥﴾

میرے اُس پروردگار کی قسم جو ہر غیب کا جاننے والا ہے، وہ تم پر ضرور آئے گی[۸]۔ اُس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے، نہ زمین میں، نہ ذرے سے چھوٹی نہ بڑی، بلکہ ایک کھلی کتاب میں لکھ دی گئی ہے[۹]۔ اِس لیے کہ وہ اُن لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے ہیں۔ وہی ہیں جن کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے[۱۰]۔ اور جو ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی کوشش میں سرگرم ہیں، وہی ہیں جن کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے[۱۱]۔ ۳-۵

۸۔ جس طنطنے کے ساتھ منکرین انکار کر رہے تھے، یہ اُسی زور کے ساتھ اُس کا جواب ہے۔

۹۔ یہ اُن کے اِس مغالطے کو رفع کیا ہے کہ اتنی وسیع دنیا اور اتنے بے شمار انسانوں کے ہر قول و فعل کا حساب آخر کس طرح ممکن ہوگا؟

۱۰۔ یعنی اگر کوئی گناہ یا غلطی ہوئی ہے تو اُس کی معافی اور خدا کے بے نہایت افضال و عنایات۔ 'رِزْقٌ کَرِیْمٌ' اِنھی افضال و عنایات کے لیے قرآن کی ایک جامع تعبیر ہے۔

۱۱۔ اوپر امکان قیامت کا ذکر تھا۔ یہ اب اُس کی ضرورت بیان فرما دی ہے کہ اگر وہ نہ برپا ہو تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کے نزدیک نیک و بد، دونوں یکساں ہیں، دراں حالیکہ یہ بالکل خلاف عقل اور حق و انصاف سے بعید بات ہے۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيٓ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦﴾

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿٧﴾ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ﴿٨﴾

سبا
۳۴

اِس کے برخلاف جن کو علم عطا ہوا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جو تمھارے پروردگار کے ہاں سے تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے، وہی حق ہے اور وہ خدائے عزیز وحمید کا راستہ دکھاتا ہے[۱۲]۔ ۶

اُس کے منکرین، البتہ (تمھارا مذاق اڑاتے اور) کہتے ہیں کہ (لوگو)، کیا ہم تمھیں ایک ایسا آدمی بتائیں جو تمھیں خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو ازسرِنو پیدا کیے جاؤ گے؟ یہ خدا پر جھوٹ باندھ لایا ہے یا اِس کو کسی طرح کا جنون ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، وہی عذاب میں اور دور کی گم راہی میں مبتلا ہیں[۱۳]۔ ۷-۸

۱۲؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ احمقوں اور لاخیروں کی پروا نہ کرو۔ تمھارے اطمینان کے لیے یہی چیز کافی ہے کہ جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی ہے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا تمھاری قوم کے سلیم الفطرت لوگوں میں سے، وہ تمھاری تائید کر رہے ہیں۔ آیت میں 'عَزِیْز' اور 'حَمِیْد' کی صفات یہ بتانے کے لیے لائی گئی ہیں کہ توحید اور قیامت جن کا اثبات یہاں پیش نظر ہے، دونوں اِن صفات الٰہی کا بھی لازمی تقاضا ہیں۔ اِس سے ضمناً یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حقیقی علم قرآن کی اصطلاح میں صرف خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے۔

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۹﴾

تو کیا اِنھوں نے اپنے آگے اور پیچھے جو آسمان اور زمین ہیں، اُن کی طرف نہیں دیکھا؟ اگر ہم چاہیں تو اِن کو اِسی زمین میں دھنسا دیں یا اِن پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں۔[۱۴] حقیقت یہ ہے کہ ہر اُس بندے کے لیے اِس میں بہت بڑی نشانی ہے جو متوجہ ہونے والا ہو۔[۱۵] ۹

سبا ۳۴

۱۳؎ یعنی ایسی دور کی گم راہی میں مبتلا ہیں کہ اب واپسی کا بھی امکان نہیں رہا۔ اِس لیے گویا آج ہی اُس عذاب میں جا پڑے ہیں جس سے قیامت میں دوچار ہونے والے ہیں۔ یہ قرآن نے اِن متمردین کے استہزا کا جواب دیا ہے اور استاذ امام کے الفاظ میں، دیکھیے کہ کتنا باوقار اور موثر جواب دیا ہے۔

۱۴؎ یعنی خدا سے بے خوف نہ ہوں، یہی زمین و آسمان جن کے فوائد و برکات سے وہ صبح و شام متمتع ہو رہے ہیں، اُن کے لیے ہول ناک آفتوں کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں۔ یہ اُسی مضمون کا ایک نئے اسلوب میں اعادہ ہے جس سے سورہ کی ابتدا ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب خدا ہی کا ہے، اِس وجہ سے دنیا میں بھی شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی اُسی کی حمد ہو گی۔ یہاں فرمایا کہ کیا اِن مستکبرین نے اِس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ یہ آسمان جو اِن کے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے اور یہ زمین جو اِن کے قدموں کے نیچے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور جن کے فوائد و برکات سے یہ متمتع ہو رہے ہیں، یہ اِن کے تھامے ہوئے نہیں تھمے ہیں، بلکہ اِن کو اللہ ہی نے تھام رکھا ہے؟ اگر اللہ نے اِن کو نہ تھام رکھا ہوتا تو یہ دونوں اِن کے لیے نعمتوں کے بجائے نقمتوں کا ذریعہ بن جاتے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۲۹۵)

۱۵؎ یعنی اپنے اندر حقیقت کی سچی طلب اور عبرت پذیری کی صلاحیت رکھتا ہو۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ

(خدا کے بندو، یہی نشانیاں اُن سرگذشتوں میں بھی ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں)۔ ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے خاص فضل عطا فرمایا تھا۔[16] ہم نے حکم دیا تھا کہ پہاڑو، تم بھی اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاؤ اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا تھا۔[17] ہم نے لوہے کو اُس کے لیے نرم کر دیا تھا[18] کہ پوری اور کشادہ ڈھیلی ڈھیلی

سبا ۳۴

۱۶؎ داؤد علیہ السلام بیت اللحم کے رہنے والے قبیلۂ یہوداہ کے ایک معمولی نوجوان تھے۔ طالوت کی پہلی جنگ میں، جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۲) میں ہو چکا ہے، اُنھوں نے جالوت جیسے گرانڈیل دشمن کو قتل کر دیا۔ یہ چیز کافی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کا تارا بن جاتے۔ چنانچہ یہی ہوا اور طالوت کی وفات کے بعد وہ پہلے حبرون میں یہودیہ کے فرماں روا بنائے گئے، پھر چند سال بعد بنی اسرائیل کے تمام قبائل نے مل کر اُن کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ یروشلم اُنھی کے زمانے میں فتح ہوا اور اُسے دولت اسرائیل کا پایۂ تخت بنایا گیا۔ اُن کی سلطنت کے حدود خلیج عقبہ سے دریاے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلے ہوئے تھے جن پر وہ ۹۶۵ ق م تک حکومت کرتے رہے۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کی مزید عنایت یہ ہوئی کہ اُنھیں پیغمبر بنا دیا گیا اور اُن پر زبور نازل ہوئی جو تورات کے بعد دوسری باقاعدہ کتاب ہے۔

۱۷؎ یہ اُس سوز و گداز کی طرف اشارہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو عطا فرمایا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یوں تو اِس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤد کو خاص نوع کا دل گداختہ اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا، اُسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤد اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی اُن کے ساتھ اُس میں شریک ہوں۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۳۰۰)

۱۸؎ یعنی اُس کو لوہا پگھلانے کا فن سکھا دیا تھا۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَلَنَّا لَهٗ' کے الفاظ آئے

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿١١﴾
وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ

زرہیں بناؤ اور اُن کی بناوٹ میں بھی پورے تناسب کو ملحوظ رکھو[19] اور تم سب اچھا عمل کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُسے میں دیکھ رہا ہوں[20]۔ ۱۰-۱۱

اِسی طرح سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا[21]۔ (اُس کے جہازوں کو لے کر) ہوا کا جانا بھی مہینے بھر کا ہوتا تھا اور آنا بھی مہینے بھر کا ہوتا تھا[22]۔ اور ہم نے اُس

ہیں۔ اِن میں ضمیر کا مرجع داؤد علیہ السلام ہیں۔ لیکن اِس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اُسی طرح کی نسبت ہے، جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تاج محل شاہ جہاں نے بنایا تھا۔

۱۹؎ اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اُن کے دور میں سائنسی علوم میں ایسی ترقی ہوئی کہ لوہے کی زرہیں ایسی ڈھیلی ڈھالی بننے لگیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی کپڑے سے بنائی گئی ہیں جن کا پہننا نہایت آسان تھا، لیکن حفاظت اُسی طرح کرتی تھیں، جس طرح لوہے کی کوئی مضبوط چیز کر سکتی ہے۔ اُن کے دور کی یہی صنعت تھی جس نے اُن کی فوج کو ناقابل تسخیر بنا دیا اور اِس کے نتیجے میں وہ دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت بن گئے۔

۲۰؎ یعنی اِس نعمت کو پا کر اِس سے جو اخلاقی تقاضے پیدا ہوتے ہیں، وہ بھی اُنھیں بتائے گئے کہ اِسے خدا کی امانت سمجھ کر استعمال کریں اور یاد رکھیں کہ جس خدا نے یہ نعمت بخشی ہے، وہ ہر وقت دیکھ رہا ہے کہ وہ اِسے کہاں استعمال کرتے ہیں۔

۲۱؎ یعنی خدمت میں لگا دیا تھا۔ آیت میں 'سُلَیْمٰن' کا 'ل' اِس بات کا قرینہ ہے کہ فعل 'سَخَّرْنَا' یہاں محذوف ہے۔ سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد کے بیٹے تھے جو اُن کے بعد نبوت اور بادشاہی، دونوں میں اُن کے جانشین ہوئے۔ اُن کا زمانۂ سلطنت ۹۶۵ ق م سے ۹۲۶ ق م تک ہے۔ اُن کے لیے ہوا کو مسخر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے بحری بیڑے اِس قدر ترقی یافتہ تھے کہ سمندر میں مہینوں تک سفر کر سکتے تھے۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔

وَ اَسَلۡنَا لَهٗ عَيۡنَ الۡقِطۡرِؕ وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ يَّعۡمَلُ بَيۡنَ يَدَيۡهِ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنۡ يَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِيۡرِ ﴿۱۲﴾ يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ

کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا[۲۳] اور ایسے جنات بھی مسخر کر دیے تھے جو اُس کے پروردگار کے حکم سے اُس کے آگے کام کرتے تھے[۲۴] اور فرما دیا تھا کہ اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا، اُسے ہم آگ کا عذاب چکھائیں گے۔[۲۵] وہ[۲۶] اُس کے لیے جو وہ چاہتا تھا، بناتے تھے: محرابیں[۲۷]، مجسمے[۲۸]، بڑے بڑے حوض جیسے لگن

سبا ۳۴

۲۲؎ یہ عامل کا ذکر کر کے معمول کی طرف اشارہ کرنے کا اسلوب ہے اور اِس سے مقصود وہی جہازوں کا آنا جانا ہے جو ہم نے ترجمے میں واضح کر دیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل تصرف ہواؤں ہی میں ظاہر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبے لمبے سفر اِسی صورت میں ممکن تھے، جب یہ جہازات نہایت بڑے بڑے بھی ہوں اور اُن کے ساتھ ہوا کے کنٹرول کرنے کا نظام اتنا اعلیٰ اور مستحکم ہو کہ وہ ہر قسم کے سمندروں کے اندر ہر نوع کی ہواؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔'' (تدبر قرآن ۶/۳۰۱)

۲۳؎ یعنی تانبا نکال کر اتنی بڑی مقدار میں پگھلایا جاتا تھا کہ اُن کی سلطنت میں گویا تانبے کا چشمہ بہ رہا تھا۔

۲۴؎ یعنی اُن کو ہم نے ایک ایسا علم بھی عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے سے وہ شریر جنوں کو قابو کر کے اُن سے مختلف قسم کے کام لیتے تھے۔

۲۵؎ مطلب یہ ہے کہ جنوں پر تصرف کا یہ معجزہ براہ راست ہمارے حکم سے صادر ہوتا تھا اور اگر وہ حکم عدولی کرتے تو اُن کو سزا بھی ہم ہی دیتے تھے۔

۲۶؎ یہاں سے آگے اُن کاموں کی تفصیل ہے جو حضرت سلیمان جنوں سے لیتے تھے۔

۲۷؎ زمانۂ قدیم میں جو عمارتیں بنائی جاتی تھیں، اُن کا سب سے نمایاں حصہ اُن کی محرابیں

كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِيْلٌ

اور پہاڑ جیسی چولھوں پر جمی ہوئی دیگیں۔[29] ـــــــ داؤد کے گھر والو، (اپنے پروردگار

ہی ہوتی تھیں اور تعمیری آرٹ کا سب سے زیادہ مظاہرہ بھی اُنھی پر کیا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ ذکر اِسی بنا پر کیا ہے۔ اِس سے عظیم الشان عمارتوں کی طرف ذہن آپ سے آپ منتقل ہو جاتا ہے، اُن کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۲۸؎ یہ، ظاہر ہے کہ اُسی قسم کے مجسمے اور تصویریں ہوں گی جن میں مذہبی تقدس کا کوئی شائبہ نہ ہو، بلکہ مجرد آرٹ کے پہلو سے بنائی گئی ہوں۔ اِس لیے کہ حضرت سلیمان کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے تھے جسے اُن کی شریعت میں واضح طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ استثنا میں ہے:

''لعنت اُس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خدا کے نزدیک مکروہ ہے، اُس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔'' (۱۵:۲۷)

اِسی طرح خروج میں فرمایا ہے:

''خداوند تیرا خدا جو تجھے ملک مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے، تو اُن کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔'' (۲۰:۲-۵)

۲۹؎ یہ اُن کے جود و کرم کو نمایاں کیا ہے کہ اُن کی سلطنت میں جس طرح سائنس اور آرٹ اور تعمیرات کا فن اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا، اُسی طرح غربا و مساکین کی خدمت بھی ریاست کے فرائض میں شامل تھی اور اُس کا اہتمام بھی نہایت فیاضی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص بڑا فیاض ہے، اُس کے خوان کرم سے ایک خلق عظیم کی پرورش ہو رہی ہے، تو فصیح عربی میں اُس کی تعبیر کے لیے یہ دو حرف کافی ہوں گے کہ 'لَهٗ قُدُوْرٌ رّٰسِيٰتٌ'۔ عرب شعرا نے حاتم اور اپنے دوسرے فیاضوں کے لیے یہی استعارہ استعمال کیا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳۰۵/۶)

مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿١٤﴾

کا) شکر ادا کرتے رہو[۳۰]۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہوتے ہیں[۳۱]۔ ۱۲-۱۳

(یہی جنات ہیں جنھیں تم عالم الغیب سمجھ کر خدا کے شریک ٹھیراتے ہو۔ یہ سلیمان کی غلامی کرتے رہے)۔ پھر جب ہم نے اُس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو اُن کو زمین کے کیڑے[۳۲] ہی نے اُس کی موت کا پتا دیا جو اُس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ چنانچہ سلیمان جب گر پڑا، تب جنوں کی حقیقت خود اُن پر بھی کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اِس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے[۳۳]۔ ۱۴

۳۰؎ یعنی اِن نعمتوں کے ساتھ ہم نے یہ ہدایت بھی اُس کو اور اُس کے خاندان والوں کو کی تھی کہ اِنھیں پا کر بہک نہ جانا، بلکہ اپنے پروردگار کی شکر گزاری کے ساتھ اُس راستے پر گام زن رہنا جس کی طرف اُس نے تمھاری رہنمائی فرمائی ہے۔

۳۱؎ یہ تنبیہ بھی ہے اور اپنے ایک شکر گزار بندے پر اظہار اعتماد بھی۔ مطلب یہ ہے کہ شکر کا امتحان ایک مشکل امتحان ہے۔ اِس میں کم ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ تاہم توقع ہے کہ تم اُنھی میں شامل ہو گے۔

۳۲؎ اِس کیڑے کا ذکر یہاں جن قرائن کے ساتھ ہوا ہے، اُس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد دیمک ہے۔

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِيۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ ۬ۙ

(قریش کے لوگو، سبا[34] نے بھی وہی کیا تھا جو تم کر رہے ہو، دراں حالیکہ) اہل سبا کے لیے اُن کے مسکن ہی میں بہت بڑی نشانی تھی[35]۔ دائیں بائیں، باغوں کی دو

۳۳ یعنی خود جنوں پر بھی واضح ہو گیا کہ اُن کے علم کی حقیقت کیا ہے جو وہ استراق سمع سے کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ حقیقت جس واقعے سے کھلی، اُس کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اپنے کسی تعمیری کام کی نگرانی کرتے ہوئے، جس میں جن بھی لگے ہوئے تھے، حضرت سلیمان کی موت کا وقت آ گیا اور فرشتۂ اجل نے اُن کی روح قبض کر لی۔ اُن کے اعیان و اکابر اور اہل خاندان نے جب دیکھا کہ موت کے باوجود اُن کا جسم عصا کے سہارے بدستور قائم ہے تو اُنھوں نے اِس خیال سے کہ جنات جس کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے، اُنھیں اُسی حالت میں رہنے دیا۔ یہ تدبیر ایک عرصے تک کامیاب رہی۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ اِس اثنا میں دیمک نے عصا کو نیچے سے کھا لیا جس کے بعد سلیمان علیہ السلام کا جسد مبارک زمین پر گر پڑا۔

۳۴ سبا قدیم زمانے کی ایک دولت مند قوم تھی۔ اُسی کے نام پر یمن کے جنوب مغربی علاقے کو بھی اُس زمانے میں سبا کہا جاتا تھا۔ اُس کا دارالحکومت مارب تھا جس کے کھنڈر آج بھی اِس علاقے میں موجود ہیں۔ قوم سبا کے عروج کا زمانہ ۱۱۰۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک رہا۔ اِس کے بعد وہ روبہ زوال ہوئی، یہاں تک کہ ایک خدائی آفت نے آکر اُس کے مسکن کو ویرانہ بنا دیا۔ آگے اِسی واقعے کا ذکر ہے۔

۳۵ یعنی اِس بات کی نشانی کہ جو کچھ اُن کو میسر ہے، وہ اُن کا اپنا آفریدہ نہیں ہے، بلکہ اُن کے پروردگار کا عطیہ ہے۔ لہٰذا وہی اُن کے شکر و سپاس اور بندگی و عبادت کا مستحق ہے اور اُسی کو ہونا چاہیے۔

كُلُوا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿١٥﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ

قطاریں[٣٦]۔ (یہ سب زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ) اپنے پروردگار کی بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اُس کے شکر گزار رہو۔ زمین زرخیز وشاداب اور پروردگار[٣٧] بخشش فرمانے والا۔ پھر بھی اُنھوں نے سرتابی کی تو بالآخر ہم نے اُن پر بند کا سیلاب[٣٨] بھیج دیا اور اُن کے

٣٦۔ آیت میں مثنیٰ دو باغوں کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ باغوں کی دو قطاروں کے مفہوم میں ہے۔ یہ اُن کے علاقے کی تصویر ہے کہ اُس میں داخل ہوں تو اُس کی بڑی شاہ راہ کے دونوں جانب باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔

٣٧۔ یعنی وہ پروردگار جو لوگوں کی ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود اُن کے لیے اپنا خوان کرم بچھاتا اور اُس پر اِسی طرح نعمتوں کے انبار لگا دیتا ہے۔

٣٨۔ یعنی وہ سیلاب جو بند ٹوٹنے سے آیا۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'عَرِم' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'عرمة' کی جمع ہے جس کے معنی تہ بہ تہ اکٹھے کیے ہوئے پتھروں کے ہیں۔ یہیں سے یہ اُس بند یا پشتے کے لیے استعمال ہونے لگا جو کسی وادی میں پانی روکنے کے لیے بنایا جائے۔ جنوبی عرب کی زبان میں یہی لفظ 'عرمن' بولا جاتا تھا۔ سبا کے دارالحکومت مارب کے نام پر اِس بند کو سد مارب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ آب پاشی کے لیے پانی کا ایک بڑا ذخیرہ اور اُس زمانے کے انجینئروں کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا جو ۵۴۲ء اور ۵۷۰ء کے درمیان کسی وقت ٹوٹ گیا* جس کے نتیجے میں وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر تھا بالکل تباہ ہو کر کڑوے کسیلے پھلوں کے خودرو درختوں اور جھاؤ اور بیری کی جھاڑیوں کا جنگل بن گیا۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ سیلاب نے کسی ایسی مٹی یا ریت کی تہ پورے علاقے پر جما دی جس سے بچے کھچے درختوں کا مزاج بھی

* المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۲/ ۲۸۳۔

ذَوَاتَیْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ ﴿١٦﴾ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَ هَلْ نُجٰزِیْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿١٧﴾

وَ جَعَلْنَا بَیْنَهُمْ وَ بَیْنَ الْقُرَى الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا قُرًى ظَاهِرَةً

باغوں کو اُن کے لیے دو ایسے باغوں میں بدل دیا جن میں بدمزہ پھل اور جھاؤ کے درخت اور بیری کی کچھ تھوڑی سی جھاڑیاں تھیں۔ یہ ہم نے اُن کی ناشکری کا بدلہ اُنھیں دیا اور ایسا بدلہ ہم ناشکروں ہی کو دیا کرتے ہیں[۳۹]۔ ۱۵-۱۷

ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جہاں ہم نے برکتیں رکھی

سبا
۳۴

بدل گیا۔ قرآن نے یہ اِسی بند کے ٹوٹنے کا ذکر کیا ہے۔ سبا کے لوگ اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں روبہ زوال تو اِس سے صدیوں پہلے ہو چکے تھے۔ یہ گویا نزع کے عالم میں سسکتی ہوئی قوم کے لیے پیامِ اجل تھا جس نے قومی حیثیت سے اُن کا خاتمہ کر دیا۔

۳۹؎ یہ اُس قانون کے مطابق ہوا جو اللہ تعالیٰ نے قوموں کے عزل و نصب کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ جو قومیں علم و اخلاق کے لحاظ سے پستی میں گر جاتیں اور خدا کی نعمتیں پا کر اُن پر شکرگزار ہونے کے بجاے سرکشی اختیار کر لیتی ہیں، اُنھیں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہلاکت بالعموم تدریجاً ہوتی ہے۔ تاہم بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ارضی یا سماوی آفت آ کر تباہی کو آخری انجام تک پہنچا دیتی ہے۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم سبا کے ساتھ یہی معاملہ ہوا اور اِس سیلاب کے نتیجے میں وہ ایسے تتربتر ہوئے کہ سبا نام کی کوئی قوم دنیا میں باقی نہیں رہی اور اُس کی پراگندگی ضرب المثل ہو گئی۔ اہل عرب آج بھی اگر کسی گروہ کے اِس طرح منتشر ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ 'تفرقوا أیدی سبا' (وہ ایسے پراگندہ ہوئے، جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی)۔ یہ، ظاہر ہے کہ عذاب کی وہ صورت نہیں ہے جو رسولوں کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد اُن کی قوموں پر آتا ہے۔

وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾ فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ

تھیں[40]، ایسی بستیاں آباد کیں جو سامنے راستے پر تھیں[41] اور اُن کے اندر (اُن کے لیے) سفر کی منزلیں ٹھیرا دیں[42] کہ اُن میں دن رات بے خوف وخطر سفر کرو[43]۔ مگر اُنھوں نے (جور و یہ اختیار کیا تو گویا زبان حال سے) کہہ دیا کہ پروردگار، ہماری منزلوں کو دور دور کر دے[44]۔ اور اِس طرح اپنی جانوں پر ظلم کیا تو ہم نے بالآخر اُنھیں افسانہ بنا

سبا ۳۴

۴۰؎ یہ اشارہ شام و فلسطین کی طرف ہے جن کے ساتھ اہل سبا کے تجارتی تعلقات تھے۔ اِن کے لیے 'بٰرَکْنَا فِیْهَا' کی صفت آیت میں اِس لیے آئی ہے کہ یہ علاقہ نہایت زرخیر تھا۔

۴۱؎ یعنی گوشوں میں چھپی ہوئی نہیں تھی، بلکہ اُسی شاہ راہ پر تھیں، جہاں سے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔

۴۲؎ یعنی ایسے مناسب فاصلوں پر واقع تھیں گویا سفر کرنے والوں کے لیے قدرت نے ٹھیرنے اور پڑاؤ کرنے کی منزلیں بنا دی ہوں۔

۴۳؎ مطلب یہ ہے کہ اِس علاقے میں سفر ایک قسم کی خوش گوار سیر بن گیا تھا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا قدرت نے یہ اہتمام کر کے ہر منزل پر یہ کتبہ لگا دیا کہ تمھاری خاطر یہ اہتمام ہم نے اِس لیے کیا ہے کہ تم راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی بے خوف وخطر سفر کر سکو۔ اِس کے بعد اتنی بات حذف ہے کہ 'اور اپنے رب کا شکر ادا کرو'۔ اِس کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر نعمت کا فطری تقاضا ہے، اِس کو لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس سے یہ بات واضح ہوئی کہ انسان جو کچھ اپنے علم و عقل سے کرتا ہے، وہ بھی درحقیقت خدا ہی کی عنایت ہوتی ہے، لیکن اپنی بے بصیرتی کے باعث وہ اُس کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔

۴۴؎ یعنی اِس سیر گاہ کو ویرانے میں بدل دے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ اُن کے زبان قال کی نہیں، بلکہ زبان حال کی تعبیر ہے کہ اُنھوں نے یہ رفاہیتیں پا کر

وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

دیا[45] اور اُن کو بالکل تتر بتر کر ڈالا[46]۔ یقیناً اِس میں ہر اُس شخص کے لیے نشانیاں ہیں جو صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہو[47]۔ ۱۸-۱۹

رویہ جو اختیار کیا، اُس سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ اِن آسایشوں کے حق دار نہیں ہیں، بلکہ اِس بات کے سزاوار ہیں کہ اُن کی بستیاں ویران ہو جائیں، اُن کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور اُن کی یہ ساری رفاہیتیں اُن سے چھین لی جائیں۔ زبان حال کی تعبیرات کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کی نظیریں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ اصل شہادت زبان حال ہی کی ہوتی ہے، نہ کہ زبان قول کی۔ یہود کا قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' بھی اُن کے حال ہی کی تعبیر ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۳۱۰)

۴۵؎ یعنی حال کے صفحے سے مٹا کر ماضی کا ایک قصۂ پارینہ بنا دیے گئے۔

۴۶؎ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ غسانیوں نے اردن اور شام کا رخ کیا، اوس و خزرج نے یثرب کو اپنا مسکن بنایا، خزاعہ جدے کے قریب تہامہ کے علاقے میں جا بسے، ازد کے لوگ عمان میں جا کر آباد ہو گئے، لخم اور جذام اور کندہ بھی جہاں سینگ سمایا، نکل گئے۔ حتیٰ کہ سبا اور قوم سبا کا نام ہی باقی رہ گیا۔

۴۷؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ ہر نعمت درحقیقت خدا کا فضل اور اُس کی عنایت ہے۔ اِس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کا شکر ادا کیا جائے، اِس لیے کہ یہ سب کچھ اُس نے امتحان کے لیے دیا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ اُس کے بندے اِن نعمتوں کو پا کر شکر گزار ہوتے ہیں یا ناشکری اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اِس امتحان کا نتیجہ بھی ایک دن لازماً نکلنا ہے، قوموں کے لیے اِسی دنیا میں اور افراد کے لیے قیامت میں، جب ہر شخص کو جزا و سزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس سرگذشت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہل سبا کی سرگذشت یہاں دو مرتبہ دہرائی گئی ہے اور دونوں

البیان

سبا ۳۴

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٢١﴾

اِس میں کیا شبہ ہے کہ اُن پر ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔[۴۸] سو وہ اُسی کے راستے پر چلے، ایمان والوں کے ایک گروہ قلیل کے سوا۔[۴۹] حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کو اُن پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ ہم نے یہ مہلت اُس کو دی تو صرف اِس لیے کہ ہم اُن لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اُن لوگوں سے الگ معلوم کرلیں جو اُس کی طرف سے[۵۰] شک میں

سبا ۳۴

مرتبہ اُن کے عبرت انگیز انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے اُن کے علاقے کی زرخیزی و شادابی کے ذکر کے بعد اُن کی ناشکری اور اُس کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا، پھر اُن کی تمدنی و تجارتی ترقیوں کے ذکر کے بعد اُن کے کفران نعمت کے نتیجے میں اُن کے انتشار کی طرف۔ یہ اسلوب بیان اِس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل مقصود جس کے لیے یہ سرگذشت سنائی جا رہی ہے، نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قرآن میں اِس اسلوب بیان کی متعدد نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۳۱۰)

۴۸؎ یہ ابلیس کے اُس گمان کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار اُس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دینے کے بعد کیا تھا۔ قرآن نے اِسے سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۷ میں نقل فرمایا ہے۔

۴۹؎ یہ گروہ قلیل ترین ہو سکتا ہے، لیکن دنیا کی کوئی قوم اِس سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اِس کا مشاہدہ رفتہ و حاضر کی ہر قوم کے حالات میں کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے لیے کسی تاریخی حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ قوموں پر زوال آجائے تو اِس کے نتائج اِس گروہ کو بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ قرآن نے اِسی کے متعلق فرمایا ہے کہ اُس فتنے سے بچو جس میں صرف ظالم ہی مبتلا نہیں کیے جائیں گے۔*

۵۰؎ یعنی آخرت کی طرف سے۔

* الانفال ۸: ۲۵۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

پڑے ہوئے ہیں۔ اور تیرا پروردگار، (اے پیغمبر)، ہر چیز پر نگران ہے[۵۱]۔ ۲۰-۲۱

اِن سے کہو کہ ذرا بلاؤ اُنھیں جن کو تم نے خدا کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے[۵۲]۔ وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر اختیار رکھتے ہیں نہ زمین میں، اور نہ اِن دونوں کے بنانے میں اُن کا کوئی ساجھا ہے اور نہ (اِس کائنات کا نظم چلانے کے لیے) اُن میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔ اُس کے حضور کوئی شفاعت کام نہیں آتی، الّا یہ کہ وہ خود کسی کے لیے اُس کی اجازت دے۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن جب اُن کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو تمھارے یہی معبود ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ تمھارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیں گے کہ حق ارشاد ہوا اور وہ عالی مقام ہے، بڑی عظمت والا ہے[۵۳]۔ ۲۲-۲۳

۵۱؎ یعنی ابلیس کو مہلت دے کر خدا نے دنیا اُس کے حوالے نہیں کر دی ہے، بلکہ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ نہ ابلیس کو اجازت دیتا ہے کہ اپنے حدود سے تجاوز کرے اور نہ انسان کو اپنی مدد سے محروم رکھتا ہے، اگر وہ صحیح رویہ اختیار کرے۔

۵۲؎ یعنی بلاؤ کہ ہم بھی اُن کی صورت دیکھیں، وہ کیسے اور کہاں ہیں؟

۵۳؎ سورہ کے مخاطب چونکہ قریش ہیں اور وہ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر اُن کی پرستش کرتے تھے، اِس لیے یہ اُنھی فرشتوں کا ماجرا ہے کہ آگے بڑھ کر ناز و تدلل کے ساتھ کسی کی سفارش کرنا تو الگ رہا، دوسرے سب لوگوں کی طرح اُن میں سے بہتوں پر بھی ایسا ہول طاری

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔــلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ

اِن سے پوچھو، تمھیں زمین اور آسمانوں[۵۴] سے کون روزی بہم پہنچاتا ہے؟ کہو، اللہ[۵۵]۔ اب ہم میں اور تم میں کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گم راہی میں، (اِس کا فیصلہ خدا ہی کے سپرد ہے)[۵۶]۔ اِن سے کہو، نہ ہمارے کسی جرم کی تم سے کوئی پرسش ہونی ہے اور نہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اُس کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے گا۔ کہو، ہمارا پروردگار ہم سب کو (ایک دن) اپنی عدالت کے لیے جمع کرے گا،

سبا ۳۴

ہوگا کہ اُنھیں کچھ خبر نہ ہوگی کہ کیا ہوا اور اُن کے پروردگار نے اِس کے دوران میں کیا فرمایا ہے۔

۵۴؎ زمین کے ساتھ آسمان کا ذکر اِس لیے کیا ہے کہ پانی آسمان سے برستا، سورج آسمان پر چمکتا اور تمام موسمی تغیرات آسمان ہی سے پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں زمین سے بیج اگتے، سبزہ لہلہاتا اور فصلیں بہار دکھاتی ہیں۔

۵۵؎ قرآن کے مخاطبین یہ بات چونکہ مانتے تھے، اِس وجہ سے قرآن نے سوال کرنے کے بعد اُس کا جواب بھی خود ہی دیا اور بات آگے بڑھادی ہے۔

۵۶؎ یعنی جب ہم اور تم، دونوں خدا ہی کو رازق مانتے ہیں تو آگے جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، وہ اُس کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اِس کے بعد بھی بحث کرنا چاہتے ہو تو تمھارا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ وہی فیصلہ کرے گا کہ ہم میں سے کون حق پر ہے اور کون گم راہی میں پڑا ہوا ہے، اِس پر اب کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس طرح کی بات، ظاہر ہے کہ اُسی وقت کہی جاتی ہے، جب مخاطب دھاندلی پر اتر آئے اور اپنے مسلمات کے بدیہی نتائج کو بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔

يَفۡتَحُ بَيۡنَنَا بِالۡحَقِّ ۖ وَهُوَ الۡفَتَّاحُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۲۶﴾
قُلۡ اَرُوۡنِیَ الَّذِيۡنَ اَلۡحَقۡتُمۡ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلۡ هُوَ اللّٰهُ
الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۲۷﴾
وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰـكِنَّ
اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ

پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ کر دے گا۔ وہی بہت بڑا فیصلہ کرنے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔۲۴-۲۶

اِن سے کہو، ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی جنھیں تم نے شریک بنا کر خدا سے ملا رکھا ہے۔[۵۷] ہرگز نہیں، بلکہ وہی اللہ عزیز و حکیم ہے۔۲۷

(یہ نہیں سنتے تو ہم دوسروں کو مخاطب بنا لیں گے)۔ ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو جو بھیجا ہے تو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔[۵۸] لیکن (لوگوں پر افسوس ہے کہ) اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۵۹]۔

۵۷۔ یہ تہدید و وعید اور طنز و تحقیر کا اسلوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخر وہ کون اور کہاں ہیں جو ایسے عالی مقام اور صاحب حکمت ہیں کہ خدا کی خدائی میں اُس کے ساجھی بنا دیے گئے ہیں؟ یہ آخر میں اُسی مضمون کو دوسرے اسلوب میں ادا کر کے بات ختم کر دی ہے جس کی ابتدا آیت ۲۲ سے ہوئی تھی۔

۵۸۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ دوسرے رسولوں کی طرح آپ کی بعثت محض اپنی قوم کی طرف نہیں، بلکہ تمام خلق کی طرف ہوئی ہے۔ اپنی قوم کے اعیان و اکابر کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ کر آپ نے اِسی بنا پر اوس و خزرج کے لوگوں کو دعوت دی اور اُن کے بعد اہل کتاب اور اپنے گرد و پیش کے حکمرانوں

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٠﴾

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ

کہتے ہیں کہ اگر تم لوگ سچے ہوتو عذاب کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا (جس کی دھمکی سنا رہے ہو)؟ اِنھیں بتا دو کہ تمھارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹو گے، نہ آگے بڑھو گے۔[٦٠] ۲۸-۳۰

یہ منکرین کہتے ہیں کہ ہم اِس قرآن کو کبھی نہ مانیں گے اور نہ اُس کو جس کی یہ آگے خبر دے رہا ہے۔[٦١] اور اگر تم دیکھتے، جب یہ ظالم اپنے پروردگار کے حضور کھڑے

کو بھی۔ اِس کے نتیجے میں جو لوگ ایمان لائے، یہ اُنھی کی مدد تھی جس سے عالمی سطح پر اتمام حجت کا اہتمام ممکن ہوا اور نبوت و رسالت کا منصب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اب اِس دعوت کا ابلاغ اُس امت کی ذمہ داری ہے جو نسلاً بعد نسلٍ اُنھی انصار کے تابعین اور تبع تابعین کی حیثیت سے دنیا میں موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگوں کو بھی خدا نے یہ سعادت عطا فرمائی کہ بعد میں اُن کی بڑی اکثریت ایمان لا کر اُس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار ہوگئی جسے قرآن میں ذریت ابراہیم کا منصب شہادت کہا گیا ہے۔

۵۹؎ یعنی اِس بات کو نہیں جانتے کہ اُن کے لیے یہ کتنی بڑی محرومی ہے اور اِس کے نتائج کتنے سنگین ہوں گے۔

۶۰؎ مطلب یہ ہے کہ آخر کس برتے پر عذاب کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو؟ کیا جانتے نہیں ہو کہ وہ جب آئے گا تو کسی کے ٹالے ٹل نہ سکے گا۔

۶۱؎ یعنی عذاب اور عذاب کے بعد قیامت۔

يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ نِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣١﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۭ

سبا
۳۴

ہوں گے، اِس طرح کہ اِن میں سے ایک دوسرے پر بات ڈال رہا ہوگا، پھر تم دیکھتے کہ یہ کس انجام کو پہنچے ہیں۔[۶۲] جو لوگ دبا کر رکھے گئے تھے،[۶۳] اُس وقت وہ اپنے متکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو (پیغمبر کی بعثت کے بعد حق اِس قدر واضح ہوگیا تھا کہ) ہم ایمان لے آئے ہوتے۔ اِس کے جواب میں متکبرین اُنھیں جو دبا کر رکھے گئے، کہیں گے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا، اِس کے بعد کہ وہ تمھارے پاس آگئی تھی؟ ہرگز نہیں، بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ دبے ہوئے لوگ متکبرین کو جواب دیں گے: بلکہ تمھاری دن رات کی چالیں تھیں جو یہاں تک لے آئی ہیں، جب کہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور اُس کے شریک

۶۲؎ اِس مفہوم کے الفاظ اصل میں حذف کر دیے گئے ہیں۔ جواب شرط کا یہ حذف عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ہے اور اُن موقعوں پر کیا جاتا ہے، جہاں صورت حال کی ہول ناکی تعبیر و تصویر سے ماورا ہو جائے۔

۶۳؎ یعنی غربا اور عوام جو اپنی غربت اور بے مایگی کے سبب سے ہمیشہ اپنے بڑوں اور سرداروں کے آلۂ کار بنتے رہے ہیں۔

وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾
وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ

ٹھیرائیں۔[۶۴] (پھر) جب عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو دلوں میں پچھتائیں گے۔[۶۵] (مگر اُس وقت پچھتانے سے کیا حاصل)! ہم اِن منکروں کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔[۶۶] یہ وہی بدلہ پائیں گے جو کرتے رہے تھے۔ ۳۱-۳۳

(یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اے پیغمبر)، ہم نے جس بستی میں بھی کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہے، اُس کے اغنیا نے یہی کہا کہ جو تم دے کر بھیجے گئے ہو، ہم اُس کو نہیں مانیں گے۔ اور کہا کہ ہم مال و اولاد میں تم سے بڑھ کر ہیں اور ہم پر کوئی عذاب بھی آنے والا نہیں ہے۔ اِن سے کہو، حقیقت یہ ہے کہ میرا پروردگار ہی جس کے لیے

۶۴۔ اِس تو تکار سے واضح ہے کہ دونوں جانتے بوجھتے حق کا انکار کرتے رہے۔ وہ نہ لیڈروں پر مخفی تھا اور نہ اُن کے پیرووں پر، اِس لیے کہ خدا کے رسول نے اُن پر حجت تمام کر دی تھی۔

۶۵۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا اور اُنھیں عذاب کے آگے پیش کر دیا جائے گا۔ اُس وقت دلوں میں پچھتائیں گے کہ اپنے ضمیر کی گواہی کے خلاف ہم نے اپنے لیڈروں کی پیروی کی اور بالآخر اِس انجام کو پہنچ گئے۔

۶۶۔ یہ سزا اِس جرم کی پاداش میں ہوگی کہ دنیا میں دوسروں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے رہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۫ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

سبا
۳۴

چاہتا ہے، روزی کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۶۷]۔ (خدا کے بندو)، تمھارے مال اور تمھاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تم کو ہمارا مقرب بنا دے۔ البتہ جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، وہی ہیں کہ جن کے لیے اُن کے عمل کا کئی گنا[۶۸] صلہ ہے اور وہ بالا خانوں میں اطمینان سے بیٹھے ہوں گے۔ ۳۴-۳۷

اور جو نیچا دکھانے کے لیے ہماری آیتوں کے جھٹلانے میں سرگرم ہیں[۶۹]، وہ پکڑے ہوئے عذاب میں داخل کیے جائیں گے[۷۰]۔ ۳۸

۶۷۔ یعنی اِس بات کو سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ صبر و شکر کا امتحان ہے جو خدا نے اِس طریقے سے برپا کر رکھا ہے، بلکہ اِس کی بنیاد پر حق و باطل کے فیصلے کرنے لگتے ہیں۔

۶۸۔ اصل میں 'جَزَآءُ الضِّعْفِ' کے الفاظ ہیں۔ یہ مثل کے لیے بھی آتا ہے اور کسی چیز کے امثال کے لیے بھی۔ اِس کو دگنے اجر کے محدود مفہوم میں لینا ضروری نہیں ہے۔

۶۹۔ اصل الفاظ ہیں: 'یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ'۔ اِن میں 'فِیْ' کے بعد مضاف محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۷۰۔ اِس میں ذلت اور بے بسی کی جو تصویر ہے، وہ ظاہر ہے۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَ یَقۡدِرُ لَہٗ ؕ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ ۚ وَ ہُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ ﴿۳۹﴾ وَ یَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ یَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اَہٰۤؤُلَآءِ اِیَّاکُمۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ اَنۡتَ وَلِیُّنَا مِنۡ دُوۡنِہِمۡ ۚ بَلۡ

سبا ۳۴

کہہ دو، میرا پروردگار ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے، رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ اُس کی راہ میں جو چیز بھی تم خرچ کرو گے، وہ اُس کا بدلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے[۱]۔ ۳۹

اُس دن کو یاد رکھو، جس دن وہ سب کو اکٹھا کرے گا[۲]، پھر فرشتوں سے پوچھے گا، کیا یہ لوگ تمھاری ہی پرستش کرتے رہے ہیں[۳]؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے[۴]۔

۱؎ مطلب یہ ہے کہ خدا زیادہ دیتا ہے تو اِس لیے نہیں کہ اُس کی بنیاد پر حق و باطل کے فیصلے کیے جائیں، بلکہ اِس لیے کہ اُس کے بخشے ہوئے رزق کو اُس کی خوشنودی کے لیے اُس کی راہ میں خرچ کیا جائے کہ یہی شکر کا تقاضا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ وہی بات جو اوپر کہی گئی تھی، یہاں کس مقصد سے دہرائی گئی ہے۔ دونوں جگہ، اگر غور کیجیے تو تمہید ایک، لیکن مدعا الگ الگ ہے۔

۲؎ یعنی مشرکین کو بھی اور اُن کو بھی جنھیں وہ معبود بنائے ہوئے تھے۔

۳؎ یہ سوال اُسی مقصد سے ہوگا جس کے لیے انبیا علیہم السلام کی شہادت کا ذکر قرآن میں ہوا ہے، یعنی فرشتوں کی طرف سے اظہار براءت اور مشرکین پر اتمام حجت کے لیے۔

۴؎ یہ شرک کا ذکر سنتے ہی اُس سے نفرت کا اظہار ہے کہ خدا کا کوئی شریک و سہیم کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایسی چیزوں سے پاک ہے۔ ہم پر یہ تہمت جنھوں نے لگائی ہے، اِس کی ذمہ داری اُنھی پر ہے۔

كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾
فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ

اِن کے مقابل میں تو ہی ہمارا کارساز ہے[۵]۔ یہ درحقیقت ہماری نہیں، بلکہ جنوں کی پرستش کرتے تھے[۶]۔ اِن میں سے اکثر اُنھی پر ایمان لائے ہوئے تھے[۷]۔ ۴۰-۴۱

سبا ۳۴

سو (تم نے دیکھ لیا کہ) آج تم میں سے کوئی نہ ایک دوسرے کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان۔ ہم اِن ظالموں سے کہیں گے کہ اب اُس آگ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔ ۴۲

(اِن پر افسوس)، اِنھیں جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں[۸] سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں

۵؎ یہ استغاثے کا جملہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ ہمیں ملوث کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اِن کے مقابل میں اب تو ہی ہمارا حامی و ناصر ہے اور اِن کی تہمت سے ہم تیری ہی مدد سے بری ہو سکتے ہیں۔ اِس لیے کہ تو علام الغیوب ہے، تجھ سے ہماری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔

۶؎ یعنی ہمارے بت بنا کر جب یہ اپنے زعم کے مطابق ہماری پرستش کرتے تھے تو درحقیقت جنوں کی پرستش کرتے تھے۔ اِس وجہ سے کہ اِن کے کاہن اور پروہت اُنھی کی مدد اور رضامندی سے شرک اور بت پرستی کا یہ سارا کاروبار چلا رہے تھے۔

۷؎ یعنی اُنھی کو عالم الغیب اور نافع و ضار سمجھے ہوئے تھے اور اُنھی کے شیاطین اِس پر راضی بھی تھے۔

۸؎ یعنی واضح، محکم اور دل و دماغ کو روشن کر دینے والی آیتیں۔

اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ ۚ وَ قَالُوۡا مَا ھٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکٌ مُّفۡتَرًی ؕ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا جَآءَھُمۡ ۙ اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۴۳﴾ وَ مَاۤ اٰتَیۡنٰھُمۡ مِّنۡ کُتُبٍ یَّدۡرُسُوۡنَھَا وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡھِمۡ قَبۡلَکَ مِنۡ نَّذِیۡرٍ ﴿۴۴﴾ؕ

کہ یہ تو محض ایک شخص[79] ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو اُن چیزوں سے روک دے جنھیں تمھارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن بس ایک جھوٹ ہے گھڑا ہوا۔ (ہرگز نہیں، یہ قطعی حق ہے) اور اِن منکروں نے اِس حق کے بارے میں، جب وہ اِن کے پاس آ گیا[80] تو کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے[81]۔ ہم نے اِن کو کتابیں نہیں دی تھیں جنھیں یہ پڑھتے ہوں، (جس طرح بنی اسرائیل کو دیں) اور نہ تم سے پہلے اِن کی طرف کوئی خبردار کرنے والا بھیجا تھا۔ (اِن پر افسوس، اِس پر بھی یہ ناقدری کر رہے ہیں)! ۴۳-۴۴

۷۹؎ یعنی اُسی طرح کا آدمی ہے، جیسے ہم ہیں۔ یہ کوئی فرستادۂ الٰہی نہیں ہے، جیسا کہ دعویٰ کر رہا ہے۔

۸۰؎ یعنی جب اُس کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہا۔ اِنھوں نے اُسے نصف النہار پر چمکتے ہوئے سورج کی طرح دیکھ لیا ہے۔ آیت میں 'لِلۡحَقِّ' کا 'ل' 'فِیۡ' کے مفہوم میں ہے اور اِس کا استعمال اِس مفہوم میں معروف ہے۔

۸۱؎ یہ بات وہ اِس لیے کہتے تھے کہ قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر و تسخیر کا انکار تو اُس کے دشمن بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا ایک ہی صورت تھی کہ اُسے جادو بیانی کا کرشمہ قرار دے کر لوگوں کو باور کرایا جائے کہ وہ اُسے آسمان کی کوئی چیز نہ سمجھیں، بلکہ اُسی طرح کی شاعری اور خطابت سمجھ کر سنیں جو اِس سے پہلے وہ اپنے شعرا اور خطبا سے سنتے رہے

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ

اِن سے اگلوں نے بھی اِسی طرح جھٹلا دیا تھا اور یہ تو اُس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے جو ہم نے اُن کو دیا تھا۔[۸۲] مگر جب اُنھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ کیسی تھی میری پھٹکار! ۴۵

اِن سے کہو، میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہ کہ خدارا، تم دو دو، ایک ایک کر کے اٹھو،[۸۳] پھر غور کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں

ہیں۔

۸۲؎ مطلب یہ ہے کہ یہ تنگ ظرف تو بہت تھوڑے میں بہک گئے ہیں۔ اِن سے کہیں زیادہ شان و شوکت، کروفر اور اسباب و وسائل رکھنے والے بھی خدا کی ایک پھونک میں اڑ گئے، اِن کی کیا حقیقت ہے!

۸۳؎ اصل میں 'اَنْ تَقُوْمُوْا' کے الفاظ ہیں۔ یہ ارادے اور اقدام کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بھیڑ کا ذہن حقائق پر غور کرنے اور اُن کو سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ لوگ اگر کسی بات کو ضد اور تعصب سے پاک ہو کر سمجھنا چاہتے ہوں تو اُس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ دو دو، ایک ایک کر کے اِس ارادے سے آئیں کہ کہنے والے کی بات میں اگر معقولیت ہوئی تو وہ لازماً اُس پر غور کریں گے۔ اِس لیے کہ یہ ارادہ نہ ہو تو آدمی کسی معاملے پر بھی غیر جانب دار ہو کر غور نہیں کر سکتا۔

بَیۡنَ یَدَیۡ عَذَابٍ شَدِیۡدٍ ﴿۴۶﴾ قُلۡ مَا سَاَلۡتُکُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَكُمۡ ؕ

ہے۔[84] وہ تو ایک عذاب شدید سے پہلے تمھیں خبردار کرنے والا ہے۔[85] اِن سے کہو، میں

۸۴؎ یہ جملہ تھوڑی دیر توقف کر کے فرمایا ہے تاکہ مخاطب چاہے تو ذرا سا غور کر کے اگلی بات سنے۔ ساتھی سے مراد یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اِس کے لیے اصل میں 'صَاحِب' کا لفظ آیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''لفظ 'صَاحِب' یہاں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس شخص کو تم خبطی اور دیوانہ قرار دے رہے ہو، اُس سے تمھیں کوئی نیا نیا سابقہ پیش نہیں آیا ہے، بلکہ یہ تمھارے ہی اندر پیدا ہوا، تمھارے ہی سامنے پلا اور بڑھا اور تمھارے ہی آگے یہ اپنی اِس عمر کو پہنچا۔ اِس پورے زمانے میں تم نے دیکھا کہ یہ تمھارے ہر خیر میں شریک اور تمھارے ہر شر سے مجتنب رہا ہے۔ تم نے ہر آزمایش میں اِس کو صادق اور امین پایا۔ اِس کی سوجھ بوجھ اور اِس کی عقل و بصیرت پر تم نے اعتماد کیا اور اِس کو اپنے اندر سب سے بڑا عاقل و فرزانہ مانتے رہے، لیکن آج اُسی فرزانہ کو دیوانہ قرار دے رہے ہو! غور کرو، دیوانہ وہ ہے یا تم!'' (تدبر قرآن ۶/ ۳۳۷)

۸۵؎ یعنی تمھاری طرف سے ناقدری، دل آزاری اور ستم رانی کے باوجود اِس کے اندر اپنی دعوت کے لیے جو اضطراب اور بے قراری تم دیکھ رہے ہو، اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اِسے کوئی جنون لاحق ہو گیا ہے، بلکہ یہ ہے کہ خدا کا جو عذاب تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے، یہ اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک رسول کو اپنی قوم پر آنے والے عذاب کا نظر آنا کوئی مجاز نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ رسول اپنی قوم کے لیے رحمت کی گھٹا بن کر آتا ہے، لیکن اِس رحمت کی گھٹا کے اندر ہی اُس کی قوم کے لیے صاعقۂ عذاب بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اگر قوم اُس کی تکذیب کر دیتی ہے۔ یہی عذاب آخرت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے ہر رسول نے اپنی قوم کو اِن دونوں عذابوں سے ڈرایا ہے اور اِس یقین کے ساتھ ڈرایا ہے کہ گویا وہ اپنی دونوں آنکھوں سے اُس عذاب کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن عقل کے اندھوں نے

اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ﴿۴۷﴾
قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ ۚ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۴۸﴾ قُلۡ

نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمھارے ہی لیے مانگا ہے[86]۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے[87]۔ ۴۶-۴۷

اِن سے کہہ دو، میرا پروردگار حق کو لازماً باطل[88] پر مارے گا[89]۔ وہ سب بھیدوں

اُس کے اِس یقین کو جنون پر محمول کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر 'واصباحا' کا جو نعرہ لگایا، وہ اِسی یقین کا مظاہرہ تھا، لیکن قریش کے لیڈروں نے اُس سے متنبہ ہونے کے بجاے اُس کا مذاق اڑایا۔'' (تدبر قرآن ۶/۳۳۸)

۸۶؎ یعنی اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ اگر کچھ مانگا ہے تو تمھارے لیے مانگا ہے کہ تم میں سے جو خدا کی راہ پر چلنے کی خواہش رکھتا ہو، وہ میرے پاس آئے اور پوری توجہ کے ساتھ میری بات سنے تاکہ میں اُسے یہ راہ دکھا دوں۔

۸۷؎ یعنی اِس پر بھی گواہ ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کس بے غرضی کے ساتھ کر رہا ہوں اور اِس پر بھی کہ تم کس بے پروائی کے ساتھ میری بات رد کر رہے ہو، دراں حالیکہ وہ تمھارے ہی بھلے کی بات ہے۔

۸۸؎ یہ الفاظ بربناے قرینہ اصل میں محذوف ہیں۔ سورۂ انبیاء (۲۱) کی آیت ۱۸ میں اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

۸۹؎ یعنی یہاں بھی مارے گا، اِس لیے کہ رسول نے تم پر حجت پوری کر دی ہے اور آخرت میں بھی، جہاں وہ عدالت کبریٰ قائم ہو گی جس کی منادی اللہ کے پیغمبر کرتے رہے ہیں۔

جَآءَ الۡحَقُّ وَمَا یُبۡدِئُ الۡبَاطِلُ وَمَا یُعِیۡدُ ﴿۴۹﴾
قُلۡ اِنۡ ضَلَلۡتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفۡسِیۡ ۚ وَ اِنِ اہۡتَدَیۡتُ
فَبِمَا یُوۡحِیۡۤ اِلَیَّ رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ سَمِیۡعٌ قَرِیۡبٌ ﴿۵۰﴾
وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ فَزِعُوۡا فَلَا فَوۡتَ وَ اُخِذُوۡا مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ﴿۵۱﴾ۙ

کا جاننے والا ہے[90]۔ کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا[91]، اور (اُسے مٹنا ہی تھا)، حقیقت یہ ہے کہ باطل نہ ابتدا کرتا ہے، نہ اعادہ[92]۔ ۴۸-۴۹

کہہ دو کہ اگر میں گم راہی پر ہوں تو میری گم راہی کا وبال مجھی پر ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اُس وحی کی بدولت ہے جو میرا پروردگار میری طرف بھیج رہا ہے[93]۔ (مجھے اب جو کچھ کہنا ہے، اُسی سے کہوں گا)۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ ۵۰

اگر تم دیکھ پاتے (تو اِن کی بے بسی دیکھتے، اے پیغمبر[94])، جب یہ گھبرائے ہوئے

---

۹۰ اِس لیے کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جب یہ عدالت قائم ہوگی تو اُسے فیصلہ کرنے میں کوئی مشکل پیش آئے گی۔

۹۱ یہ الفاظ بھی بر بنائے قرینہ اصل میں محذوف ہیں۔ آگے اِس کی وضاحت ہوگئی ہے۔

۹۲ یعنی نہ خلق کی ابتدا میں باطل کا کوئی حصہ ہے اور نہ اُس وقت ہوگا، جب اُس کا اعادہ کیا جائے گا۔

۹۳ چنانچہ سوچ لو کہ اگر یہی دوسری بات ہے تو تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھیرتے ہو اور تمھیں معلوم ہی ہے کہ وحی الٰہی کے جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔

۹۴ یہ جواب شرط ہے اور جس طرح پیچھے آیت ۳۱ میں محذوف ہے، اُسی طرح یہاں بھی حذف کر دیا گیا ہے۔

سبا ۳۴

وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۚۖ ﴿٥٢﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿٥٣﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿٥٤﴾

البیان

سبا
۳۴

پھریں گے، پھر کہیں بھاگ نہ سکیں گے، بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ اُس وقت بول اٹھیں گے کہ ہم اُس پر ایمان لے آئے ہیں جس پر ایمان کا مطالبہ ہم سے کیا گیا تھا۔ پر اتنی دور سے اب وہ ایمان کہاں اِن کے ہاتھ آئے گا! اِس سے پہلے یہ اُس کا انکار کر چکے اور دور ہی سے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے۔[95] اِن کے اور اِن کی آرزوؤں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی،[96] جیسا اِس سے پہلے اِن کے ہم مشربوں کے ساتھ کیا گیا۔[97] اِس لیے کہ وہ بھی اِسی طرح الجھا دینے والے شک میں پڑے رہے تھے۔۵۱-۵۴

---

۹۵ یعنی کبھی یہ کہا کہ پیغمبر کا دعویٰ محض افترا ہے، عذاب کی دھمکی محض دھونس ہے، قیامت کا ڈراوا محض خلل دماغ کا نتیجہ ہے اور کبھی پیغمبر کو برخود غلط کہا اور اُس کے دعویٰ نبوت کو افترا قرار دے کر فارغ ہو گئے۔ غرض یہ کہ بے سوچے سمجھے جو منہ میں آیا، کہہ دیا۔

۹۶ یعنی کوئی آرزو بر نہ آئے گی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...وہ ایمان لانا چاہیں گے، لیکن اُن کا یہ چاہنا بے سود ہوگا۔ وہ مہلت کی درخواست کریں گے، لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے شریکوں کو پکاریں گے، لیکن اُن کی طرف سے بھی کوئی فریادرسی نہیں ہوگی۔ غرض، امید کے تمام دروازے اُن پر بند ہو جائیں گے اور ایک ابدی مایوسی سے اُن کو سابقہ پیش آئے گا۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۳۴۳)

۹۷ یہ عاد و ثمود، قوم فرعون اور اہل مدین وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کی سرگذشتیں قرآن میں سنائی گئی ہیں۔ آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیامت کی عدالت میں قوموں کے

سورة فاطر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

شکر اللہ ہی کے لیے ہے، زمین اور آسمانوں کا خالق، فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا[۹۸]، جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں[۹۹]۔ وہ خلق میں جو چاہے، اضافہ

فیصلے ایک ترتیب کے ساتھ ہوں گے۔ یعنی جو پہلے ہوئے، اُن کا فیصلہ پہلے اور جو بعد میں ہوئے، اُن کا فیصلہ بعد میں سنایا جائے گا۔

۹۸ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے زمین و آسمان بنائے ہیں، فرشتوں کو بھی اُسی نے وجود بخشا ہے اور اِس کا مقصد اپنی مخلوقات تک پیغام رسانی ہے۔ لہٰذا زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی سب مخلوقات کی طرح وہ بھی خدا کی ایک مخلوق ہیں۔ وہ اِن کے بنانے میں شریک کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اور اُن کا الوہیت میں کوئی حصہ کس طرح مانا جا سکتا ہے؟ جو لوگ اُن کو یہ حیثیت دے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے نہ خدا کی قدر پہچانی ہے، نہ اِن پیغام بروں کی اور نہ اپنی ہی۔

۹۹ یعنی اپنی قوت پرواز کے لحاظ سے متفاوت ہیں، کچھ دو پروں کی قوت سے اڑتے ہیں، کچھ چار پروں کی اور کچھ اِس سے بھی زیادہ۔ یہ فرق خود بتا رہا ہے کہ اُنھیں کسی بنانے والے نے بنایا اور اُن کے مراتب و منازل متعین کیے ہیں، وہ آپ سے آپ نہیں بن گئے ہیں کہ سب اپنا مرتبہ یکساں بنا لیتے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①

مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِن رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۖ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِن بَعْدِهِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ②

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ

کر دیتا ہے۔[۹۹] یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔۱

اللہ جو رحمت بھی لوگوں کے لیے کھول دے تو اُسے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اور جس کو روک لے تو اُس کے روک لینے کے بعد اُسے پھر کوئی کھولنے والا نہیں ہے[۱۰۱] اور وہی عزیز و حکیم ہے۔۲

(اِس لیے) لوگو، اللہ کے جو احسانات تمھارے اوپر ہیں، اُن کا دھیان کرو۔

"... مقصود یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جن نادانوں نے فرشتوں کو الوہیت کے زمرے میں داخل کر رکھا ہے، اُن کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ بلند کا پتا نہیں ہے۔ خدائی میں شریک ہونا تو درکنار، اُس کے قاصد اور سفیر ہونے میں بھی اُن سب کا درجہ و مرتبہ ایک نہیں ہے، بلکہ کسی کی رسائی کسی منزل تک ہے اور کسی کی پہنچ کسی مقام تک۔"

(تدبر قرآن ۶/۳۵۴)

۱۰۰۔ یعنی جن صلاحیتوں کی مخلوق چاہے، پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ وہ فرشتوں سے بھی زیادہ قوت و صلاحیت کی کوئی مخلوق اگر پیدا کر دے تو یہ اُس کی قدرت و حکمت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہوگا۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہوں گے اور نہیں ہوسکتے کہ اُس کی خدائی میں وہ کسی نوعیت سے شریک ہوگئی ہے۔

۱۰۱۔ آیت میں ایک ہی چیز کے لیے ضمیر ایک جگہ مونث اور دوسری جگہ مذکر آئی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ لفظ کا لحاظ کیا گیا ہے اور دوسری جگہ مفہوم کا۔ اِس کی متعدد نظیریں قرآن میں موجود ہیں۔

غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ③
وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ④
يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ٞ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ⑤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ
عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ

فاطر ۳۵

کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمھیں زمین و آسمان سے روزی دیتا ہے؟ نہیں، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔[۱۰۲] پھر کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! ۳

(اِس کے باوجود، اے پیغمبر)، اگر یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کچھ غم نہ کرو، اِس لیے کہ تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو اِسی طرح جھٹلا دیا گیا تھا۔ (خدا اِنھیں دیکھ رہا ہے) اور یہ سارے معاملات بالآخر خدا ہی کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ ۴

لوگو، اللہ کا وعدہ شدنی ہے۔ سو دنیا کی زندگی تمھیں ہرگز کسی دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز[۱۰۳] اللہ کے بارے میں تمھیں کبھی دھوکا دینے پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان تمھارا دشمن ہے، اِس لیے تم بھی اُسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ اپنے گروہ کو اِسی لیے اپنی

۱۰۲؎ یعنی جب وہی خالق و رازق ہے تو اُس کے سوا معبود کوئی اور کیوں ہونے لگا؟ ہرگز نہیں، وہی معبود حقیقی ہے۔ پیچھے جو سوال کیا ہے، اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر یہ بات اِس لیے فرما دی ہے کہ مخاطب مشرکین ہیں اور اُنھیں اِس بات سے انکار نہیں تھا کہ زمین و آسمان کو بنانے والا اللہ ہے اور وہی روزی رساں ہے۔

۱۰۳؎ یعنی شیطان۔ آگے اِس کی وضاحت ہوگئی ہے۔

اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ؕ﴿۶﴾ اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۷﴾
اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۫ۖ فَلَا تَذۡہَبۡ نَفۡسُکَ عَلَیۡہِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۸﴾

طرف بلاتا ہے کہ وہ دوزخ والوں میں سے ہو جائیں۔ (اِس لیے متنبہ ہو جاؤ)، جنھوں نے کفر کیا ہے، اُن کے لیے وہاں سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے مغفرت ہے اور بہت بڑا اجر ہے۔ ۵-۷

(یہ نہیں مان رہے تو اِس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے، اے پیغمبر)۔ پھر کیا وہ جس کی نگاہوں میں اُس کا برا عمل خوش نما بنا دیا گیا اور وہ اُسی کو اچھا سمجھنے لگا ہے، اُسے تم ہدایت دے سکتے ہو؟[۱۰۴] اِس لیے کہ اللہ ہی (اپنے قانون کے مطابق) جسے چاہتا ہے، گم راہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔ سو اِن پر افسوس کر کر کے[۱۰۵] تم اپنے کو ہلکان نہ کرو، اِس لیے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔ ۸

۱۰۴؎ مطلب یہ ہے کہ اِس طرح کے لوگوں کا ہدایت پانا سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو کبھی ہدایت نہیں دیتا جو ہر ناخوب کو خوب بنا کر دیکھنے کو اپنا ہنر بنا لے اور خیر و شر کے اُن بنیادی تصورات ہی سے بے گانہ ہو جائے جو خدا نے انسان کی فطرت میں ودیعت فرمائے ہیں۔

۱۰۵؎ اہل نحو مصدر کے صلے کو اُس پر متقدم نہیں مانتے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں 'عَلَیۡہِمۡ' کو 'حَسَرٰت' سے متعلق مانا اور فرمایا ہے کہ اِس کا جمع کی صورت میں آنا فرط غم کے اظہار کے لیے ہے۔ آیت کے مدعا پر تدبر کیا جائے تو اُن کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

فاطر ۳۵

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ﴿۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ؕ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ

(لوگو)، اللہ ہی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، پھر وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ہم نے اُنھیں کسی مردہ زمین کی طرف ہانک دیا، پھر اُن کے پانی سے اُسی زمین کو، اِس کے بعد کہ وہ مری پڑی تھی، زندہ کردیا۔ لوگوں کا ازسرنو زندہ ہو کر اٹھنا بھی اِسی طرح ہوگا۔[۱۰۶] ۹

جو (وہاں) عزت چاہتا ہے، وہ اللہ سے چاہے، اِس لیے کہ عزت تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔[۱۰۷] اُسی کی جناب میں پاکیزہ کلام[۱۰۸] پہنچتا ہے اور اچھا عمل اُسے اوپر

۱۰۶۔ اوپر جس وعدۂ شدنی کا ذکر ہے، یہ اُس کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو اسلوب کلام بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... پہلے ماضی کا صیغہ 'اَرْسَلَ' استعمال ہوا ہے۔ پھر مضارع 'تُثِيْرُ' آ گیا۔ اِس کے بعد 'سُقْنَا' اور 'اَحْيَيْنَا' متکلم کے صیغے آگئے۔ اسلوب کا یہ تنوع اپنے اندر گوناگوں خوبیاں رکھتا ہے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ ماضی تو صرف بیان واقعہ کے لیے آتا ہے، مضارع میں تصویر حال کا پہلو بھی ہوتا ہے اور متکلم کا صیغہ التفات وعنایات خاص پر دلیل ہوتا ہے۔" (تدبر قرآن ۶/ ۳۶۳)

۱۰۷۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ مشرکین اپنے معبودوں کو خدا کے حضور عزت و سرخ روئی کے حصول کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

۱۰۸۔ اِس سے کلمۂ ایمان مراد ہے۔ آگے اچھے عمل کے ذکر سے اِس کو واضح کر دیا ہے۔ آیت میں جس طرح 'عَمَل' کے ساتھ 'صَالِح' کا لفظ ہے، اُسی طرح 'کَلِم' کے ساتھ 'طَيِّب' کا لفظ آیا ہے۔ یہ اُس کی زرخیزی اور ثمرباری کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ ﴿۱۰﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ

اٹھاتا ہے۔ اور جو لوگ بری تدبیریں کر رہے ہیں[۱۰۹]، اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور اُن کی سب تدبیریں بالآخر غارت ہو کر رہیں گی۔ ۱۰

اور (لوگو)، اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر پانی کی بوند سے، پھر تمھیں جوڑے جوڑے بنایا ہے۔ اُس کے علم کے بغیر نہ کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے، نہ بچہ

فاطر
۳۵

’’...اِس لیے کہ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے یہی کلمہ تمام علم و حکمت کی جڑ ہے۔ جس نے اِس کو پالیا، اُس نے تمام علم و حکمت کے خزانے کی کلید پالی اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ایمان اور عمل صالح، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح ایمان کے بغیر عمل کی کوئی بنیاد نہیں، اُسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے جان شے ہے۔‘‘ (تدبر قرآن ۶/ ۳۶۳)

اُنھوں نے لکھا ہے:

’’...گویا کلمۂ ایمان کی مثال انگور کی بیل کی ہوئی جو ہے تو بجاے خود نہایت ثمر بار، لیکن اُس کی شادابی و ثمر باری کا تمام تر انحصار اِس امر پر ہے کہ اُس کو کوئی سہارا ملے جس پر وہ چڑھے، پھیلے اور پھولے پھلے۔ یہ سہارا اُس کو عمل صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ عمل صالح ہی اُس کو پروان چڑھاتا اور مثمر و بار آور بناتا ہے۔ ورنہ جس طرح انگور کی بیل سہارے کے بغیر سکڑ کے رہ جاتی ہے، اُسی طرح ایمان بھی عمل صالح کے بدون مرجھا کے رہ جاتا ہے۔‘‘

(تدبر قرآن ۶/ ۳۶۳)

۱۰۹۔ اصل میں ’یَمْکُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں ’السَّیِّاٰت‘ مصدر کی صفت ہے، یعنی ’یَمْکُرُوْنَ الْمَکَرَاتِ السَّیِّئَاتِ‘۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فعل ’یَمْکُرُوْنَ‘ متعدی نہیں ہے کہ ’السَّیِّاٰت‘ کو اِس کا مفعول قرار دیا جا سکے۔

وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑪
وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ڰ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَاۗىِٕغٌ شَرَابُهٗ
وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ
حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑫ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ

فاطر
۳۵

جنتی ہے اور کسی عمر والے کو نہ عمر دی جاتی ہے اور نہ اُس کی عمر گھٹائی جاتی ہے، مگر وہ بھی ایک کتاب میں لکھی ہوتی ہے۔ (اِن میں سے کسی کام کے لیے وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لیے یہ آسان سی بات ہے[۱۱۰]۔ ۱۱

(یہ دنیا مجموعۂ اضداد ہے جس میں وہی توافق پیدا کرتا ہے۔ تم غور کرو)، دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک میٹھا ہے، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوش گوار اور ایک کھاری کڑوا ہے اور تم دونوں سے تازہ گوشت حاصل کر کے کھاتے ہو اور زینت کا سامان نکالتے ہو، جس کو پہنتے ہو۔ اور کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ اُسی پانی میں اُس کا سینہ چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں، اِس لیے کہ (دور دراز علاقوں میں) تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اِس لیے کہ اُس کا شکر ادا کرو۔ وہ رات کو دن میں داخل کرتا

۱۱۰؎ مطلب یہ ہے کہ اِس مغالطے میں نہ رہو کہ اتنی وسیع و عریض دنیا کے اِن جزئیات امور کا احاطہ خدا تن تنہا کس طرح کر سکتا ہے؟ اِس کے لیے وہ یقیناً اعوان و انصار کا محتاج ہو گا۔ لہٰذا کیا بعید ہے کہ وہ یہی دیوی دیوتا اور بزرگان دین ہوں جن کی پرستش ہمارے آبا و اجداد کرتے رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ محض حماقت ہے۔ خدا اِن میں سے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی، اُس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۭ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾

فاطر
۳۵

ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور سورج اور چاند کو اُس نے مسخر کر رکھا ہے۔ دونوں ایک بندھے ہوئے وقت کے لیے چل رہے ہیں۔ یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے، اُسی کی بادشاہی ہے، اور جنھیں تم اُس کے سوا پکارتے ہو، وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ تم اُنھیں پکاروگے تو وہ تمھاری پکار نہ سنیں گے اور اگر سنیں گے بھی تو تمھاری فریادرسی نہ کر سکیں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ تمھیں ایک باخبر کی طرح کوئی دوسرا (یہ حقائق) نہیں بتائے گا[۱۱۱]۔ ۱۲-۱۴

۱۱۱ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرح۔ اِس لیے کہ وہی اِن حقائق کا براہ راست علم رکھتا ہے۔ دوسرے سب لوگ زیادہ سے زیادہ عقلی استدلال سے کوئی بات بتا سکتے ہیں جو اصلاً استنباطی ہوتا ہے۔ اِس لیے متنبہ ہو جاؤ، غیب کے پردوں میں کیا ہے اور وہ کب اور کس طرح تمھارے سامنے آ جائے گا، اُس کو ایک حقیقی باخبر ہی جانتا ہے اور اِس وقت وہی تمھیں بتا رہا ہے کہ یہ اضداد اُسی کے آفریدہ ہیں اور اِن کے اندر جو سازگاری دیکھتے ہو، وہ بھی اُسی قادر و قیوم کی پیدا کی ہوئی ہے۔ یہ خود اِس بات کی شہادت ہے کہ ایک ہمہ گیر و ہمہ جہت اور بالاتر قوت ہے جو اِن اضداد پر حاوی ہے اور اِنھیں اپنے پیش نظر مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ کوئی دوسرا اُس کے کسی ارادے اور فیصلے پر کسی نوعیت سے اثر انداز نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ زمین و آسمان میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿١٥﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿١٧﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى

فاطر ۳۵

لوگو، (اُس کی طرف سے اِس علم و تذکیر کی قدر کرو)۔ تم ہی اللہ کے محتاج ہو۔ (اُس کو تمھارے ایمان کی کوئی ضرورت نہیں آپڑی ہے)۔ اللہ تو بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور (تمھاری جگہ) ایک نئی مخلوق یہاں لے آئے۔ یہ اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ۱۵-۱۷

(اِس لیے متنبہ ہو جاؤ۔ قیامت کے دن) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور اگر کوئی بوجھ سے دبا ہوا اپنا بوجھ بٹانے کے لیے پکارے گا تو اُس میں سے کچھ بھی بٹایا نہ جائے گا، چاہے (جس کو پکارا جائے)، وہ قرابت مند ہی کیوں نہ ہو[۱۱۲]۔ (یہ نہیں سنتے تو اِنھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو، اے پیغمبر)۔ تم صرف اُنھی کو خبردار کر سکتے ہو جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے رہے ہیں[۱۱۳]۔ (یہ پاکیزگی کی دعوت ہے) اور جو پاکیزگی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لیے حاصل

۱۱۲؎ اِس آیت میں 'مُثْقَلَة' سے پہلے اُس کا موصوف محذوف ہے۔ اِسی طرح، 'اِلٰى حِمْلِهَا' میں 'حِمْل' سے پہلے مضاف اور 'كَانَ' کے بعد اُس کا اسم محذوف ہے۔ یہ تمام محذوفات عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ہیں۔ ہم نے ترجمے میں جہاں ضروری تھا، اِنھیں کھول دیا ہے۔

۱۱۳؎ یعنی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہیں اور اِس بات پر اصرار بھی نہیں کرتے کہ آنکھوں

لِنَفْسِهٖ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾
وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾
وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾
اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَاِنْ

فاطر ۳۵

کرتا ہے اور (ایک دن) پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ ۱۸
(تمھارے مخاطبین سب یکساں نہیں ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ اندھے اور آنکھوں والے یکساں نہیں ہوتے، روشنی اور اندھیرے بھی یکساں نہیں ہیں، دھوپ اور چھاؤں بھی یکساں نہیں ہوتی اور نہ زندے اور مردے یکساں ہو سکتے ہیں۔ بے شک، اللہ ہی (اپنے قانون کے مطابق)[۱۱۴] جس کو چاہتا ہے، سننے کی توفیق دیتا ہے۔ تم قبروں میں پڑے ہوئے اِن مردوں کو نہیں سنا سکتے —— تم تو صرف ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا

سے دیکھنے کے بعد ہی مانیں گے، بلکہ عقل کی بات عقلی استدلال ہی سے مان لیتے ہیں۔
۱۱۴ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ جو لوگ اُس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھیں گے اور اُن کی قدر کریں اور جو علم اُن کے اندر الہام کیا گیا ہے، اُس سے فائدہ اٹھائیں گے، اُنھیں وہ مزید ہدایت بخشے گا، اور جنھوں نے اِن صلاحیتوں کی قدر نہیں کی اور خدا کے الہام کو نہیں سمجھا اور عقل کی آنکھیں پھوڑ کر اپنے دل بے نور کر لیے ہیں، اُن کو وہ اُنھی تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا جو وہ اپنے لیے خود پیدا کر لیں گے۔

مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ

بنا کر بھیجا ہے۔ (اِس سے پہلے بھی) کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس کے اندر کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو[۱۱۵]۔ اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اِس لیے کہ اِن سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں، اُنھوں نے بھی اِسی طرح جھٹلا دیا تھا[۱۱۶]۔ اُن کے پاس بھی اُن کے رسول نہایت واضح دلائل اور صحیفوں اور روشن کتاب[۱۱۷] کے ساتھ آئے تھے۔ پھر اُن کے منکرین کو میں نے پکڑا تو دیکھو کہ کیسی ہوئی اُن پر میری پھٹکار! ۱۹-۲۶

تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اُس سے ہم نے رنگ رنگ

---

۱۱۵ یعنی اُس موقع پر جب اُس نے اپنی شناخت الگ پیدا کر لی۔ چنانچہ بعد میں اِسی انذار کی روایت نسلاً بعد نسلٍ اُس کے صالحین و ابرار کے ذریعے سے اُس کے اندر منتقل ہوتی رہی۔

۱۱۶ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس میں تمھاری کسی کوتاہی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ رسولوں کے ساتھ اُن کی قوموں کا معاملہ ہمیشہ یہی رہا ہے۔

۱۱۷ یعنی کسی کے پاس صحیفوں اور کسی کے پاس روشن کتاب کے ساتھ۔ اِس میں 'و' تقسیم کے لیے ہے اور روشن کتاب سے اشارہ تورات کی طرف ہے۔ قرآن مجید سے پہلے کتاب منیر کی حیثیت اُسی کو حاصل رہی ہے۔

مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ

کے پھل پیدا کر دیے اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ، مختلف رنگوں کی دھاریوں والے ہیں اور گہرے سیاہ بھی[118]۔ اِسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں کے اندر بھی کئی رنگ کے ہیں[119]۔ (لہٰذا ہر شخص سے ہر چیز کی توقع نہیں کرنی چاہیے[120])۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے اُس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم والے

فاطر ۳۵

۱۱۸ اصل الفاظ ہیں: 'غَرَابِيْبُ سُوْدٌ'۔ اِنھیں بظاہر 'سُوْدٌ غَرَابِيْبُ' ہونا چاہیے تھا، لیکن قرآن کی بلاغت ہے کہ اُس نے تاکید کو موخر کر کے صوتی حسن کے ساتھ اُس میں تاکید مزید کا مفہوم پیدا کر دیا ہے، جیسے ہم اپنی زبان میں کہیں کہ وہ لوگ چٹے ہیں، گورے۔

۱۱۹ یعنی صورت، سیرت، صفات، خصوصیات، ذوق و مزاج اور عادات و اطوار کے اعتبار سے اُن میں بڑا فرق و اختلاف ہے۔ یہ فرق و اختلاف اگر خلقی ہے تو خدا کی قدرت و حکمت کا ظہور ہے اور اخلاقی ہے تو امتحان کی اُس اسکیم سے پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق یہ دنیا بنائی گئی ہے۔

۱۲۰ مطلب یہ ہے کہ فیض خواہ عام ہو، لیکن اُس سے فائدہ ہر شخص کو اُس کی استعداد کے لحاظ سے پہنچتا ہے۔ بارش برستی ہے تو باغ و چمن کو بے شک، گل و گلزار بنا دیتی ہے، مگر صحراؤں اور بیابانوں میں اُس کے یہ اثرات نہیں ہوتے۔ وہاں وہ جھاڑ جھنکاڑ ہی اگاتی ہے۔ یہ استعداد خدا پیدا کرتا ہے، لیکن انسانوں کے اندر یہ اُس قانون کے مطابق پیدا ہوتی ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

ہیں[۱۲۱]۔ بے شک، اللہ زبردست ہے، درگذر فرمانے والا ہے[۱۲۲]۔ ۲۷-۲۸

۱۲۱؎ یعنی پیغمبروں کی تذکیر سے اُس علم کو شعور کی سطح پر دریافت کر چکے ہیں جو خدا نے اُن کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے۔ اِسی علم سے انسان اپنے پروردگار کو پہچانتا اور خیر و شر میں امتیاز کرتا ہے۔ اِس علم کا شعور نہ ہو تو تمام علوم و افکار بے بنیاد ہو کر رہ جاتے اور صرف اپنے حاملین کی سرکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ آیت میں 'اَلْعُلَمٰٓؤُا' سے مراد اِسی فطری علم کے حاملین ہیں۔ اِس کے لیے کسی درس گاہ میں جا کر پڑھنے پڑھانے اور کسی سے کوئی سند حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اِن علما کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بات کو گہرائی میں اتر کر سمجھتے ہیں، اُن کی نگاہ ہمیشہ اصل حقیقت پر رہتی ہے، وہ کبھی کٹ حجتی کرنے اور غیر متعلق موشگافیوں میں پڑنے کی کوشش نہیں کرتے، وہ الفاظ کے پیچوں میں نہیں الجھتے، ہمیشہ معانی و مفاہیم کی جستجو کرتے ہیں، وہ چیزوں کو ظاہر کے اعتبار سے نہیں، اُن کے باطن کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور سطح سے نیچے اتر کر قعر دریا میں پڑے ہوئے موتی نکال لاتے ہیں، وہ اِس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ سچائی کو جان لینے کے بعد کوئی شخص اپنے کو اُس سے غیر متعلق بھی رکھ سکتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ پیغمبر کی دعوت یہی لوگ قبول کریں گے۔ اِس کی توقع اُن جاہلوں سے نہیں کی جا سکتی جو کتابوں کے ڈھیر اٹھائے ہوتے ہیں، لیکن اُس کتاب الٰہی کو اُنھیں کبھی کھول کر دیکھنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی جو خدا نے اُن کی تخلیق کے وقت ہی اُن پر نازل کر دی تھی اور نہ اُس کو جو بعد میں اُس نے اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہے۔

۱۲۲؎ یعنی جاہلوں کو جب چاہے، پکڑ سکتا ہے، مگر اِس لیے نہیں پکڑتا کہ زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ درگذر فرمانے والا بھی ہے۔ چنانچہ اُس وقت تک مہلت دیتا ہے، جب تک حجت پوری نہیں ہو جاتی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

(تمھارے مخاطبین میں، اے پیغمبر)، جولوگ کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے رہے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے، اُس میں سے کھلے اور چھپے (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے رہے ہیں، کچھ شک نہیں کہ وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہ ہوگا۔[۱۲۳] اِس لیے امیدوار ہیں کہ اللہ اُن کو اُن کے اعمال کا پورا اجر بھی دے اور اُن کے لیے اپنے فضل سے زیادہ بھی کرے۔ بے شک، اللہ بخشنے والا اور قبول فرمانے والا ہے۔[۱۲۴] (اِس طرح کے لوگ ہیں جو اِس دعوت کو قبول کریں گے،[۱۲۵] اِنھیں بتاؤ کہ) ہم نے جو کتاب تمھاری طرف

۱۲۳؎ آگے آیت ۳۲ میں بنی اسمٰعیل کے اخیار و اشرار کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے کہ ''پھر ہم نے اُنھیں اپنی کتاب کا وارث بنایا''۔ یہ اِس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر ہے، وہ اہل کتاب کے صالحین ہیں جن کے بعض گروہ قریب کے علاقوں سے مکہ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لائے۔

۱۲۴؎ یہ اُن کے انفاق کا محرک بتایا ہے اور وہ صلہ بھی بیان کر دیا ہے جو اُنھیں اُن کے پروردگار کی طرف سے ملنے والا ہے۔

۱۲۵؎ یعنی وہی جو اُس ہدایت کے قدر دان اور اُس پر عمل پیرا رہے جو اُن کے پاس پہلے سے موجود ہے۔

یَدَیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیۡرٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۳۱﴾
ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡهُمۡ
ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ ۚ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ

اتاری ہے، وہی حق ہے،[۱۲۶] اُن پیشین گوئیوں کی مصداق جو اُس سے پہلے موجود ہیں۔ بے شک، اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے[۱۲۷]۔ ۲۹-۳۱

(یہی حق اہل کتاب کے پاس بھی تھا، مگر اُنھوں نے اِس کی قدر نہیں کی)، پھر ہم نے اپنی کتاب کا وارث اُن لوگوں کو بنا دیا جنھیں اب ہم نے اپنے بندوں میں سے (اِس شرف کے لیے) منتخب کیا ہے[۱۲۸]۔ سو اُن میں سے کچھ تو اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے ہیں[۱۲۹] اور کچھ اُن میں سے بیچ کے راستے پر ہیں[۱۳۰] اور کچھ اللہ کی توفیق

۱۲۶؎ یعنی لفظ اور معنی، دونوں کے اعتبار سے باطل کے ہر شایبے سے پاک، جس کا خدا کی طرف سے اور خدا کی بات ہونا بالکل یقینی ہے۔

۱۲۷؎ یعنی اُن سے غیر متعلق نہیں ہے کہ اُنھیں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے اور اُن کی ہدایت کا کوئی اہتمام نہ کرے۔

۱۲۸؎ بنی اسمٰعیل مراد ہیں جن کے اندر خدا نے اپنا پیغمبر اپنے آخری عہد نامے کے ساتھ بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

۱۲۹؎ یعنی اُنھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ پیغمبر کی مخالفت کریں گے اور اِس شرف عظیم سے اپنے آپ کو محروم کر لیں گے، جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہ۔ یہ پہلا گروہ ہے۔

۱۳۰؎ یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو مخالف اور معاند تو نہیں ہے، لیکن آگے بڑھ کر اِس دعوت کو قبول کرنے اور اِس کی حمایت میں کھڑے ہو جانے کا حوصلہ بھی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اِن کے لیے آیت میں لفظ 'مُقۡتَصِد' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے قرآن نے امید دلائی ہے کہ

بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ

سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں[۱۳۱]۔ یہی بہت بڑا فضل ہے[۱۳۲]۔ اُن کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، اُنھیں وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور اُن کا لباس وہاں ریشم کا ہوگا[۱۳۳] اور وہ (یہ نعمتیں پا کر)

فاطر ۳۵

دیر سویر اِن کا تردد دور ہو جائے گا اور خدا نے چاہا تو یہ اِس نعمت عظمیٰ سے محروم نہیں رہیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اِن میں سے زیادہ بعد میں ایمان لے آئے۔

۱۳۱؎ یہ تیسرا گروہ ہے جسے قرآن نے دوسری جگہ 'السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'* بھی کہا ہے۔ اِس کے سرخیل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کا شعور اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہر دعوت حق اُن کو فوراً اپیل کرتی ہے اور اُن کی قوت ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جب اُن کو کوئی چیز اپیل کر لیتی ہے تو وہ اُس کی خاطر راہ کے تمام عقبات ایک ہی جست میں پار کر جاتے ہیں اور اُس کی حمایت یا مدافعت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے، بلکہ تمام رکاوٹوں کا پوری دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے ہر میدان میں گوے سبقت لے جانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔'' (تدبرقرآن ۳۸۵/۶)

۱۳۲؎ یہ نہایت بلیغ اسلوب میں دوسرے گروہ کے لیے دعوت ہے کہ ابھی موقع ہے، وہ بھی اِس فیض عظیم سے اپنا حصہ لے سکتے ہیں۔

۱۳۳؎ یہ سونے کے کنگن اور موتی اور ریشم، سب تقریب فہم کے لیے ہے کہ اُس زمانے کے سلاطین اور بادشاہوں کے رہن سہن کو تصور میں لا کر لوگ جنت کی نعمتوں کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

* التوبہ ۹: ۱۰۰۔

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۣ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ ۚ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ

فاطر
۳۵

کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہر طرح کا غم ہم سے دور کر دیا۔[۱۳۴] حقیقت یہ ہے کہ ہمارا پروردگار بخشنے والا، قبول فرمانے والا ہے، جس نے اپنے فضل سے ہمیں اِس ہمیشہ کی اقامت کے گھر میں اتارا ہے۔ اِس میں ہمیں اب نہ کوئی مشقت پہنچے گی اور نہ اِس میں ہمیں کبھی تکان لاحق ہو گی۔ ۳۲-۳۵

اِس کے برخلاف جنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے، اُن کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ نہ اُن کی قضا آئے گی کہ مر جائیں اور نہ اُس کا عذاب ہی اُن سے کچھ ہلکا کیا جائے گا کہ ذرا دم لے سکیں۔ ہر ناشکرے کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ وہ اُس میں چلائیں گے کہ اے ہمارے رب، ہم کو نکال لے، اب ہم نیک عمل کریں گے، ویسے نہیں، جیسے ہم (اِس سے پہلے) کیا کرتے تھے ـــــ کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہ دی تھی کہ جو یاددہانی حاصل کرنا چاہے، وہ اُس میں یاددہانی حاصل کر سکتا تھا اور

۱۳۴؎ یعنی اب نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا باقی رہا ہے اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ اللہ تعالیٰ نے سارے رنج و غم اور خوف اور اندیشے دور کر دیے ہیں۔

النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿٣٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٣٨﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿٣٩﴾

تمھارے پاس (خدا کی طرف سے) خبردار کرنے والا بھی آ گیا تھا؟[۱۳۵] سو اب چکھو اپنے کیے کا مزہ کہ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔ (لوگو، اللہ کے سامنے اُس وقت کسی بہانہ جوئی کا موقع نہ ہوگا)، اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ زمین اور آسمانوں کے ہر غیب کا جاننے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو سینوں میں چھپے ہوئے بھید بھی جانتا ہے۔ ۳۶-۳۸

وہی ہے جس نے تمھیں اِس سرزمین میں اگلوں کا جانشین بنایا ہے۔[۱۳۶] (اب چاہے، ماننے والے بنو یا انکار کرو)۔ پھر جس نے انکار کر دیا تو اُس کے انکار کا وبال اُسی پر ہے اور منکروں کے لیے اُن کا انکار اُن کے پروردگار کے نزدیک اُس کے غضب کو بڑھانے ہی کا باعث ہوتا ہے اور منکروں کے لیے اُن کا انکار اُن کے خسارے ہی میں اضافہ کرتا ہے۔ ۳۹

۱۳۵۔ اِس جواب سے واضح ہے کہ اوپر جو سزا بیان ہوئی ہے، وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو پختہ عمر کو پہنچے اور اُن پر کسی خبردار کرنے والے نے حجت بھی تمام کر دی۔ سن و سال کی پختگی کو پہنچنے سے پہلے جو لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے اور اُن پر اتمام حجت بھی نہیں ہوا، اُن کے لیے یقیناً عذر کا موقع ہوگا جو حق و عدل کے مطابق مسموع بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔

۱۳۶۔ یعنی عاد و ثمود اور دوسری قدیم اقوام کا جو بنی اسمٰعیل سے پہلے عرب میں آباد تھیں۔ سورہ کے خاتمے پر یہ اب اُن کو براہ راست خطاب کر کے متنبہ فرمایا ہے۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو سورہ کے فواصل بھی بدل گئے ہیں تاکہ متکلم کے لب و لہجے کی تبدیلی مخاطبین کو چونکائے

فاطر ۳۵

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰي بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ۬ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

فاطر ۳۵

اِن سے کہو، ذرا تم دیکھو تو اپنے اُن شریکوں کو جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ اُنھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے؟ یا آسمانوں کے بنانے میں اُن کی کوئی حصہ داری ہے؟ یا ہم نے اُن کو کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اُس کی کوئی واضح دلیل رکھتے ہیں[۱۳۷]؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے صرف دھوکے کی باتوں کا وعدہ کر رہے ہیں[۱۳۸]۔ ۴۰

(تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی گرفت سے تمھیں بچا لیں گے)؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی زمین اور آسمانوں کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں اور بالفرض وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا اُن کو تھامنے والا نہیں ہے۔ (تم اِن کے اندر

اور وہ پوری طرح بیدار ہو کر اُس کی بات سنیں۔

۱۳۷؎ یعنی ایسی کوئی دلیل کہ خود ہم نے اُس کتاب میں تسلیم کر رکھا ہے کہ فلاں اور فلاں ہماری خدائی میں شریک ہے۔

۱۳۸؎ یعنی اِس طرح کی باتوں کا وعدہ کہ فلاں اور فلاں ہستیوں کا دامن تھام لوگے تو دنیا میں بھی تمھارے کام بن جائیں گے اور آخرت میں بھی چاہے جتنے گناہ سمیٹ کر لاؤ گے، وہ اُن کو خدا سے بخشوا لیں گے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ۙ﴿۴۲﴾ اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ

اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہو تو یہ اُس کی دی ہوئی مہلت ہے)، اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بڑا حلیم اور درگذر فرمانے والا ہے۔ ۱۳۸

یہ (اِس سے پہلے) خدا کی کڑی کڑی قسمیں کھاتے رہے کہ اگر اِن کے پاس کوئی خبردار کرنے والا آیا تو یہ دوسری ہر قوم سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے۔[۱۳۹] پھر جب اِن کے پاس ایک خبردار کرنے والا آ گیا تو زمین میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے[۱۴۰] اُس کے آنے نے اِن کی بے زاری اور اِن کی بری چالوں کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔ اور بری چال تو (بالآخر) اُسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے۔ سو اب یہ اُسی سنت کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں جو اگلوں کے لیے ظاہر ہوئی تھی۔[۱۴۱]

۱۳۹۔ بنی اسمٰعیل یہ بات یہود کے جواب میں کہتے ہوں گے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اُن کے ہاں بھی یہ روایت موجود تھی کہ اُن کے اندر ایک رسول کی بعثت ہونے والی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ روایت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانے سے چلی آ رہی ہو یا نصاریٰ کے ذریعے سے اُن تک پہنچی ہو جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ امیوں کے اندر ایک رسول کی بعثت کے منتظر تھے۔

۱۴۰۔ یہ رسول سے اُن کی بے زاری کا سبب بیان ہوا ہے کہ سرزمین عرب میں یہ محض اپنی بڑائی اور سیادت کا زعم تھا جس کی بنا پر وہ اِس انتہا تک پہنچ گئے۔

۱۴۱۔ اِس جملے میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ الفاظ حذف کر دیے گئے

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿٤٤﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰي ظَهْرِهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ

فاطر ۳۵

(یہی بات ہے) تو تم خدا کی اُس سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور نہ خدا کی اُس سنت کو کبھی ٹلتا ہوا دیکھو گے۔ کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں، دراں حالیکہ وہ قوت میں اِن سے کہیں بڑھ کر تھے؟ (لوگو)، کوئی چیز ایسی نہیں کہ خدا کو عاجز کر دے، نہ زمین میں اور نہ آسمانوں میں۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، بڑی قدرت والا ہے۔ ۴۲-۴۴

(لہٰذا ایک دن یہ بھی پکڑے جائیں گے) لوگوں کو اُن کے اعمال پر اگر اللہ فوراً[۱۴۲] پکڑتا تو زمین کی پشت پر کسی جان دار کو باقی نہ چھوڑتا، مگر وہ اُنھیں ایک مقرر مدت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب اُن کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو لازماً پکڑتا ہے،

ہیں۔ اُنھیں کھول دیجیے تو پوری عبارت اِس طرح ہے: 'فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ اللّٰهِ فِي الْاَوَّلِيْنَ'۔

۱۴۲؎ یہاں 'عَلٰي عَجَلٍ' یا اِس کے ہم معنی الفاظ اصل میں محذوف ہیں۔ یہ اُنھی کا ترجمہ ہے۔ آگے 'وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ' کے الفاظ سے اُن کی وضاحت ہوگئی ہے۔

فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

اِس لیے کہ اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے[۱۴۳]۔ ۴۵

۱۴۳؎ یعنی اُن سے غیر متعلق ہو کر نہیں بیٹھ گیا ہے کہ جو چاہے کرتے رہیں اور اُسے اُن کی کوئی خبر نہ ہو۔ وہ اُن کو دیکھنے والا ہے کہ اُن میں سے کون کیا کر رہا ہے اور کس پاداش کا مستحق ہے۔

کوالالمپور

۳ر مئی ۲۰۱۴ء

مرحلۂ اتمام حجت

یٰس - ص

٣٦ — ٣٨

یٰس
۳۶

یٰسٓ

یہ ایک منفرد سورہ ہے جس سے اِس باب میں اتمام حجت کی ابتدا ہو رہی ہے۔ اِس کے اور پچھلی دونوں سورتوں کے مضمون میں اِس کے سوا کوئی خاص فرق نہیں ہے کہ اسلوب بیان میں تنبیہ و تہدید، ملامت اور زجر و توبیخ کی شدت نمایاں ہو گئی ہے۔ اِس لحاظ سے یہ اگلی دونوں سورتوں کے لیے گویا اُس مضمون کی تمہید ہے جو اُن میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

اِس کے مخاطب قریش کے متکبرین ہیں اور اِس کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہے۔

سورة یٰس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰسٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ﴿۳﴾ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ؕ﴿۴﴾ تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۵﴾ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'یٰسٓ' ہے[1]۔ یہ سراسر حکمت قرآن گواہ ہے کہ یقیناً تم رسولوں میں سے ہو[2]، ایک نہایت سیدھی راہ پر[3]۔ یہ پورے اہتمام کے ساتھ اُس ہستی کی طرف سے اتارا گیا ہے جو زبردست ہے، جس کی شفقت ابدی ہے[4]۔ اِس لیے اتارا گیا ہے

---

[1] اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق ہم نے اپنا نقطۂ نظر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

[2] اِس لیے کہ ایسا حکیمانہ اور معجز کلام صرف خدا کا رسول ہی پیش کر سکتا ہے جس میں خدا بولتا ہوا نظر آئے، جو اُن حقائق کو واضح کرے جن کا واضح ہونا انسانیت کی شدید ضرورت ہے اور وہ کسی انسان کے کلام سے کبھی واضح نہیں ہوئے، جو اُن معاملات میں رہنمائی کرے جن میں رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ ایک ایسا کلام جس کے حق میں وجدان گواہی دے، علم و عقل کے مسلمات جس کی تصدیق کریں، جو ویران دلوں کو اِس طرح سیراب کر دے، جس طرح مردہ زمین کو بارش سیراب کرتی ہے، جس میں وہی شان، وہی حسن بیان، وہی فصاحت و بلاغت اور وہی تاثیر ہو جو قرآن کا پڑھنے والا، اگر اُس کی زبان سے واقف ہو تو اُس کے لفظ لفظ میں محسوس کرتا ہے۔

[3] اصل الفاظ ہیں: 'عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ'۔ یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے جو حرف عطف

مَآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝٦ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ

کہ تم اُن لوگوں کو خبردار کرو جن کے اگلوں کو خبردار نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا غفلت میں پڑے ہوئے ہیں[5]۔ اُن میں سے بہتوں پر ہماری بات پوری ہو چکی ہے[6]، سو وہ

کے بغیر آگئی ہے، اِس لیے کہ قرآن کی شہادت یہاں بہ یک وقت دونوں باتوں پر پیش کی گئی ہے، اِس پر بھی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اِس پر بھی کہ آپ صراط مستقیم پر ہیں۔ ہم نے ترجمے میں اِسے ملحوظ رکھا ہے۔

[4] آیت میں لفظ 'تَنْزِيْل' کا نصب فعل محذوف سے ہے اور یہ جس ہستی کی طرف سے ہے، اُس کی دو صفتوں کا حوالہ دیا گیا ہے: ایک 'عَزِيْز'، دوسری 'رَحِيْم'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِن میں ایک صفت انذار کے لیے ہے اور دوسری بشارت کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اِس کی تکذیب کریں گے، وہ یاد رکھیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں، بلکہ ایک عزیز و مقتدر کا فرمان واجب الاذعان ہے جو سرکشی کرنے والوں کو لازماً سزا دے گا۔ ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اور اپنی اِس رحمت ہی کے لیے اُس نے یہ کتاب اتاری ہے تو جو اللہ کے بندے اِس قرآن کی قدر کریں گے، اُن کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔" (تدبر قرآن ۶/۴۰۱)

[5] یہ اشارہ بنی اسمٰعیل کی طرف ہے جن کے پاس پچھلے ڈھائی ہزار سال میں کوئی رسول نہیں آیا تھا۔

[6] یعنی وہ بات جو ہم نے ابلیس کے جواب میں کہی تھی کہ جو تیری پیروی کریں گے، خواہ جن ہوں یا انسان، اُن سے میں جہنم کو بھر دوں گا۔ قرآن میں نقل ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اُس وقت فرمائی تھی، جب ابلیس نے یہ دھمکی دی تھی کہ میں آدم کے بیٹوں کی اکثریت کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٧ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى
الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝٨ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا
وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝٩ وَسَوَآءٌ
عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠ اِنَّمَا تُنْذِرُ
مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ
وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝١١ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا

البیان

ایمان نہیں لائیں گے۔ (وہ ایسے متکبر ہیں کہ) اُن کی گردنوں میں ہم نے گویا طوق ڈال دیے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں، سو اُن کے سر اٹھے رہ گئے ہیں[ے]۔ ہم نے اُن کے آگے بھی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور اُن کے پیچھے بھی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ اِس طرح ہم نے اُن کو ڈھانک دیا ہے تو اُنھیں اب کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اُن کے لیے برابر ہے، تم اُنھیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ نہیں مانیں گے۔ تم تو، (اے پیغمبر)، صرف اُنھی کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت پر چلیں اور بن دیکھے خداے رحمٰن سے ڈریں۔ سو اِس طرح کے لوگوں کو مغفرت کی اور (خدا کی طرف سے) باعزت صلے کی بشارت دو۔ یقیناً ہم ہی (ایک دن) مردوں کو زندہ کریں گے اور (اُن کے حساب میں بھی ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، اِس لیے کہ) اُنھوں

ے یعنی گردنیں ایسی تنی ہوئی ہیں کہ اوپر نیچے اور دائیں بائیں کوئی حقیقت دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ متکبرین کی تصویر ہے۔ اِسی طرح کے لوگ ہیں جو اعتراف حق کی سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے جاتے ہیں اور یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوتا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر کی گئی ہے۔ اِن کی اِس حالت کو اللہ تعالیٰ نے اِسی بنا پر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

وَاٰثَارَهُمْ ۭ وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْیَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ۚ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَیْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ

نے جو کچھ آگے بھیجا اور جو کچھ اُنھوں نے پیچھے چھوڑا ہے، وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں درج کر لی ہے۔[۸] ۱-۱۲

اِنھیں بستی والوں[۹] کی مثال سناؤ، جب کہ اُن کے پاس رسول آئے تھے۔[۱۰] (اِس طرح کہ) جب ہم نے دو رسول اُن کے پاس بھیجے[۱۱] تو اُنھوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے ایک تیسرے شخص[۱۲] سے اُن کی تائید کی تو اُنھوں نے لوگوں سے کہا: کچھ شک

۸؎ یہ تہدید کے لیے فرمایا ہے کہ کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی وسیع دنیا اور اتنے بے شمار انسانوں کے اعمال کا حساب کون کرے گا اور کس طرح کرے گا؟

۹؎ قرآن نے بستی کا نام نہیں لیا، لیکن آگے کے اشارات دلیل ہیں کہ اِس سے مراد مصر ہے جس کی سرگذشت قریش کی عبرت پذیری کے لیے قرآن میں متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِن اشارات کی تفصیل کر دی ہے۔

۱۰؎ یعنی اُسی طرح، جیسے اب اِن کی طرف خدا کا رسول آیا ہے۔

۱۱؎ اِس سے، ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام مراد ہیں۔ اِن کے علاوہ انبیا و رسل کی معلوم تاریخ میں دو رسول بہ یک وقت کسی قوم کی طرف نہیں بھیجے گئے۔

۱۲؎ اِن کا ذکر جس طریقے سے یہاں ہوا ہے، اُس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رسول نہیں تھے، بلکہ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح رسولوں کے ایک خاص مددگار کی حیثیت سے اُن کی حمایت میں کھڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ جس طرح وہ 'ثانی اثنین' تھے، اُسی طرح یہ بھی 'ثالث ثلثة'

مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿١٥﴾
قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿١٦﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا

نہیں کہ ہم تمھارے پاس بھیجے ہوئے آئے ہیں[۱۳]۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو اور خداے رحمٰن نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم محض جھوٹ بول رہے ہو۔ ۱۳-۱۵

رسولوں نے کہا: ہمارا رب گواہ ہے کہ یقیناً ہم تمھارے پاس بھیجے ہوئے آئے ہیں

یٰسٓ ۳۶

تھے۔ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی سرگذشت انذار میں یہ حیثیت صرف مصر کے شاہی خاندان کے اُس مرد جلیل کو حاصل ہے جس کی ایک بے نظیر تقریر سورۂ مومن (۴۰) کی آیات ۲۶-۴۵ میں نقل ہوئی ہے۔ قرآن نے اِن کے لیے 'عَزَّزْنَا' کا جو لفظ استعمال کیا ہے، اُس کی صحیح کیفیت اُسی تقریر سے واضح ہوتی ہے اور اُسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اِن کا مرتبہ و مقام کیا تھا اور انھوں نے مصر کے دارالامرا میں فرعون کے سامنے کس نازک موقع پر، کس جرأت اور بے خوفی اور کیسے پرزور دلائل کے ساتھ حق کی حمایت کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انبیا و صدیقین کی تاریخ کے سوا اِس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اِن کا یہی وہ شان دار اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس کی بنا پر اِن کا ذکر یہاں 'فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ اِس معنی میں تو رسول نہیں تھے، جس معنی میں حضرت موسیٰ و حضرت ہارون رسول تھے، لیکن اُن کے سب سے زیادہ طاقت ور، سب سے زیادہ جاں نثار اور سب سے بڑے وفادار اور راست باز ساتھی ضرور تھے، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِن کو تین کے تیسرے کا درجہ دیا۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۴۱۳)

۱۳؎ یہ 'علی سبیل التغلیب' فرمایا ہے۔ گویا حق کی تائید میں جس مقام پر وہ مرد حق کھڑا ہو گیا تھا، اُس کے بعد اگر اُسے بھی خدا کا بھیجا ہوا کہا جائے تو یہ کچھ غلط نہ ہوگا۔

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٧﴾ قَالُوْۤا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٨﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿١٩﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا

اور ہمارے اوپر اِس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ صاف صاف پہنچا دیں۔[14] لوگوں نے کہا: ہم تو تمھیں منحوس سمجھتے ہیں۔[15] اگر تم لوگ باز نہ آئے تو ہم تمھیں سنگ سار کر چھوڑیں گے اور ہماری طرف سے ضرور تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے۔ رسولوں نے جواب دیا: تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے۔[16] کیا اتنی بات پر کہ تمھیں یاددہانی کی گئی ہے؟ نہیں، بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶-۱۹

(یہی موقع تھا، جب خدا نے تیسرے سے تائید فرمائی۔ اِس طرح کہ) شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا[17] (اور آکر) کہنے لگا کہ میری قوم کے لوگو،

۱۴؎ مطلب یہ ہے کہ اِس کے بعد ہم تو اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے۔ اُس کو ماننا یا نہ ماننا، یہ تمھاری ذمہ داری ہے اور اُس کے نتائج بھی تمھیں ہی بھگتنا ہوں گے۔

۱۵؎ سورۂ اعراف (۷) میں وضاحت ہے کہ مصر کے لوگوں نے یہ بات اُس وقت کہی، جب موسیٰ علیہ السلام کی دعوت برپا ہو جانے کے بعد اُنھیں پے درپے آفتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ آفتیں اُن کی تنبیہ کے لیے نازل کی گئی تھیں، مگر اُنھوں نے اِن کو حضرت موسیٰ اور اُن کے ساتھیوں کی نحوست قرار دے دیا۔

۱۶؎ یعنی جو کچھ پیش آرہا ہے، تمھارے اپنے ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اگر کوئی نحوست ہے تو وہ تمھاری اپنی ہے جو تمھیں لاحق ہو گئی ہے۔ رسولوں کا یہ جواب مجانست کے اسلوب پر ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٠﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٢﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿٢٣﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٤﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿٢٥﴾ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ

رسولوں کی پیروی کرو۔ اُن لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور راہ راست پر بھی ہیں۔ (تم مجھے بھی برگشتہ کرنا چاہتے ہو؟ مگر میں تم سے پوچھتا ہوں کہ) میں اُس ہستی کی بندگی کیوں نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور اُسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے؟ کیا میں اُس کے سوا دوسروں کو معبود بنا لوں؟ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو اُن کی سفارش میرے کچھ بھی کام نہ آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے۔ ایسا کروں تو کچھ شک نہیں کہ پھر تو میں کھلی گم راہی میں جا پڑوں گا۔ میں تمھارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں تو تم بھی میری بات سنو۔[18] ــــــ ارشاد ہوا:

۱۷ـ اوپر جس تین کے تیسرے کا ذکر ہوا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی تائید کے لیے یہ اُس کی سرگرمی کی تصویر ہے۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا گھر شہر کے کسی بعید کنارے پر تھا، مگر اُنھیں جب معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کو خطرہ درپیش ہے تو وہ بھاگ کر وہاں پہنچے اور شاہی خاندان کا ایک فرد ہونے کے باوجود اپنے تمام مفادات، بلکہ اپنی جان تک کو خطرے میں ڈال کر اُن کی تائید اور حق کی شہادت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

۱۸ـ مطلب یہ ہے کہ مجھے اِس راہ سے ہٹانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے میری بات پر دھیان کرو اور وہ بات تسلیم کر لو جس کو تم بھی جانتے ہو کہ حق ہے۔

قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾
وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِہٖ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ
وَ مَا کُنَّا مُنۡزِلِیۡنَ ﴿۲۸﴾ اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ہُمۡ
خٰمِدُوۡنَ ﴿۲۹﴾ یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۚ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا

جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اُس نے (یہ بشارت سنی تو) کہا: یہ جو میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت والوں میں شامل کیا ہے، اے کاش، میری قوم اِسے جان لیتی![19] ۲۰-۲۷

اُس کی قوم پر اُس کے بعد[20] ہم نے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور (اِس طرح کے کاموں کے لیے) ہم اتارا بھی نہیں کرتے۔ وہ ایک ڈانٹ ہی تھی اور دفعتاً وہ بجھ کر رہ گئے[21] ـــــ افسوس بندوں پر، اُن کے پاس جو رسول بھی آیا، وہ اُس کا

۱۹؎ یہ بشارت غالباً اُن کی وفات کے وقت اُنھیں دی گئی۔ آگے 'مِنۡۢ بَعۡدِہٖ' کے الفاظ سے اِس کی تائید ہوتی ہے۔

۲۰؎ یعنی اُس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد۔

۲۱؎ یعنی آسمان سے فرشتوں کی کوئی فوج نہیں اتارنی پڑی، بلکہ ایک ڈانٹ ہی کافی ہو گئی۔ یہ اُس عذاب کا حوالہ ہے جو فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کی غرقابی کے بعد اہل مصر پر آیا۔ سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۳۷ میں قرآن نے اِس کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... ہرچند یہ عذاب اصلاً حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کی تکذیب کے نتیجے میں آیا، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اِس کو اُس بندۂ مومن کی تکذیب کے نتیجے کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اِس سے رسول کے ساتھیوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اُن کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ اُن کی تکذیب رسول کی تکذیب کے ہم معنی بن جاتی ہے اور اُس کا وہی انجام ہوتا ہے جو رسول کی تکذیب کا ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۴۱۸)

كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۳۲﴾

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَيۡتَةُ ۚۖ اَحۡيَيۡنٰهَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ يَاۡكُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِيۡهَا مِنَ الۡعُيُوۡنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاۡكُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتۡهُ

یٰس ۳۶

مذاق ہی اڑاتے رہے ہیں۔ (تمھارے مخاطبین بھی، اے پیغمبر، اِس وقت یہی کر رہے ہیں)۔ کیا اِنھوں نے دیکھا نہیں کہ اِن سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا کہ اِن کے لوگ، اب اِن کی طرف کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور کچھ شک نہیں کہ (ایک دن) یہ سب ہمارے ہی حضور میں اکٹھے حاضر کیے جائیں گے۔[۲۲] ۲۸-۳۲

(یہ نشانیاں مانگتے ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن کے لیے مردہ زمین ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم نے (آسمان سے پانی برسا کر) اُس کو زندہ کیا اور اُس سے غلہ اگایا کہ یہ اُس میں سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُس میں لگائے اور اُس میں چشمے نکال کر بہائے کہ یہ اُس کے پھل کھائیں[۲۳] ——— یہ اِن کے

۲۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَ اِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ'۔ اِن میں 'اِنْ' درحقیقت 'اِنَّ' ہے، جس میں تخفیف ہوگئی ہے اور 'لَ' کے بجائے 'لَمَّا' اشباع کے اصول پر محض آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے آگیا ہے۔

۲۳؎ یعنی زمین کے پھل۔ آیت میں اِس کے لیے ضمیر مذکر 'علیٰ سبیل التاویل' آئی ہے۔ یہ اِس بات کا اشارہ ہے کہ اِس سے 'بلد طیب' مراد ہے۔ اِس لیے کہ یہاں زمین کی بارآوری کا ذکر مقصود ہے اور یہ زرخیز زمین ہی سے متوقع ہوسکتی ہے۔

اَیۡدِیۡهِمۡ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

وَ اٰیَۃٌ لَّهُمُ الَّیۡلُ ۚۖ نَسۡلَخُ مِنۡهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمۡ مُّظۡلِمُوۡنَ ﴿ۙ۳۷﴾

وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿ؕ۳۸﴾

وَ الۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ ﴿۳۹﴾

ہاتھوں نے نہیں بنائے ہیں۔ پھر کیا شکر نہیں کرتے! ۳۳-۳۵

پاک ہے وہ ذات[۲۴] جس نے سب جوڑے بنائے، اُن چیزوں کے بھی جنھیں زمین اگاتی ہے اور خود اِن لوگوں کے اندر سے بھی اور اُن چیزوں کے بھی جنھیں یہ جانتے نہیں ہیں[۲۵]۔ ۳۶

اور اِن کے لیے رات بھی بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم اُس سے دن کو کھینچ کر نکال لیتے ہیں تو دیکھتے دیکھتے وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ سورج (اِسی مقصد سے) اپنے ایک مقرر راستے پر چلتا ہے۔ یہ خداے عزیز و علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لیے (اِسی کے پیش نظر) ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ (اِن سے گزرتا ہوا)

۲۴۔ یعنی اِس بات سے پاک کہ اُس کا کوئی شریک و سہیم ہو یا اُس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ اُس نے یہ دنیا بغیر کسی مقصد کے بنا دی ہے۔

۲۵۔ چنانچہ دیکھتے ہو کہ اِس تنوع اور گونا گونی کے باوجود اِن جوڑوں کے اندر مقصد کی کیسی ہم آہنگی اور توافق کی کیسی سازگاری ہے۔ یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اِس کائنات میں ایک ہی خداے لاشریک کا ارادہ کار فرما ہے، اِس میں کسی دوسرے کے لیے دخل اندازی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

لَا الشَّمۡسُ يَنۡۢبَغِیۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾
وَاٰيَةٌ لَّهُمۡ اَنَّا حَمَلۡنَا ذُرِّيَّتَهُمۡ فِی الۡفُلۡكِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۴۱﴾ ۙ
وَخَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ مَا يَرۡكَبُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡهُمۡ فَلَا صَرِيۡخَ

وہ ایک مرتبہ پھر کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو کے رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ سب ایک ایک مدار میں گردش کر رہے ہیں[۲۶]۔ ۳۷-۴۰

اور اِن کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اِن کی نسل کو[۲۷] ہم نے اِن سے بھری ہوئی کشتیوں میں اٹھا رکھا ہے اور کشتی کے مانند اِن کے لیے (خشکی میں سفر کی) چیزیں بھی ہم نے پیدا کر دی ہیں[۲۸] جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو

۲۶؎ اور اِس طرح گواہی دے رہے ہیں کہ اِن کے پیچھے ایک قاہر و مقتدر اور علیم و حکیم ہستی ہے جس نے ہر چیز کو اپنے بنائے ہوئے نقشے اور اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق کام میں لگا رکھا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ اِس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اِس کائنات کی ہر چیز کی باگ ایک ہی خدائے قدیر و علیم کے ہاتھ میں ہے اور وہی تنہا ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ اگر اُس کے سوا کسی اور کا بھی اِس میں کوئی دخل ہوتا تو یہ دنیا اپنے اضداد کے تصادم میں تباہ ہو جاتی۔ خاص طور پر یہ حقیقت تو بالکل نمایاں ہے کہ جو چیزیں جتنی ہی زیادہ نمایاں ہیں اور جن کے نمایاں ہونے ہی کی بنا پر قوموں نے اُن کو معبود مان کر اُن کی پرستش کی، وہ اپنے وجود ہی سے یہ اعلان کر رہی ہیں کہ وہ سب سے زیادہ مسخر و محکوم ہیں، مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ کار سے ایک انچ بھی اِدھر یا اُدھر سرک سکیں۔'' (تدبر قرآن ۶/۴۲۶)

۲۷؎ یعنی اِن کے ابنائے نوع کو۔ اِس سے بنی آدم مراد ہیں۔

۲۸؎ یعنی گھوڑے اور اونٹ وغیرہ۔ اِس زمانے میں جو نئی سواریاں ایجاد ہوئی ہیں، اُن کو

لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنقَذُونَ ﴿٤٣﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٤٤﴾
وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُونَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا
عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٤٦﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ
قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ

اِن کو غرق کر دیں، پھر نہ کوئی اِن کی فریاد سننے والا ہو اور نہ یہ بچائے جا سکیں۔ مگر یہ ہماری رحمت ہے اور اِن کو ایک معین وقت تک بہرہ مند کرنا (منظور) ہے۔ ۴۱-۴۴

اِنھیں جب متنبہ کیا جاتا ہے کہ تمھارے آگے اور تمھارے پیچھے جو (زمین و آسمان تمھیں گھیرے ہوئے)[29] ہیں، اُن سے ڈرو[30]، اِس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے تو سنی ان سنی کر دیتے ہیں[31]۔ اور اِن کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی اِن کے پاس آتی ہے، اُس سے اعراض ہی کرتے ہیں۔ اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمھیں بخشا ہے، اُس میں سے (اُس کی راہ میں) خرچ کرو تو یہ لوگ جنھوں نے (پیغمبر کا) انکار کر دیا ہے، ماننے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم اُن لوگوں کو کھلائیں

بھی اِسی حکم میں سمجھیے۔

۲۹؎ اصل میں یہ الفاظ محذوف ہیں۔ سورۂ سبا (۳۴) کی آیت ۹ میں قرآن نے اِنھیں کھول دیا ہے۔

۳۰؎ اِس لیے کہ زمین تمھارے سمیت کہیں دھنسا نہ دی جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں۔

۳۱؎ یہ 'اِذَا' کا جواب ہے جو آیت میں بر بنائے قرینہ حذف کر دیا گیا ہے۔

اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۷﴾
وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۸﴾
مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً تَاۡخُذُہُمۡ وَ ہُمۡ یَخِصِّمُوۡنَ ﴿۴۹﴾
فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ تَوۡصِیَۃً وَّ لَاۤ اِلٰۤی اَہۡلِہِمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۵۰﴾

جنھیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم لوگ تو صریح گم راہی میں پڑے ہو۔[۳۲] ۴۵-۴۷

پوچھتے ہیں کہ اچھا، (ہم پر عذاب کی) یہ دھمکی کب پوری ہو گی، اگر تم لوگ سچے ہو؟ یہ لوگ ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو اِنھیں آپکڑے گی[۳۳] اور یہ جھگڑتے رہ جائیں گے۔ پھر نہ کوئی وصیت کر پائیں گے اور نہ اپنے لوگوں کی طرف لوٹ سکیں گے۔ ۴۸-۵۰

۳۲۔ اِس لیے کہ ہمیں ایک ایسا کام کرنے کے لیے کہہ رہے ہو جسے خود خدا نے کرنا پسند نہیں کیا، دراں حالیکہ اُس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ قرآن نے اِس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس لیے کہ اِس کی قساوت و سفاہت اِس قدر واضح ہے کہ اِس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں تھی۔ مقصود بس یہ دکھانا ہے کہ جب دل بگڑتے ہیں اور عقل الٹتی ہے تو آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/۴۲۸)

۳۳۔ مطلب یہ ہے کہ اِن کے اِس مطالبے کو پورا کرنے کے لیے کسی بڑے اہتمام اور تیاریوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کی ایک ڈانٹ ہی کافی ہو گی جس سے یہ تمام کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور جو جہاں ہے، وہیں سے دبوچ لیا جائے گا۔ یہ خدا کی رحمت و عنایت ہے کہ وہ اِنھیں مہلت دے رہا ہے۔ ایسی احمقانہ باتوں کے بجائے اِنھیں اِس مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٢﴾ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ

اور (اِسی طرح ایک دن) صور پھونکا جائے گا[۳۴] تو یکایک قبروں سے نکل نکل کر یہ اپنے پروردگار کی طرف چل پڑیں گے۔ (اُس وقت) کہیں گے: ہائے ہماری بدبختی! یہ ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا دیا ہے؟ یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے (تم سے) وعدہ کیا تھا اور (دیکھ لو کہ) پیغمبروں نے بالکل سچی بات کہی تھی۔[۳۵] وہ بھی ایک ڈانٹ ہی ہوگی اور یکایک یہ سب کے سب ہمارے حضور میں حاضر کر دیے جائیں گے۔[۳۶] ۵۱-۵۳

سو آج کے دن[۳۷] کسی شخص پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور تم کو وہی بدلے میں ملے گا جو

۳۴۔ اِس کی حقیقت کو جاننا تو کسی کے لیے ممکن نہیں ہے، اِس لیے کہ اِس کا تعلق امور متشابہات سے ہے۔ تاہم جو لفظ اِس کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اِس کا کچھ تصور اُس سے قائم ہو جاتا ہے۔ پرانے زمانوں میں شاہی جلوس یا اعلان جنگ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ عربی زبان میں اُسی کو 'صُوْر' کہتے ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی کوئی چیز پہلے قیامت برپا کرنے اور پھر مردوں کو قبروں سے اٹھانے کے لیے پھونکی جائے گی۔

۳۵۔ اُن کی تفضیح و تذلیل کے لیے یہ بات غالباً فرشتوں کی زبان سے کہی جائے گی۔

۳۶۔ یعنی اُسی طرح حاضر کر دیے جائیں گے، جیسے مجرم حاضر کیے جاتے ہیں۔

۳۷۔ یہ تصویر حال کا اسلوب ہے۔ گویا وہ دن سامنے ہے اور مخاطبین کو اُس کے احوال سنائے جا رہے ہیں۔

تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ الۡیَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فٰکِہُوۡنَ ﴿ۚ۵۵﴾ ہُمۡ وَ اَزۡوَاجُہُمۡ فِیۡ ظِلٰلٍ عَلَی الۡاَرَآئِکِ مُتَّکِـُٔوۡنَ ﴿۵۶﴾ لَہُمۡ فِیۡہَا فَاکِہَۃٌ وَّ لَہُمۡ مَّا یَدَّعُوۡنَ ﴿ۚۖ۵۷﴾ سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ ﴿۵۸﴾ وَ امۡتَازُوا الۡیَوۡمَ اَیُّہَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمۡ اَعۡہَدۡ اِلَیۡکُمۡ یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ ۚ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿ۙ۶۰﴾ وَّ اَنِ

کرتے رہے ہو۔ بے شک، جنت کے لوگ آج اپنی دل چسپیوں[۳۸] میں مگن ہوں گے۔ وہ اور اُن کی بیویاں سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔[۳۹] اُن کے لیے وہاں میوے ہوں گے اور جو مانگیں گے، اُن کے لیے حاضر ہوگا۔ اُنھیں سلام کہلایا جائے گا، اُس پروردگار کی طرف سے جس کی شفقت ابدی ہے۔[۴۰] ۵۴-۵۸

اور تم، اے مجرمو، آج (میرے اِن بندوں سے) چھٹ کر الگ ہو جاؤ۔ (اب تمھاری دنیا الگ اور اِن کی دنیا الگ ہے)۔ آدم کے بیٹو، کیا میں نے تمھیں پابند نہیں کر دیا تھا[۴۱] کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، اِس لیے کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے اور یہ بھی کہ

۳۸؎ اصل میں لفظ 'شُغُل' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے۔

۳۹؎ یعنی اُسی طرح، جیسے بادشاہ بیٹھتے ہیں۔

۴۰؎ آیت میں مبتدا محذوف ہے جس سے مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ اُس سب سے بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جس کا ایک بندۂ مومن اپنے لیے تصور کر سکتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، کون اندازہ کر سکتا ہے اہل جنت کی اِس سرفرازی کا کہ اُن کو رب رحیم و کریم کی طرف سے سلام و پیغام موصول ہوں گے:

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

۴۱؎ آیت میں 'عَھِد' کے ساتھ 'اِلٰی' ہے جس سے پابند کرنے یا ذمہ دار بنانے کے معنی

اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ ہٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ﴿۶۱﴾ وَ لَقَدۡ اَضَلَّ مِنۡکُمۡ جِبِلًّا کَثِیۡرًا ؕ اَفَلَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۲﴾ ہٰذِہٖ جَہَنَّمُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾ اِصۡلَوۡہَا الۡیَوۡمَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۶۴﴾

اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاہِہِمۡ وَ تُکَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ تَشۡہَدُ اَرۡجُلُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۶۵﴾

وَ لَوۡ نَشَآءُ لَطَمَسۡنَا عَلٰۤی اَعۡیُنِہِمۡ فَاسۡتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۶۶﴾ وَ لَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰہُمۡ عَلٰی مَکَانَتِہِمۡ فَمَا

میری ہی بندگی کرنا؟ یہی سیدھا راستہ ہے۔ اِس کے باوجود اُس نے تم میں سے ایک گروہ کثیر کو گم راہ کر دیا ہے۔ پھر کیا تم سمجھتے نہیں تھے؟ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا تھا۔ اب اِس میں داخل ہو جاؤ، اپنے کفر کی پاداش میں۔ ۵۹-۶۴

آج ہم اِن کے مونھوں پر مہر لگا دیں گے[۴۲] اور اِن کے ہاتھ ہمیں بتائیں گے اور اِن کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵

اگر ہم چاہتے[۴۳] تو اِن کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر یہ راستے کی طرف بڑھتے تو کہاں سے دیکھتے؟ اور اگر ہم چاہتے تو اِن کی جگہ ہی پر اِن کو مسخ کر دیتے، پھر نہ

اُس میں پیدا ہو گئے ہیں۔

۴۲؎ اِس لیے کہ زبانیں جھوٹ بھی بول سکتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسلوب کلام غائب کا ہو گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ بے بسی کی تصویر کے لیے یہی اسلوب زیادہ موزوں ہے۔

۴۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَوۡ نَشَآءُ'۔ اِس میں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے، یعنی 'وَلَوۡ کُنَّا نَشَآءُ'۔

یٰسٓ ۳۶

اسۡتَطَاعُوۡا مُضِیًّا وَّلَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَکِّسۡهُ فِی الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾

وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لَهٗ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّقُرۡاٰنٌ

آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔[۴۴] (کیا دیکھتے نہیں کہ) جس کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں، اُس کی خلقت میں درجہ بدرجہ اُس کو پیچھے لوٹا دیتے ہیں[۴۵]۔ پھر کیا سمجھتے نہیں ہیں؟ ۶۶-۶۸

(تم اِسے شاعری کہتے ہو)[۴۶]؟ ہم نے اپنے پیغمبر کو شاعری نہیں سکھائی اور یہ اُس کے شایان شان بھی نہیں ہے۔[۴۷] یہ تو صرف ایک یاددہانی[۴۸] اور ایک واضح قرآن[۴۹] ہے

۴۴؎ مطلب یہ ہے کہ اپنے جرائم کے لحاظ سے تو یہ اِسی کے مستحق تھے، لیکن ہماری عنایت ہے کہ اِس کے باوجود ہم نے اِنھیں مہلت دے رکھی ہے۔

۴۵؎ یعنی پھر اُسی ضعف و ناتوانی کی حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں جس سے اُس نے زندگی کی ابتدا کی تھی۔ اوپر جو دھمکی دی گئی ہے، یہ اُس کی دلیل ہے جو قرآن نے ہمارے روز و شب کے مشاہدات سے پیش فرمائی ہے کہ جو خدا یہ کرتا ہے، اُس کے لیے تمھاری آنکھیں مٹا دینا یا تم کو مسخ کر دینا کیا مشکل ہے۔

۴۶؎ قرآن کے مخالفین جب دیکھتے کہ لوگ اُس کی دعوت اور اُس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو رہے ہیں تو اُس کے مدعا سے توجہ ہٹانے کے لیے اُن سے کہتے تھے کہ اِسے خدائی کلام یا وحی والہام سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ محض شاعرانہ جادو بیانی ہے جس سے یہ شخص تمھارے دل و دماغ کو مسخر کر کے تمھیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ یہ خدا کا رسول ہے۔ آگے اِسی کا جواب دیا ہے۔

۴۷؎ اِس لیے کہ شاعر گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے؛ اُن کا کلام ایک مجموعۂ تضادات ہوتا ہے اور اُن کے پیرو بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جو علم و عقل کے بجائے اپنی باگ جذبات و خواہشات کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ بالبداہت واضح

مُّبِيۡنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۷۰﴾

تاکہ (اِس کے ذریعے سے) وہ اُنھیں خبردار کر دے جو زندہ ہوں[50] اور منکروں پر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔ ۶۹-۷۰

ہے کہ اِن میں سے کوئی بات بھی پیغمبر کے شایان شان نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کی اتھاہ سنجیدہ فضا، اُس میں حقائق غیب کا بے مثال انکشاف، اُس میں اصول و فروع کا نادر اتحاد اور لفظ و معنی کا بے نظیر ارتباط، اُس میں خدائی قانون اور خدائی حکمت کا بیان، یہ سب اِس سے بہت برتر ہے کہ آدمی اُس میں محض لفظوں کا آہنگ، اور موسیقی اور قوافی و فواصل کا اہتمام دیکھے اور اُسے شاعری کہہ کر فارغ ہو جائے۔ قرآن سے پہلے زبور بھی اِسی اسلوب کلام کا بے مثال شہ پارہ تھا۔ وہ اپنی اصل زبان میں باقی نہیں رہی، مگر جو کچھ باقی ہے، اُسے ہی دیکھ لیجیے، وہ بھی صاف بتا رہا ہے کہ ایں کتاب از آسمانے دیگر است۔

۴۸؎ یہ کس لحاظ سے یاد دہانی ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... یہ اُن تمام حقائق کی بھی یاد دہانی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں، اُس پوری تاریخ ہدایت کی بھی یاد دہانی کرتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے اور اُن تمام نتائج و عواقب کی بھی یاد دہانی کرتا ہے جو دنیا اور آخرت، دونوں میں لازماً پیش آ کے رہیں گے، اگر اللہ کے رسول کی تکذیب کی گئی۔'' (تدبر قرآن ۶/۴۴۱)

۴۹؎ یعنی بغیر کسی ابہام کے قطعی اور دوٹوک طریقے پر حقائق کو واضح کر دینے والا۔

۵۰؎ یعنی دل کے زندہ ہوں۔ یہ عقلی اور روحانی زندگی کی تعبیر ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ واضح کیا ہے کہ خدا مردوں کے لیے ہدایت کا اہتمام نہیں کرتا۔ اُس کی ہدایت صرف اُنھی کے لیے ہے جو اپنے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں کو زندہ رکھتے ہیں۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں یہی سنت الٰہی ہے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَيۡدِيۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ ﴿۷۱﴾ وَذَلَّلۡنٰهَا لَهُمۡ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ وَمِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۷۴﴾ؕ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ نَصۡرَهُمۡ ۙ وَهُمۡ لَهُمۡ جُنۡدٌ مُّحۡضَرُوۡنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا

کیا اِنھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی[۵۱] چیزوں میں سے اِن کے لیے چوپایے پیدا کیے ہیں اوراب یہ اُن کے مالک ہیں[۵۲]؟ اور ہم نے اُن کو اِس طرح اِن کا تابع بنا دیا ہے کہ اُن میں سے بعض اِن کی سواریاں ہیں اور اُن میں سے بعض کا گوشت کھاتے ہیں، اور اِن کے لیے اُن کے اندر دوسری منفعتیں بھی ہیں اور (خاص کر) پینے کی چیزیں بھی[۵۳]۔ پھر کیا یہ شکر نہیں کرتے[۵۴]؟ ۷۱-۷۳

اِنھوں نے اِس توقع پر اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے کہ اِن کی مدد کی جائے گی۔ وہ اِن کی مدد نہیں کرسکیں گے، بلکہ یہ اُن کی فوج ہو کر حاضر کیے جائیں گے[۵۵]۔

۵۱؎ یعنی اپنی خاص قدرت و حکمت سے بنائی ہوئی جس میں کسی دوسرے کا ذرہ برابر کوئی دخل نہیں ہے۔ یہاں سے آگے وہی مضمون ایک نئے اسلوب میں دوبارہ سامنے آ گیا ہے جس سے سورہ کی ابتدا ہوئی تھی۔

۵۲؎ یعنی اُن پر ہر طرح کے تصرف کا حق رکھتے ہیں جو خدا ہی نے اِنھیں دیا ہے۔

۵۳؎ جیسے دودھ اور اُس سے بنی ہوئی مختلف چیزیں۔

۵۴؎ مطلب یہ ہے کہ اِن نعمتوں کا حق تو یہ تھا کہ یہ خدا ہی کے شکر گزار ہوتے اور تنہا اُسی کی عبادت کرتے، مگر اِنھیں جب اِس حقیقت کی یاددہانی کی جاتی ہے تو اِس کو شاعری قرار دے کر اِس سے گریز و فرار کی راہیں تلاش کرنے لگ جاتے ہیں۔

يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٦﴾
اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ
مُّبِيْنٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ
الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ
وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۨ ﴿٧٩﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ

یٰسٓ
۳۶

سو اِن کی بات تمھیں آزردہ نہ کرے، (اے پیغمبر)۔ ہم جانتے ہیں جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں[۵۶]۔ ۷۴-۷۶

(اِنھیں تعجب ہے کہ مرنے کے بعد یہ کس طرح اٹھائے جائیں گے)؟ کیا انسان[۵۷] کو معلوم نہیں کہ ہم نے اُس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا، پھر وہ کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا؟ اُس نے ہم پر پھبتی چست کی[۵۸] اور اپنی پیدایش کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے، جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی؟ کہہ دو، اُن کو وہی زندہ کرے گا جس نے اُنھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اپنی ہر مخلوق کو وہ خوب جانتا

۵۵۔ یعنی خدا کے بجائے اُنھی معبودوں کے لشکر کی حیثیت سے خدا کے حضور میں حاضر ہوں گے اور وہاں فیصلہ ہوگا کہ یہ کس سزا کے مستحق ہیں۔

۵۶۔ لہٰذا اِن سے نمٹ بھی لیں گے۔

۵۷۔ انسان سے مراد قریش ہی ہیں جو اِس سورہ کے مخاطب ہیں، لیکن بے التفاتی کے اظہار کے لیے لفظ عام استعمال فرمایا ہے۔

۵۸۔ اصل میں 'ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ موقع ہو تو یہ اُس مفہوم کے لیے بھی آتے ہیں جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔

نَارًا فَاِذَآ اَنۡتُمۡ مِّنۡهُ تُوۡقِدُوۡنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيۡسَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰى وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبۡحٰنَ الَّذِىۡ بِيَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

ہے[۵۹]۔ وہی جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی[۶۰]، پھر اب اُسی سے سلگاتے ہو۔ کیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا، وہ اِس پر قادر نہیں کہ اِن لوگوں جیسی مخلوق پیدا کر دے؟ کیوں نہیں، وہی خلاق ہے، ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اُس کا تو یہ معاملہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے[۶۱]۔ سو پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے[۶۲] اور تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۷-۸۳

۵۹۔ یعنی مرنے کے بعد مٹی میں رل مل جائیں تو اُن سے بے خبر نہیں ہو جاتا۔ وہ اُن کے وجود کے ایک ایک ذرے سے واقف ہے۔

۶۰۔ یہ اُن درختوں کی طرف اشارہ ہے جن کی شاخوں سے صحراؤں کے مسافر چقماق کا کام لیتے تھے۔ سورہ کے مخاطبین اُن سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ قرآن نے اِسے ضد سے ضد کے نمودار ہونے کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ تمھاری بوسیدہ ہڈیوں کی مٹی سے تم بھی اِسی طرح نمودار ہو جاؤ گے۔

۶۱۔ یعنی اُس طریقے سے ہو جاتی ہے جو اُس کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے، کبھی چشم زدن میں اور کبھی ہزاروں سال میں۔

۶۲۔ لہٰذا تم بھی ہر نقص و عیب سے اُس کو پاک قرار دو اور اِس حقیقت کو تسلیم کرو کہ کائنات

کی تخلیق اور اُس کی تدبیرِ امور میں اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

کوالالمپور

۹ر مئی ۲۰۱۴ء

الصافات - ص

٣٧ ـــ ٣٨

الصافات - ص

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع منکرین توحید کو تہدید و وعید ہے۔ پہلی سورہ میں، البتہ انکار اور دوسری میں استکبار پر تنبیہ کی گئی ہے جو مخاطبین کے انکار کا اصلی سبب ہے۔ اِس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو اِن مستکبرین کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کا مضمون بھی دوسری سورہ میں نمایاں ہے۔ چنانچہ انبیا علیہم السلام کی جو سرگذشتیں اِس سورہ میں سنائی گئی ہیں، اُن میں یہ دونوں چیزیں ملحوظ ہیں۔

اِن سورتوں میں خطاب اصلاً قریش ہی سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ الصافات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۳﴾
اِنَّ اِلٰـہَکُمۡ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

صفیں باندھے حاضر رہنے والے فرشتے گواہی دیتے ہیں[1]، پھر شیطانوں کو جھڑک کر ڈانٹنے والے[2]، پھر خدا کو یاد کرنے والے[3] کہ تمھارا معبود ایک ہی ہے[4]۔

۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا'۔ اِن میں 'وَ' قسم کے لیے ہے۔ قرآن میں اِس طرح کی قسمیں تعظیم کے لیے نہیں، بلکہ مقسم علیہ پر شہادت کے لیے آتی ہیں۔ چنانچہ ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ملاء اعلیٰ میں عرش الٰہی کے اردگرد صف بستہ رہتے ہیں۔ سورۂ زمر (۳۹) کی آیت ۷۵ میں اُن کا ذکر ہوا ہے۔

۲۔ یعنی جب وہ سن گن لینے کے لیے ملاء اعلیٰ کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ یعنی اُس کی حمد و تسبیح کرنے والے۔ اِن صفات میں، اگر غور کیجیے تو اُسی طرح کی ترتیب ہے جو ہماری نمازوں میں ہوتی ہے کہ ہم پہلے صف باندھتے ہیں، پھر شیاطین سے تعوذ کرتے ہیں، پھر خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں۔

۴۔ یہ مقسم علیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو خدا کی خدائی میں شریک سمجھتے ہو، وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ خدا کے بندے ہیں اور ہمہ وقت اُس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿٥﴾

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ﴿٦﴾ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿٧﴾ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿٩﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿١٠﴾

وہی جو زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی سب چیزوں کا پروردگار ہے اور مشرق و مغرب کے تمام اطراف کا پروردگار[۵]۔ ۱-۵

اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارے قریبی آسمان[۶] کو ہم نے تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے اُس کو بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگا سکتے اور لگائیں تو بھگانے کے لیے ہر طرف سے دھتکارے جاتے ہیں اور یہ اُن کے لیے دائمی عذاب ہے۔ تاہم کوئی شیطان اگر کچھ لے اڑے تو ایک دہکتا شعلہ اُس کا تعاقب کرتا ہے[۷]۔ ۶-۱۰

۵؎ یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ آیت میں 'مَشَارِق' کے بعد 'مَغَارِب' کا لفظ بربناے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور اِس کی جمع عربیت کے اسلوب پر وسعت اطراف کو ظاہر کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ناپیدا کنار کائنات کے کسی دور دراز گوشے میں بھی اُس کے سوا کسی کی بادشاہی نہیں ہے۔ وہی ہر جگہ اور ہر ایک کا پروردگار ہے۔

۶؎ اِس سے وہ عالم بالا مراد ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنی دوربینوں سے جس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس سے ماورا چھ عالم اور بھی ہیں جن میں سے ہر ایک میں ہماری زمین کی طرح زندگی کی رعنائیوں سے آباد ایک زمین بھی ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَ يَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا

اب اِن سے پوچھو کہ اِنھیں بنانا زیادہ مشکل ہے یا اُن کو جنھیں ہم (اِن سے پہلے) بنا چکے ہیں[8]؟ حقیقت یہ ہے کہ اِنھیں تو ہم نے چپکتی مٹی سے پیدا کر دیا تھا[9]۔ نہیں، یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے، بلکہ تمھیں تعجب ہے (کہ ایسی واضح حقیقت کو یہ مانتے کیوں نہیں) اور یہ مذاق اڑا رہے ہیں (کہ تم یہ کیسی باتیں مانتے ہو)؟ اور جب اِنھیں یاددہانی کی جاتی ہے تو یاددہانی حاصل نہیں کرتے اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اُس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ نہیں، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

---

۷ اوپر ملائکہ کے بارے میں مشرکین کے مزعومات کی تردید فرمائی تھی۔ اُس کے بعد اب یہ جنوں کے بارے میں بھی واضح کر دیا ہے کہ اُن کے پاس ہرگز کوئی غیب کا علم نہیں ہوتا۔ اِس لیے جو لوگ اُن کے اور خدا کے درمیان رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے اور اُن کی پرستش کرتے ہیں، وہ بھی بالکل احمق ہیں۔

۸ یعنی ملائکہ اور جنات وغیرہ۔ 'مَنْ خَلَقْنَا' کے الفاظ سے ذہن اِسی طرف جاتا ہے، اِس لیے کہ 'مَنْ' بالعموم ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔

۹ یعنی اُسی چپکتی مٹی سے جس کی بہت بڑی مقدار اِس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ لہٰذا اِن کے بنانے کے لیے نہ اُس وقت ہمیں کوئی خاص سروسامان کرنا پڑا تھا اور نہ اب کرنا پڑے گا۔

لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿١٦﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿١٧﴾
قُلۡ نَعَمۡ وَاَنۡتُمۡ دَاخِرُوۡنَ ﴿١٨﴾ فَاِنَّمَا هِیَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ
فَاِذَا هُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿١٩﴾ وَقَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا هٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿٢٠﴾ هٰذَا
یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿٢١﴾
اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَاَزۡوَاجَهُمۡ وَمَا كَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿٢٢﴾
مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَاهۡدُوۡهُمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡجَحِیۡمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوۡهُمۡ

الصافات
۳۷

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی؟ ۱۱-۱۷

کہو کہ ہاں اور تم ذلیل بھی ہو گے۔ چنانچہ وہ ایک ڈانٹ ہی ہو گی، پھر اُسی وقت (اٹھ کر) دیکھنے لگیں گے[10] اور کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی، یہ تو جزا کا دن ہے ـــــ جی ہاں، یہ وہی فیصلے کا دن ہے جس کو تم لوگ جھٹلاتے رہے تھے[11]۔ ۱۸-۲۱

حکم ہو گا: اِن ظالموں[12] کو اکٹھا کرو اور اِن کے ہم مشربوں کو اور اُن کو بھی جنھیں یہ اللہ کے سوا پوجتے رہے ہیں، پھر اِن سب کو دوزخ کا راستہ دکھا دو۔ اور

۱۰؎ یہ قرآن نے نہایت بلیغ اسلوب میں اُس دہشت اور سراسیمگی کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے یہ لوگ دوچار ہوں گے۔

۱۱؎ یہ، ظاہر ہے کہ اُن کی بات پر فرشتے کہیں گے۔

۱۲؎ آیت میں 'اَلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا' کے الفاظ ہیں۔ یعنی 'ظَلَمُوۡا اَنۡفُسَهُمۡ'۔ اِس سے قرآن میں شرک مراد لیا جاتا ہے جو سب سے بڑا ظلم ہے اور یہ ظلم انسان دوسروں پر نہیں، بلکہ اپنے اوپر کرتا ہے۔

إِنَّهُم مَّسْـُٔولُونَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿٢٦﴾

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٧﴾ قَالُوا إِنَّكُمْ كُنتُمْ تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ﴿٢٨﴾ قَالُوا بَل لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٢٩﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿٣١﴾ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿٣٢﴾

الصافات
۳۷

ہاں، اِنھیں ذرا ٹھیراؤ تو، اِن سے کچھ پوچھنا بھی ہے۔ کیا بات ہے، اِس وقت تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو؟ کچھ نہیں بولتے، بلکہ یہ تو آج بڑے فرماں بردار بنے ہوئے ہیں![۱۳] ۲۲-۲۶

اُس وقت ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے کہ باہم سوال و جواب کریں۔ (چنانچہ اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے: یہ تم ہی ہمارے پاس آتے تھے دائیں سے...[۱۴] وہ (بات کاٹ کر) جواب دیں گے: نہیں، بلکہ تم خود ہی ایمان لانے والے نہیں تھے اور تمھارے اوپر ہمارا کوئی زور نہیں تھا، بلکہ تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ سو ہمارے پروردگار کی بات ہم پر پوری ہوگئی ہے۔[۱۵] کچھ شک نہیں کہ اُس کا مزہ

۱۳؎ یہ اُس ذلت اور بے بسی کی تصویر ہے جس کے بارے میں اوپر فرمایا تھا کہ ہاں، اٹھائے جاؤ گے اور ذلیل بھی ہو گے۔

۱۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ'۔ اِن کے بعد 'وَعَنِ الشِّمَالِ' ہونا چاہیے تھا، لیکن اُن کے پیشواؤں نے بات پوری نہیں ہونے دی۔ چنانچہ صورت حال کی تصویر کے لیے قرآن نے بھی اُسی طرح چھوڑ دیا ہے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝٣٣
اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝٣٤ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٣٥ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝٣٦ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣٧

اب ہم کو چکھنا ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بہکے ہوئے تھے، سو ہم نے تمھیں بھی بہکا دیا۔ اِس طرح یہ سب اُس دن عذاب میں مشترک ہوں گے۔[١٦] ٢٧-٣٣

ہم مجرموں کے ساتھ یہی کریں گے۔ اُن کا حال یہ تھا کہ جب اُن سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو اکڑ بیٹھتے اور، (قریش کے لوگو، تمھاری طرح وہ بھی) کہتے تھے کہ کیا ہم ایک خبطی شاعر کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں گے؟ ہرگز نہیں[١٧]، بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور وہ رسولوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے۔[١٨] ٣٤-٣٧

١٥؎ یعنی وہ بات جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے جواب میں کہی تھی کہ میں تجھے اور تیرے پیرووں کو جہنم میں بھر دوں گا۔

١٦؎ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی عقل ہر شخص کو دے کر دنیا میں بھیجا ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے۔ چنانچہ پیرووں کا یہ عذر اُس دن مسموع نہ ہوگا کہ اُن کی گم راہی کے ذمہ دار اُن کے لیڈر اور پیشوا ہیں۔

١٧؎ یعنی ہرگز خبطی اور شاعر نہیں ہے۔ یہ قریش کو جواب دیا ہے اور اِس طرح کلام کو مطابق حال کر دیا ہے۔

١٨؎ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت مسیح تک تمام رسولوں کی پیشین گوئیوں کا

إِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾ أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّٰتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَٰبِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشَّٰرِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ﴿٤٧﴾

(اُسے نہیں مانو گے تو) تم کو لازماً دردناک عذاب چکھنا ہوگا اور (یہ کوئی زیادتی نہیں ہوگی)، تم اُسی کا بدلہ پاؤ گے جو کرتے رہے ہو۔ اللہ کے منتخب بندے[19]، مگر اِس سے محفوظ ہوں گے۔ یہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے معلوم روزی[20] ہوگی، ہر طرح کے میوے۔ اور راحت کے باغوں میں وہ بڑی عزت سے ہوں گے، تختوں پر آمنے سامنے[21] بیٹھے ہوں گے، اُن کے لیے شرابِ ناب کے جام گردش میں ہوں گے، بالکل صاف شفاف، پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت! نہ اُس میں خمار ہوگا اور نہ

مصداق، جو اِس کے رسول برحق ہونے کی نہایت واضح دلیل ہے۔

۱۹؎ یعنی وہ جو اپنے ایمان و عمل سے اِس کا استحقاق پیدا کر لیں گے کہ خدا کی جنت کے لیے منتخب کر لیے جائیں۔

۲۰؎ یعنی ایسی روزی جو اُن کے منشا کے مطابق، اُن کا اپنا انتخاب اور ہر لحاظ سے جانی پہچانی ہوگی جس کو دیکھ کر کسی وحشت یا انقباض کا امکان نہ ہو۔

۲۱؎ آمنے سامنے کے الفاظ اُن کی باہمی محبت اور خوش دلی کے اظہار کے لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے سے منہ پھیر کر نہیں، بلکہ پورے التفات کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے اور آپس میں باتیں کرتے ہوں گے۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿٤٨﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٤٩﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿٥١﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿٥٢﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ

اُس سے اُن کی عقل خراب ہو گی۔ اُن کے پاس نیچی نگاہوں والی[۲۲] غزال چشم عورتیں ہوں گی، گویا کہ (شترمرغ کے) چھپے ہوئے انڈے ہیں[۲۳]۔ ۳۸-۴۹

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے کہ باہم گفتگو کریں۔ اُن میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا جو (بڑے تعجب کے ساتھ) مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟ کیا جب ہم مر

۲۲؎ یہ عورتوں کے باحیا ہونے کی تعبیر ہے۔ اہل عرب اِسی کو عورت کا سب سے بڑا حسن قرار دیتے تھے۔

۲۳؎ یہ تمام تشبیہات عربوں کے خاص ذوق کے مطابق ہیں، اِس لیے کہ وہی اِس کلام کے اولین مخاطبین ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...کلام عرب میں نازنینوں کی تشبیہ شترمرغ کے انڈوں سے بہ کثرت ملتی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس تشبیہ میں عفت، صیانت اور رنگ، تینوں چیزوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ ’مَکْنُوْن‘ سے اُن کے اچھوتے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جس طرح اہل عرب کنواریوں کی حفاظت میں بڑے غیور و حساس تھے، اُسی طرح شترمرغ بھی اپنے انڈوں کی حفاظت میں جان لڑا دیتا ہے۔ تشبیہ میں یہاں سنہرے رنگ کے انڈے مراد ہیں۔ نازنینوں کے سنہرے رنگ کا شعراے عرب بہت ذکر کرتے ہیں۔ ’معشوقہ‘ کے لیے ’صفراء‘ کی صفت اُن کے ہاں بہت معروف ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۴۶۷)

مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ هٰذَا

جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم بدلہ پائیں گے؟ وہ کہے گا: ذرا جھانک کر دیکھو گے (کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے)؟ یہ کہہ کر وہ جھانکے گا تو اُس کو دوزخ کے بیچ میں دیکھ لے گا۔[۲۴] (پھر بے ساختہ) بول اٹھے گا: خدا کی قسم، تم تو مجھے تباہ کر دینے والے تھے! اگر میرے پروردگار کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو میں بھی اُنھی میں ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ پھر کیا وہی نہیں ہوا کہ پہلی موت جو ہم کو آنی تھی، آ چکی، اب ہمیں مرنا نہیں ہے اور نہ ہمیں کوئی عذاب دیا جائے گا؟[۲۵]

۲۴۔ یعنی اُسی جگہ بیٹھے بیٹھے دیکھ لے گا اور اُس سے بات بھی کر لے گا۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنت میں جانے کے بعد لوگوں کی قوتیں اور صلاحیتیں کیا سے کیا ہو جائیں گی۔

۲۵۔ اِن الفاظ سے جس مسرت اور بے خودی کا اظہار ہو رہا ہے، اُس کا اندازہ ہر صاحب ذوق کر سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بازی ہم نے جیت لی تو سب سے بڑی بازی جیت لی۔ اسلوب کلام پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی کامیابی اُن کی توقعات سے اتنی زیادہ ہوگی کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی اُنھیں اپنے اوپر اعتبار نہیں ہوگا اور وہ اپنے ساتھیوں سے اُس کی تصدیق چاہیں گے۔'' (تدبر قرآن ۶/۴۶۸)

فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ

بے شک، یہی بڑی کامیابی ہے۔ سو عمل کرنے والوں کو ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنا چاہیے۔[٢٦] ۵۰-٦١

(اِن سے پوچھو)، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اُس کو اِن ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے۔[٢٧] وہ ایسا درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اگتا ہے۔[٢٨] اُس کے شگوفے گویا شیطانوں کے سر ہیں۔[٢٩] سو یہ ظالم اُسی سے کھائیں گے اور اُسی سے پیٹ بھریں گے۔

[٢٦] یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی بات پر استدراک ہے۔

[٢٧] یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ قرآن کے مخاطبین جب یہ سنتے کہ دوزخ میں زقوم کا درخت ہوگا تو اُس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے ٹھٹھا مار کر کہتے: لو اب نئی سنو، اِن کا کہنا ہے کہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت بھی اگیں گے۔

[٢٨] یعنی جو چاہے کہیں، حقیقت یہی ہے کہ یہ دوزخ میں اگتا اور اُسی میں پھلتا پھولتا ہے۔

[٢٩] یہ تخییلی نوعیت کی تشبیہ ہے۔ اِس طرح کی تشبیہات دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”...بعض مرتبہ تشبیہ کسی خیالی چیز سے دی جاتی ہے، لیکن وہ مرئی و مشاہد چیزوں سے زیادہ ذہنوں سے قریب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کسی پراگندہ حال و پراگندہ بال شخص کو کہیں کہ کیا بھوت کی سی شکل بنا رکھی ہے! بھوت اگرچہ ایک خیالی چیز ہے، لیکن اُس کا ایک تصور ہر شخص

مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمۡ عَلَيۡهَا لَشَوۡبًا مِّنۡ حَمِيۡمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاۡاِلَى الۡجَحِيۡمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَهُمۡ ضَآلِّيۡنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمۡ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمۡ يُهۡرَعُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَكۡثَرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا فِيۡهِمۡ مُّنۡذِرِيۡنَ ﴿۷۲﴾ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۷۴﴾

الصافات
۳۷

پھر اُس کے اوپر اُن کو کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا۔ پھر اُن کو ہر حال میں دوزخ ہی کی طرف لوٹنا ہوگا۔[۳۰] (یہ وہ لوگ ہیں کہ) اِنھوں نے اپنے باپ دادا کو گم راہی میں پایا۔ پھر یہ اُنھی کے نقش قدم پر دوڑتے رہے۔[۳۱] اِن سے پہلے اگلوں میں بھی اکثر اِسی طرح گم راہ ہوئے تھے۔ ہم نے اُن میں بھی خبردار کرنے والے بھیجے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ جنھیں خبردار کیا گیا تھا، اُن کا انجام کیا ہوا! خدا کے منتخب بندے ہی اُس سے محفوظ رہے۔۶۶-۷۴

کے ذہن میں موجود ہے۔ اِس وجہ سے یہ تشبیہ اُس شخص کو جس خوبی کے ساتھ مصور کرے گی، کوئی دوسری تشبیہ مشکل ہی سے کر سکے گی۔ اِسی طرح یہاں دوزخ کے زقوم کے پتوں اور کانٹوں کو شیاطین کے سروں سے تشبیہ دی ہے، گویا بہت سے شیاطین ننگے سر کھڑے ہوں۔ ہر چند یہ تشبیہ ہے خیالی، لیکن ذہنوں میں شیاطین کا ایک خوف ناک تصور موجود ہے۔ اِس وجہ سے اِس کو سن کر دل پر ایک کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۴۶۹)

۳۰؎ یعنی اِس ضیافت کے بعد۔ اوپر آیت میں اِس کے لیے 'نُزُل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی اولین ضیافت کے ہیں جو آتے ہی مہمان کو پیش کی جائے۔ مدعا یہ ہے کہ داخل ہوتے ہی زقوم کا پھل اور کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ پھر ہمیشہ کی سزا کے لیے اپنے اصل ٹھکانے کی طرف بھیج دیے جائیں گے۔

وَلَقَدۡ نَادٰىنَا نُوۡحٌ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِيۡبُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلۡنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الۡبٰقِيۡنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوۡحٍ فِى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ

(اِس کے لیے سب سے پہلے) نوح نے ہم سے فریاد کی تھی۔[۳۲] پھر دیکھو کہ ہم کیا خوب فریاد سننے والے ہیں! ہم نے اُس کو اور اُس کے لوگوں[۳۳] کو بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا اور (بعد کے زمانوں میں) اُسی کی نسل کو باقی رکھا[۳۴] اور پچھلوں میں ایک گروہ کو ہم نے اُس کی ملت پر چھوڑا۔[۳۵] نوح پر سلامتی ہے تمام دنیا والوں میں۔ ہم خوبی سے

الصافات ۳۷

۳۱۔ اِس سے معلوم ہوا کہ گم راہی کے عوامل میں سب سے بڑا عامل اپنے آبا و اجداد اور بزرگوں کی اندھی تقلید ہی ہے۔

۳۲۔ یہ اُس فریاد کی طرف اشارہ ہے جو نوح علیہ السلام نے ایک طویل جدوجہد کے بعد اپنی قوم کے ایمان سے بالکل مایوس ہو جانے کے بعد کی تھی۔ اِس کا ذکر سورۂ شعراء (۲۶) کی آیات ۱۱۷-۱۱۸ میں گزر چکا ہے۔

۳۳۔ اصل میں لفظ 'اَهل' استعمال ہوا ہے۔ اِس لفظ کا استعمال اگرچہ کسی شخص کے ساتھیوں اور پیروکاروں پر بھی ہوتا ہے، لیکن نوح علیہ السلام کے بارے میں معلوم ہے کہ اُن پر ایمان لانے والوں میں اکثریت اُن کے گھر والوں ہی کی تھی۔ لہٰذا باقی اہل ایمان کو اُنھی کے تابع سمجھنا چاہیے۔

۳۴۔ چنانچہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ بعد کے لوگ زیادہ تر اُنھی کے بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔

۳۵۔ اِس جملے میں 'تَرَكۡنَا' کا مفعول اور 'عَلٰى' کے بعد ایک مضاف عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق محذوف ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اُس کی قوم کے لوگوں نے تو اُس کو نہیں مانا،
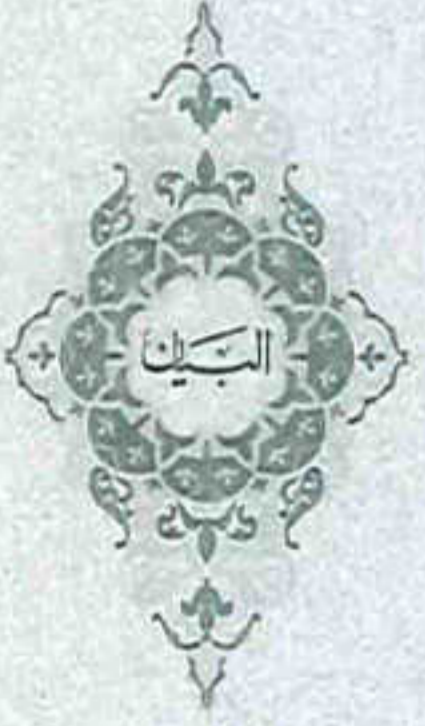
نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۱﴾
ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ﴿۸۲﴾
وَ اِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۸۳﴾ اِذۡ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿۸۴﴾

عمل کرنے والوں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر (اُس کو اور اُس کے ماننے والوں کو الگ کرکے) ہم نے اوروں کو غرق کر دیا۔[۳۶] ۷۵-۸۲

یقیناً اُسی کے گروہ میں سے[۳۷] ابراہیم[۳۸] بھی تھا۔ یاد کرو، جب وہ قلب سلیم[۳۹] کے ساتھ

لیکن بعد میں ایک بڑا گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا اور خدا کی توفیق سے عرصے تک باقی رہا جو اُس کے طریقے پر تھے۔

۳۶؎ یہ پہلی دینونت تھی جو زمین پر برپا ہوئی اور ہمیشہ کے لیے اِس حقیقت کی یادگار بن گئی کہ یہی کچھ ایک دن پورے عالم کے ساتھ بھی ہونے والا ہے۔

۳۷؎ یعنی اُسی کے زمرے میں سے۔ چنانچہ استاذ امام کے الفاظ میں، جو دعوت خلق کو اُنھوں نے دی، وہی دعوت اِنھوں نے بھی دی اور اللہ کی راہ میں جس ایمان و احسان کا مظاہرہ اُنھوں نے کیا، اُسی صدق و اخلاص کا مظاہرہ اِنھوں نے بھی کیا۔ گویا نوح علیہ السلام کے بعد وہ اُسی گروہ کے ایک نمایاں ترین فرد تھے جس کا ذکر اوپر 'وَتَرَکۡنَا عَلَیۡہِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ' کے الفاظ میں ہوا ہے۔

۳۸؎ حضرت ابراہیم ۲۱۰۰ ق م کے لگ بھگ زمانے میں عراق کے شہر ار میں پیدا ہوئے۔ آپ عمیلو طبقے کے ایک فرد تھے جو اُس علاقے میں سب سے اونچا طبقہ سمجھا جاتا تھا۔ باپ کا نام آزر تھا جو بڑے معبد کے پروہت اور ریاست کے اہم عہدہ دار تھے۔ وہاں اُس وقت نمو خاندان کی حکومت تھی جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔

۳۹؎ اِس سے مراد وہ دل ہے جو شرک و نفاق کی ہر بیماری سے پاک ہو اور جس میں کسی

اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَاذَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفۡكًا اٰلِهَةً دُوۡنَ اللّٰهِ تُرِیۡدُوۡنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظۡرَةً فِی

اپنے پروردگار کے حضور میں آیا۔[۴۰] جب اُس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا: یہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ کیا اللہ کے سوا جھوٹ گھڑے ہوئے معبودوں کو چاہتے ہو؟ پھر خداوند عالم کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے[۴۱]؟ (لوگ جب معبد

نوعیت کا کوئی کھوٹ نہ ہو۔

۴۰؎ یعنی اُس کی طرف متوجہ ہوا اور کمال صدق و اخلاص کے ساتھ اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا۔

۴۱؎ یہ جملہ دریا بہ کوزہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے سوا دوسرے معبودوں کے طالب بنے ہو تو خدائے رب العلمین کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟ کیا تم اِس بدگمانی میں مبتلا ہو کہ وہ تنہا تمھاری ضروریات کی کفالت اور تمھاری حفاظت سے قاصر ہے؟ کیا وہ اکیلا اِس دنیا کے انتظام سے عاجز ہے، اِس وجہ سے تم نے اُس کے لیے مددگار تلاش کیے ہیں؟ کیا تم اِس وہم میں مبتلا ہو کہ وہ اِس دنیا کے ہر گوشے اور ہر فرد کے حالات سے باخبر نہیں ہو سکتا، اِس وجہ سے اُس کو باخبر کرنے کے لیے دوسرے وسائل و وسائط کی ضرورت ہے؟ کیا تم اُس کے عدل و رحم سے مایوس ہو کہ اُس کی رحمت حاصل کرنے کے لیے تم نے اپنے جی سے اُس کے دربار کے لیے سفارشی ٹھیرائے ہیں؟ مطلب یہ ہوا کہ جب تک خداوند عالم کے بارے میں اِس قسم کی بدگمانی کسی کو نہ ہو، اُس وقت تک وہ اُس کے سوا کسی کو اپنا معبود بنانے کا ننگ گوارا نہ کرے گا۔ اور اگر کوئی شخص اپنے رب سے اِس قسم کا کوئی سوء ظن رکھتا ہے تو اُسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ العیاذ باللہ خدا کوئی بے حمیت و بے غیرت ہستی نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی مملکت میں ہر ایک کی شرکت و مداخلت گوارا کر لے، بلکہ وہ عزیز و جبار اور

النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿٨٩﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ﴿٩٠﴾ فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٩١﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿٩٢﴾ فَرَاغَ

سے رخصت ہونے لگے، جہاں ابراہیم نے یہ گفتگو کی تھی) تو اُس نے (وقت کا اندازہ کرنے کے لیے) ایک نظر تاروں پر ڈالی[۴۲]، پھر کہا: میں تو ماندہ ہو رہا ہوں[۴۳]۔ چنانچہ وہ اُس کو چھوڑ کر پلٹے اور چلے گئے[۴۴]۔ سو ابراہیم نظر بچا کر اُن کے معبودوں کی طرف گیا[۴۵] اور کہا:

غیور و متکبر ہے۔ اِس وجہ سے وہ ایسے تمام لوگوں کو جہنم میں جھونک دے گا جو اُس کی خدائی میں شریک بننے کے مدعی ہوں گے یا دوسروں کو شریک بنائیں گے۔''

(تدبر قرآن ۶/۴۷۹)

۴۲؎ یعنی بالکل اُسی طرح، جیسے اِس زمانے کے لوگ کلائی اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ قدیم زمانے میں وقت کا اندازہ کرنے کے لیے شب میں اِسی طرح تاروں کو اور دن میں سورج کو دیکھا جاتا تھا۔

۴۳؎ یہ غالباً معبد میں کسی تقریب کا موقع تھا۔ ایسے موقعوں پر لوگ بالعموم ماندہ اور مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے پہلے آسمان کی طرف نظر ڈال کر لوگوں کو وقت کا احساس دلایا، پھر اپنے اضمحلال کی طرف توجہ دلائی۔ اِس سے اُنھوں نے معبد کے محافظوں اور ذمہ داروں کو یہ تاثر دیا کہ طبیعت کے اضمحلال اور وقت زیادہ ہو جانے کی وجہ سے وہ اِس وقت گھر نہیں جانا چاہتے، بلکہ یہیں پڑ رہنا چاہتے ہیں۔ آگے جس اقدام کا ذکر ہے، اُس کے لیے یہ نہایت پاکیزہ توریہ تھا جس میں ہرگز کسی جھوٹ کی آمیزش نہیں تھی۔

۴۴؎ یعنی اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے، اُنھیں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی کہ وہ متنبہ ہو جاتے۔

۴۵؎ یعنی اُس طرف گیا، جہاں اُن کے بت رکھے ہوئے تھے۔

عَلَيۡهِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡيَمِيۡنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَيۡهِ يَزِفُّوۡنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا

آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں[۴۶]؟ کیا بات ہے، آپ لوگ بولتے بھی نہیں[۴۷]۔ اِس کے بعد وہ موقع دیکھتے ہی اُن پر پل پڑا اور بھرپور ہاتھ مارا[۴۸]۔ (لوگوں کو خبر ہوئی) تو وہ بھاگے ہوئے اُس کی طرف آئے۔ ابراہیم نے کہا: کیا تم لوگ اپنی گھڑی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی نے تمھیں بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو[۴۹]۔

الصافات ۳۷

۴۶۔ یہ اُن کھانوں کی طرف اشارہ ہے جو بتوں کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۴۷۔ یہ اور اِس سے پہلے کا طنزیہ فقرہ ابراہیم علیہ السلام کے مزاج کی کیفیت بتاتا ہے کہ اِس اقدام کے وقت نہایت بشاش تھے، اُن پر کسی گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں تھا۔

۴۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَرَاغَ عَلَيۡهِمۡ ضَرۡبًۢا بِالۡيَمِيۡنِ'۔ اِس جملے کی تالیف اِس طرح ہے: 'فَرَاغَ عَلَيۡهِمۡ يَضۡرِبُهُمۡ ضَرۡبًا بِالۡيَمِيۡنِ'۔ لفظ 'یَمِین' دائیں ہاتھ کے لیے آتا ہے۔ اِس ہاتھ کی ضرب چونکہ بھرپور ہوتی ہے، اِس وجہ سے یہاں یہ دائیں کے معنی سے مجرد ہو کر بھرپور ہاتھ مارنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ اقدام، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، نہی عن المنکر کے لیے نہیں کیا، بلکہ اپنے خاص طریقے پر استدلال کے لیے کیا تھا جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کا یہ استدلال سورۂ انبیاء (۲۱) میں تفصیل کے ساتھ نقل ہوا ہے۔

۴۹۔ یعنی تمھیں بھی اور اُس لکڑی اور پتھر کو بھی جس سے تم اپنے معبود تراشتے ہو اور اُن جنات اور ملائکہ کو بھی جن کے یہ تمھارے زعم کے مطابق علامتی پیکر ہیں۔ قرآن نے یہاں اپنے طریقے کے مطابق اِس سرگذشت کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے جس کی وضاحت سورۂ انبیاء (۲۱) سے ہوتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کا خلاصہ بیان فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡيَانًا فَاَلۡقُوۡهُ فِى الۡجَحِيۡمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَسۡفَلِيۡنَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ ﴿۹۹﴾

اُنھوں نے کہا: (اِس کا یہی رویہ ہے تو) اِس کے لیے ایک عمارت کھڑی کرو، پھر اِس کو دہکتی آگ میں پھینک دو۔[50] سو اُنھوں نے اُس کے ساتھ چال کرنی چاہی[51] تو ہم نے اُنھی کو نیچا دکھا دیا۔[52] ابراہیم نے کہا: (تم لوگوں کو چھوڑ کر اب) میں اپنے پروردگار کی طرف

''...جس وقت حضرت ابراہیم نے بتوں کو توڑا، اُس وقت تو کسی کو خبر نہیں ہوئی۔ بعد میں جب پہرے داروں کو اِس حادثہ کی اطلاع ہوئی اور یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ کس کی کارستانی ہو سکتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بتوں کی ہجو کرتے رہے تھے اور اُنھوں نے دھمکی بھی دے رکھی تھی کہ وہ اِن بتوں کے ساتھ ایک چال کرنے والے ہیں، اِس وجہ سے معبد کے ذمہ داروں کی رائے یہی قرار پائی کہ ہو نہ ہو، یہ اُنھی کی کارروائی ہے۔ چنانچہ سارے لوگ بھاگے ہوئے اُن کے پاس پہنچے اور اُن سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پہلے تو اُنھوں نے لوگوں کا مذاق اڑایا اور بڑے بت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اُس نے توڑا ہو گا اور ساتھ ہی اُن کی حماقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، اپنے اِن معبودوں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے! اگر یہ اپنے سر پر آئی ہوئی مصیبت کو نہ خود دفع کر سکتے اور نہ اُس کو بیان ہی کر سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم اِن کی پوجا کر رہے ہو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اِس معارضے سے اول اول تو وہ بہت شرمائے، لیکن پھر حمیت جاہلیت اُن پر غالب آ گئی اور بولے کہ بھلا اِن سے ہم کس طرح پوچھیں، یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں!'' (تدبر قرآن ۶/ ۴۸۲)

۵۰؎ یعنی ایک آتش کدہ بناؤ اور ابراہیم کو اُس میں پھینک دو۔ اُن کے اِس فیصلے کے لیے قرآن نے آگے لفظ 'کَیۡد' استعمال کیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اُنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کے سامنے نہیں، بلکہ آپس میں ایک دوسرے سے کہی۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾

جاتا ہوں، وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔[۵۳] پروردگار، تو مجھے صالح اولاد عطا فرما۔[۵۴] (ابراہیم نے یہ دعا کی) تو (اِس کے جواب میں) ہم نے اُس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔[۵۵] ۸۳-۱۰۱

۵۱؎ یعنی آتش کدہ بنا کر کسی بہانے سے اُن کو اُس میں پھینکنا چاہا۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ علانیہ اقدام کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی طرف سے مزاحمت کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ چنانچہ معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں بھی قریش کے سرداروں کو اِسی طرح کی تدبیر کرنی پڑی تھی۔

۵۲؎ دوسری جگہ وضاحت ہے کہ وہ اِس میں تو کامیاب ہو گئے کہ اُن کو آگ میں ڈال دیں، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو محفوظ رکھا اور آگ اُن کے لیے ٹھنڈی ہو کر سراسر سلامتی بن گئی۔

۵۳؎ اپنی قوم پر اتمام حجت کے بعد یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہجرت کے فیصلے کا اظہار ہے۔ لوگ داعی حق کی جان کے درپے ہو جائیں تو انبیا علیہم السلام کو اِسی طرح ہجرت کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ آگے کیا پیش آئے گا، اِس طرح کے موقعوں پر اِس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر قدم پر ضرورت ہوتی ہے کہ وہی پروردگار رہنمائی فرمائے جس کے بھروسے پر اتنا بڑا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ خدا پر اِسی بھروسے کو ظاہر کرتے ہیں۔

۵۴؎ اِس سے واضح ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ہاں اُس وقت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بائیبل کی کتاب پیدایش سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنے خاندان اور خویش و اقارب سے کٹنے کے بعد یہ اُن کی فطری ضرورت تھی جس کے لیے اُنھوں نے یہ درخواست کی ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ

(وہ لڑکا جوان ہوا)، پھر جب وہ اُس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچا[56] تو ابراہیم نے (ایک دن) اُس سے کہا: میرے بیٹے، میں (کچھ دنوں سے[57]) خواب

الصافات
۳۷

۵۵ اِس سے، ظاہر ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام مراد ہیں۔ آگے آیت ۱۱۲ میں خود قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ اسحٰق علیہ السلام اُنھیں اِس بیٹے کی قربانی کے بعد اور اِس کے صلے میں ملے تھے۔ بائیبل کی کتاب پیدایش میں بھی تصریح ہے کہ حضرت اسحٰق کی پیدایش اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدایش کے ۱۴ سال بعد ہوئی تھی۔ سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیت ۳۹ میں صاحب زادوں کا ذکر اِسی ترتیب سے ہوا ہے۔ قرآن نے دونوں کے لیے صفات کے استعمال میں بھی فرق کیا ہے۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل کو یہاں 'غُلٰمٌ حَلِيْمٌ' کہا گیا ہے، جب کہ حضرت اسحٰق کی بشارت جہاں بھی نقل ہوئی ہے، اُن کے لیے 'غُلٰمٌ عَلِيْمٌ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... یہ صفت اُن کی اُس عزیمت واستقامت کی تعبیر ہے جس کا مظاہرہ اُنھوں نے باپ کی چھری کے نیچے کیا اور جس کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو 'صَادِقُ الْوَعْدِ'، 'صَابِر' اور 'حَلِيْم' کے القاب سے نوازا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بعینہٖ یہی صفت 'حَلِيْم' قرآن میں حضرت ابراہیم کے لیے بھی آئی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل اپنے باپ کی صفات کے سب سے زیادہ نمایاں مظہر تھے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۴۸۴)

۵۶ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ کم و بیش ۱۳ برس کی عمر تھی۔ بیٹا باپ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ محبوب اِسی عمر میں ہوتا ہے۔ پھر اسمٰعیل تو اُن کے اکلوتے فرزند تھے اور ہجرت کے بعد غربت کی جو زندگی وہ بسر کر رہے تھے، اُس میں اُن کے لیے دل جمعی کا واحد ذریعہ تھے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آگے جس امتحان کا ذکر ہے، وہ کیسا سخت امتحان تھا۔

۵۷ یہ اسلوب کلام سے متبادر ہے۔ اِس لیے کہ اُنھوں نے یہ خواب اگر ایک ہی مرتبہ

اَذۡبَحُكَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَ تَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ ﴿۱۰۳﴾ وَ نَادَیۡنٰہُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا ۚ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی

میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ تو غور کرو، تمھاری کیا راے ہے؟[۵۸] اُس نے کہا: ابا جان، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے، اُس کی تعمیل کیجیے۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے ثابت قدموں میں پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا[۵۹] اور ہم نے اُس سے پکار کر کہا کہ ابراہیم، تم نے خواب کو سچا کر دکھایا ہے[۶۰] تو تصور کرو کہ دریاے رحمت نے کیسا جوش مارا ہو

دیکھا ہوتا تو اِس کو بیان کرنے کے لیے 'اِنِّیۡ رَاَیۡتُ فِی الۡمَنَامِ' کا اسلوب زیادہ موزوں تھا۔

۵۸؎ اِس سے مقصود یہ تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں، اُس پر عمل کے لیے بیٹے کے حوصلے کا بھی اندازہ کر لیا جائے۔

۵۹؎ یعنی سجدہ ریز کر دیا۔ اِس لیے کہ یہی ہیئت خدا کے قرب کی سب سے زیادہ محبوب ہیئت ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے پسند فرمایا کہ فرزند سجدے کی حالت میں خدا کے حضور پیش کیا جائے۔

۶۰؎ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ خواب میں ذبح کرتے ہوئے دکھایا تھا اور خواب کی باتیں تاویل و تعبیر کی محتاج ہوتی ہیں۔ لہٰذا اِس خواب کی تعبیر بھی یہ تھی کہ وہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیں۔ اِس سے ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ وہ فی الواقع اُس کو ذبح کریں۔ لیکن خدا کے اِس صداقت شعار بندے نے کوئی تعبیر نکالنے کے بجاے اُس پر من و عن عمل کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اُن کے اِسی اقدام پر غایت درجہ محبت اور تحسین و آفرین کے اظہار کے لیے فرمایا ہے کہ ابراہیم تم نے

الصافات ۳۷

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿١٠٩﴾

گا۔[61] حقیقت یہ ہے کہ خوبی سے عمل کرنے والوں کو ہم ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔[62] یقیناً یہ کھلی آزمایش تھی۔[63] (ابراہیم اِس میں کامیاب ہو گیا تو) ہم نے ایک عظیم قربانی کے عوض اسمٰعیل کو چھڑا لیا[64] اور (ابراہیم کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ) پچھلوں میں

خواب کو سچ کر دکھایا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ حکم جس طریقے سے دیا گیا تھا، اُس میں یہی رویہ کمال عبدیت کے زیادہ قریب تھا اور اُس سے یہ دیکھنا مقصود بھی تھا کہ وہ تاویل کرتے ہیں یا فی الواقع ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ آگے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ یہ کھلی آزمایش تھی اور ابراہیم اُس میں ہر لحاظ سے کامیاب رہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ وہ اہل نظر ہی کے نہیں، اہل ظاہر کے بھی امام تھے اور موقع امتحان کا ہو تو اہل ظاہر کا طرز عمل ہی قرین صواب ہوتا ہے۔

۶۱؎ یہ 'لَمَّا' کا جواب ہے جو اصل میں حذف کر دیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ بات اتنی بڑی ہے کہ اُس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ اُسے اگر لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس کی اصلی شان سے یہ بہت کم تر ہو گا۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے، اِس لیے کہ ترجمہ پہلے ہی اصل کا کم تر بیان ہوتا ہے۔

۶۲؎ یعنی اُن کی جزا کے لیے ہماری رحمت اِسی طرح جوش میں آتی ہے، جس طرح کہ اِس موقع پر آئی۔

۶۳؎ ابراہیم علیہ السلام کی کامیابی پر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید تحسین و آفرین ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ کوئی معمولی امتحان نہیں تھا، بلکہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں ابراہیم علیہ السلام نے

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٠﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿١١٣﴾

ایک گروہ کو ہم نے اُس کی ملت پر چھوڑا۔ سلامتی ہو ابراہیم پر۔ ہم خوبی سے عمل کرنے والوں کو اِسی طرح صلہ دیتے ہیں[65]۔ کچھ شک نہیں کہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا[66]۔ (یہی موقع تھا کہ) ہم نے اُس کو اسحٰق کی بشارت دی، صالحین کے زمرے میں سے ایک نبی[67]۔ اور ہم نے اسمٰعیل اور اسحٰق، دونوں پر اپنی برکتیں نازل فرمائیں۔ اب دونوں کی اولاد میں خوبی سے عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی

بازی جیتی۔ جس امتحان کو خود اللہ تعالیٰ بڑا امتحان قرار دے، اُس کے بڑے ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر اُس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسی کامیابی حاصل کی جس کی داد خود اللہ تعالیٰ نے 'قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْ يَا' کے شان دار الفاظ سے دی تو اِس میں شبہ نہیں کہ اِس آسمان کے نیچے نہ اُس سے بڑا کوئی امتحان پیش آیا اور نہ اُس سے زیادہ شان دار کامیابی کسی نے حاصل کی۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۴۸۷)

۶۴؎ یہ اُس قربانی کی طرف اشارہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کی اور جس کی یادگار کے طور پر ہر سال اِسی تاریخ کو قربانی کی ایک عظیم روایت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئی۔ یہی قربانی ہے جو حج و عمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ آیت میں اِسی کو 'ذِبْحٌ عَظِيْمٌ' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ در حقیقت اسمٰعیل علیہ السلام کی جان کا فدیہ ہے جس سے وہ چھڑا لیے گئے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ'۔

۶۵؎ یعنی دنیا اور آخرت میں اِسی طرح سلامتی اور برکت سے نوازتے ہیں۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١١٤﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿١١٥﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾

جان پر کھلے ہوئے ظلم ڈھانے والے بھی۔[68] ۱۰۲-۱۱۳

ہم نے موسیٰ اور ہارون[69] پر بھی اِسی طرح فضل کیا تھا اور اُن کو اور اُن کی قوم کو[70] بڑی مصیبت سے نجات دی تھی اور اُن کی مدد کی تھی تو بالآخر وہی غالب رہے

۶۶؎ یہ حقیقی مفہوم میں فرمایا ہے۔ اِس سے واضح ہوا کہ ایمان کی اصلی شان وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے طرز عمل سے ظاہر ہوئی۔

۶۷؎ اسحٰق علیہ السلام کے معاملے میں بشارت اصل میں اِسی چیز کی تھی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے مجرد ایک فرزند کی ولادت کوئی اہمیت رکھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ حضرت اسمٰعیل کو پا کر اولاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکے تھے۔ چنانچہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اُن کو حضرت اسحٰق کی خوش خبری دی گئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ ''کاش، اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے''![*] البتہ، یہ بات اُن کے لیے بشارت ہو سکتی تھی کہ پیدا ہونے والا فرزند صالح اور نبی ہوگا۔'' (تدبر قرآن ۶/۴۸۸)

۶۸؎ یہ اظہار تاسف کا جملہ ہے۔ یعنی وہی صورت پیدا ہو گئی ہے جو انسانوں کے معاملے میں بالعموم پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے عالی مرتبت لوگوں کی اولاد میں بھی لوگ خدا سے سرکش ہو کر شرک جیسے ظلم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

۶۹؎ ابراہیم علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر رسول یہی دونوں تھے۔ اِن کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م کے لگ بھگ ہے۔

۷۰؎ یعنی بنی اسرائیل کو، جو اُس زمانے میں فراعنۂ مصر کے غلام تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن

* پیدایش ۱۷: ۱۸۔

وَاٰتَیۡنٰہُمَا الۡکِتٰبَ الۡمُسۡتَبِیۡنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ ہَدَیۡنٰہُمَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴿۱۱۸﴾ وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡہِمَا فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰی مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّہُمَا مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اِنَّ اِلۡیَاسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَلَا

تھے اور ہم نے اُن دونوں کو روشن کتاب[1] عطا فرمائی تھی اور اُن کو سیدھی راہ کی ہدایت بخشی تھی اور (نوح اور ابراہیم کی طرح) ہم نے پچھلوں میں ایک گروہ کو اُن کی ملت پر چھوڑا تھا۔ سلامتی ہو موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم خوبی سے عمل کرنے والوں کو اِسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ دونوں بھی ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ ۱۱۴-۱۲۲

اِسی طرح الیاس[2] بھی یقیناً ہمارے پیغمبروں میں سے تھا۔ یاد کرو، جب اُس

کی مدد کی اور اُنھیں اِس غلامی سے نجات عطا فرمائی۔ آیت میں اِسی کو 'الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ' (بڑی مصیبت) سے تعبیر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ اِس کی تفصیلات سورۂ بقرہ (۲) میں بیان ہو چکی ہیں۔

[1] یعنی تورات۔ اِس لیے کہ یہی کتاب ہے جس میں خدا کی شریعت پہلی مرتبہ پوری وضاحت کے ساتھ اور نہایت مرتب انداز میں بیان کی گئی۔

[2] یہ ہارون علیہ السلام کی نسل سے اور جلعاد کے رہنے والے تھے۔ اِن کا زمانہ محققین ۸۷۵ اور ۸۵۰ ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ بائیبل میں اِن کا ذکر ایلیا تشبی کے نام سے کیا گیا ہے۔ اِن کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے اِن کی بات سن کر نہیں دی، لیکن دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اِن کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ اب تک دوبارہ آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ

نے اپنی قوم[۳] سے کہا: تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل[۴] کو پکارتے ہو اور اُسے چھوڑ دیتے ہو جو بہترین پیدا کرنے والا ہے؟ اللہ کو، جو تمھارا بھی پروردگار ہے اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا بھی؟ بالآخر اُنھوں نے اُسے جھٹلا دیا تو اب وہ بھی یقیناً پکڑے ہوئے آئیں گے۔ اللہ کے منتخب بندے، البتہ محفوظ رہیں گے۔ ہم نے (الیاس پر بھی عنایت کی اور) پچھلوں میں ایک گروہ کو اُس کی ملت پر چھوڑا۔ سلامتی ہو عظمتوں والے الیاس[۵] پر۔ ہم خوبی سے عمل کرنے والوں کو اِسی

الصافات
۳۷

[۳] یعنی بنی اسرائیل سے، جن کی سلطنت کے اُس زمانے میں دو حصے ہو چکے تھے۔ ایک حصہ آل داؤد کے قبضے میں تھا اور دوسرے پر اخی اب کی حکومت تھی۔ الیاس علیہ السلام نے دونوں میں فریضۂ نبوت ادا کیا۔

[۴] زمانۂ قدیم کی سامی زبانوں میں یہ لفظ 'الٰہ' کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک خاص دیوتا کو اُنھوں نے یہی نام دے رکھا تھا۔ لبنان کی فینیقی قوم کا سب سے بڑا دیوتا یہی بعل تھا اور اُس کی بیوی عستارات اُن کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے جب صیدا (موجودہ لبنان) کی شہزادی ایزبل سے شادی کر لی تو اُس کے اثر سے بعل پرستی کی بیماری بنی اسرائیل میں بھی پھیل گئی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بعل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔ یہی زمانہ ہے، جب الیاس علیہ السلام بنی اسرائیل میں نبوت کرنے کے لیے

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾
وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾
اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ

طرح صلہ دیتے ہیں[۶]۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔۱۲۳-۱۳۲
اور کچھ شک نہیں کہ لوط[۷] بھی ہمارے پیغمبروں میں سے تھا۔ یاد کرو، جب اُس کو اور اُس کے سب گھر والوں کو ہم نے نجات دی، ایک بڑھیا کے سوا[۸] کہ پیچھے رہ جانے والوں میں رہ گئی۔ اِس کے بعد ہم نے اوروں کو ہلاک کر مارا۔ (قریش کے لوگو)، تم

مبعوث ہوئے۔

۵ے اصل میں لفظ 'اِلْ یَاسِیْنَ' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'اِلْیَاس' کی جمع ہے، جیسے 'طُوْرِ سِیْنِیْنَ' طور سینا کی جمع ہے۔ عربی زبان میں جمع تعداد کے لیے بھی آتی ہے، وسعت اطراف کے لیے بھی اور کسی شخص یا چیز کی عظمت بیان کرنے کے لیے بھی۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ بیان عظمت کے لیے آئی ہے۔

۶ے اِس جملے کا بار بار اعادہ اِس لیے ہوا ہے کہ جزا و سزا ایک سنت الٰہی ہے جس کا ظہور بار ہا دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں تو یقیناً ہوگا۔

۷ے یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اِن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔

۸ے اِس سے حضرت لوط کی بیوی مراد ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے بغیر پیغمبر کی بیوی ہونا بھی اُس کے لیے کچھ نافع نہیں ہو سکا اور وہ اُسی عذاب سے دوچار ہوئی جو لوط علیہ السلام کی قوم پر نازل کیا گیا۔

الصافات
۳۷

لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾
وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ۭ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾

صبح کو بھی اُن کی بستیوں پر سے گزرتے ہی ہو اور رات میں بھی۔ پھر کیا عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟[۷۹] ۱۳۳-۱۳۸

اِسی طرح یونس[۸۰] بھی یقیناً پیغمبروں میں سے تھا۔ یاد کرو، جب وہ (اپنی قوم کو چھوڑ کر) کشتی کی طرف بھاگ نکلا[۸۱] جو مسافروں سے بھر چکی تھی[۸۲]۔ پھر (کشتی

۷۹؎ پیچھے تمام سرگذشتوں میں 'وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ' کی آیت ترجیع کے طور پر آتی رہی ہے۔ یہاں اُس کے بجائے مخاطبین کو اُس مدعا کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے لیے یہ سرگذشتیں سنائی جارہی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ سرگذشتوں کی طوالت میں بعض اوقات اصل مدعا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب اکثر مقامات پر اختیار کیا گیا ہے کہ کلام کے بیچ میں تنبیہ کی آیات اِسی طرح آتی ہیں اور اُن کے بعد کلام پھر پیچھے سے مربوط ہو جاتا ہے۔

۸۰؎ بائیبل میں اِن کا نام یونا آیا ہے۔ اِن کا زمانہ ۸۶۰ اور ۷۸۴ ق م کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ یہ اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق میں مبعوث ہوئے تھے۔ نینویٰ کا مشہور شہر اِنھی اشور والوں کا دارالسلطنت تھا اور اُس زمانے میں تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے دور میں پھیلا ہوا تھا۔

۸۱؎ اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے، جب حضرت یونس اپنی دعوت کی ناقدری دیکھ کر غیرت حق کے جوش میں نکل کھڑے ہوئے، جب کہ رسول کی حیثیت سے وہ اذن الٰہی کے بغیر اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ آیت میں لفظ 'اَبَقَ' اِسی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ گویا غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ نکلا۔ اِس پر مواخذے کا یہ قصہ قریش کی تنبیہ و تہدید کے

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿١٤١﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ

طوفان میں گھر گئی اور اُن کے کہنے پر[83]) اُس نے قرعہ ڈالا تو (اُسی کے نام پر نکلا[84]

ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی توجہ کے لیے بھی سنایا گیا ہے کہ ہجرت کا فیصلہ اُن کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ ہی کرے گا۔ اپنی راے اور اجتہاد سے وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے اور مشکلات سے گھبرا کر اگر کہیں کر بیٹھے تو خدا کا قانون بے لاگ ہے، وہ بھی اِسی طرح محاسبے کی زد میں آ جائیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کی کشمکش کے ایک محاذ پر مامور ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے اُس کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر اُس محاذ سے ہٹے، اگرچہ اُس کا محرک کوئی نیک جذبہ ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو آزمایشیں اپنے رسول کے لیے لکھی ہیں، اُس کو اُن سے بہر حال گزرنا ہے۔ اگر وہ آزمایش سے گھبرائے گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ ایک آزمایش سے بچنے کی کوشش میں کسی دوسری اُس سے بڑی آزمایش میں گرفتار ہو جائے۔ اِسی طرح قوم کو جو مہلت اتمام حجت کے لیے ملنی چاہیے، وہ بھی سنت الٰہی کے مطابق ضروری ہے اور یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم پر کب اللہ کی حجت پوری ہوئی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے گمان کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اہل نینوا ایمان لانے والے نہیں ہیں، حالاں کہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ پوری قوم میں ایمان لانے کی صلاحیت موجود تھی۔" (تدبر قرآن ۶/۴۹۳)

۸۲۔ اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ ایسے وقت میں پہنچے، جب کشتی سفر کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی۔ اُن کی تمنا بھی یہی تھی کہ جلد سے جلد وہاں سے نکل جائیں۔ چنانچہ بے درنگ اُس میں سوار ہو گئے اور وہ اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

۸۳۔ یعنی مسافروں کے کہنے پر۔

۸۴۔ اُس زمانے کے ملاحوں میں روایت تھی کہ کشتی طوفان میں گھر جائے تو قرعہ ڈال کر دیکھتے کہ اُس میں کوئی مجرم تو سوار نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہ مصیبت آ گئی ہے۔ پھر جس کے

مُلِيۡمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوۡلَاۤ اَنَّهٗ کَانَ مِنَ الۡمُسَبِّحِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيۡ بَطۡنِهٖۤ اِلٰي يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذۡنٰهُ بِالۡعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيۡمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنۡۢبَتۡنَا

اور) وہ سمندر میں پھینک دیا گیا۔[85] پھر اُس کو مچھلی نے نگل لیا[86] اور وہ سزاوار ملامت ہو چکا تھا۔[87] سو اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو اُس دن تک مچھلی کے پیٹ ہی میں پڑا رہتا، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ (لیکن اُس نے تسبیح کی[88]) تو ہم نے اُس کو کھلے میدان میں ڈال دیا اور اُس وقت وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ ہم نے (مزید

نام پر قرعہ نکلتا، اُس کو دریا میں پھینک دیتے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اِس کے بغیر کشتی ورطۂ ہلاکت سے نہیں نکل سکتی۔ اِس موقع پر بھی، معلوم ہوتا ہے کہ یہی کیا گیا اور قرعہ ڈالنے کی خدمت حضرت یونس کے سپرد ہوئی۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ کشتی میں سب سے زیادہ ثقہ اور باوقار شخص وہی نظر آرہے تھے۔

۸۵؎ لفظ 'اَبَقَ' کی رعایت ملحوظ رہے تو گویا مفرور غلام قرار پائے اور اِسی جرم کی سزا میں دریا میں پھینک دیے گئے۔

۸۶؎ یہ غالباً کوئی وہیل تھی، اِس لیے کہ اِسی طرح کی مچھلی آدمی کو سموچا نگل سکتی ہے۔

۸۷؎ یعنی جو سزا اُسے دی گئی، اُس کا مستحق ہو چکا تھا۔ انبیا علیہم السلام کے بارے میں خدا کا قانون یہی ہے کہ اگر اِس نوعیت کی کوئی غلطی کریں تو اُس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ 'الحاقۃ' (۶۹) میں فرمایا ہے کہ ہمارا یہ پیغمبر اگر اپنی طرف سے کوئی بات بنا لاتا تو ہم اِس کو قوی ہاتھ سے پکڑ لیتے، پھر اِس کی رگ گردن کاٹ دیتے۔

۸۸؎ یہ اُن کلمات کی طرف اشارہ ہے جو اُس وقت اُن کی زبان پر جاری ہوئے کہ پروردگار، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے۔ یقیناً میں ہی اپنی جان پر ظلم کر بیٹھا ہوں۔ سورۂ انبیاء (۲۱) کی آیت ۸۷ میں اُن کا یہ ورد اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے۔ اپنی غلطی کے اعتراف

عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا

عنایت فرمائی اور) اُس پر ایک بیل والا درخت اگا دیا[89] اور (جن کی طرف مبعوث کیا گیا تھا) اُسے (دوبارہ اُنھی) ایک لاکھ، بلکہ اُس سے بھی زیادہ[90] لوگوں کی طرف بھیج دیا۔ پھر وہ ایمان لے آئے تو ہم نے اُن کو ایک مدت تک رہنے بسنے کی مہلت دے دی[91]۔ ۱۳۹-۱۴۸

(یہ اب بھی نہیں مانتے) تو اِن سے پوچھو[92]، کیا تیرے پروردگار کے لیے بیٹیاں

اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کے لیے یہ بہترین کلمات ہیں جو کسی لغزش کے بعد انسان کی زبان پر جاری ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی کلمات اُن کی نجات کا ذریعہ بن گئے۔

۸۹ اِس لیے کہ اُس کے سایے میں وہ دھوپ کی شدت سے محفوظ رہیں اور اُن کے اوسان بجا ہو جائیں۔

۹۰ اصل الفاظ ہیں: 'اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ'۔ اِن میں 'اَوْ' ہمارے نزدیک 'بَلْ' کے معنی میں ہے اور عربی زبان میں یہ اِس معنی میں آتا ہے۔ بائیبل کے صحیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔

۹۱ اِس میں قریش کے لیے تہدید ہے کہ دنیا میں رہنے بسنے کی مہلت تمھارے لیے بھی ایمان کے ساتھ مشروط ہو چکی ہے۔ لہٰذا نہیں مانو گے تو اُسی طرح زمین سے مٹا دیے جاؤ گے، جس طرح تم سے پہلے رسولوں کے مکذبین مٹا دیے گئے۔

۹۲ اصل میں لفظ 'فَاسْتَفْتِهِمْ' آیا ہے۔ سورہ کے شروع میں ملائکہ اور جنات کی الوہیت کی تردید کے بعد بعینہٖ اِسی لفظ سے آیت ۱۱ میں کلام کا رخ قریش کی تہدید و وعید اور نبی صلی اللہ

الصافات ۳۷

الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

ہیں اور اِن کے لیے بیٹے[۹۳]؟ یا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور یہ اُس وقت دیکھ رہے تھے؟ سن لو، حقیقت یہ ہے کہ یہ محض اپنی من گھڑت سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہوئی ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیاں پسند کرلیں[۹۴]؟ تمھیں کیا ہوگیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ پھر کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے[۹۵]؟ یا تمھارے پاس (کتاب الٰہی کی) کوئی واضح حجت ہے؟ تو لاؤ اپنی کتاب، اگر تم سچے ہو[۹۶]۔ ۱۴۹-۱۵۷

علیہ وسلم کی تسلی کے مضمون کی طرف مڑ گیا تھا۔ انبیا علیہم السلام کی تاریخ سے اُس پر استدلال کے بعد اب آخر میں 'عود علی البدء' کے طریقے پر اُسی الوہیت کے مسئلے کو پھر لے لیا ہے جس کی تردید سے سورہ شروع ہوئی تھی۔

۹۳؎ مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا کی طرف بیٹوں اور بیٹیوں کی نسبت ہی ایک شدید قسم کی حماقت ہے، لیکن اِنھوں نے حماقت پر حماقت یہ کی ہے کہ خدا کے لیے وہ چیز پسند کی ہے جو اپنے لیے کبھی پسند نہیں کرتے۔

۹۴؎ یعنی تمھارے زعم کے مطابق اور اپنے لیے وہ چیز گوارا کر لی کہ تمھارے لیے انتخاب کا موقع ہو تو کبھی گوارا نہ کرو۔ یہ مخاطب کے مسلمات سے اُس کی حماقت پر متنبہ کرنے کا اسلوب ہے۔ اِس سے کسی کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾

اِنھوں نے خدا کے اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ بنا رکھا ہے، اور جنوں کو خوب معلوم ہے کہ نافرمانی کریں گے تو وہ بھی یقیناً پکڑے ہوئے آئیں گے ـــــ اللہ پاک ہے اُن باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں[۹۷] ـــــ اللہ کے برگزیدہ بندے ہی (اُس کی پکڑ سے) محفوظ رہیں گے۔ سو تم اور تمھارے معبود، تم اِن پر صرف اُنھی کو فریفتہ کر سکتے ہو جو (اپنے کرتوتوں کی بنا پر) جہنم میں پڑنے والے ہیں۔ ۱۵۸-۱۶۳

---

۹۵ مطلب یہ ہے کہ یہ بات تو ادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے۔ پھر دھیان کیوں نہیں کرتے؟

۹۶ اِس سے واضح ہوا کہ خدا کے بارے میں کوئی بات یا عقل و فطرت کے مسلمات کی بنیاد پر کہی جا سکتی ہے یا خود خدا کی کسی کتاب کی بنیاد پر۔ اِسے من گھڑت سے کہنے کی جسارت کسی شخص کو بھی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ صریح افترا علی اللہ ہے۔

۹۷ یہ جملۂ معترضہ ہے جو فوری تردید کے لیے اصل سلسلۂ کلام کے بیچ میں آگیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس سے اِس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ بات ایسی گھنونی ہے کہ متکلم کو اُس کی تردید کے لیے معاملے میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ اُس کی بات پوری ہو لے۔“

(تدبر قرآن ۴۹۹/۶)

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّ اِنَّا لَنَحۡنُ الصَّآفُّوۡنَ ﴿۱۶۵﴾ وَ اِنَّا لَنَحۡنُ الۡمُسَبِّحُوۡنَ ﴿۱۶۶﴾

وَ اِنۡ کَانُوۡا لَیَقُوۡلُوۡنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوۡ اَنَّ عِنۡدَنَا ذِکۡرًا مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۶۸﴾

(یہ ہمیں خدا کی بیٹیاں بناتے ہیں؟ ہرگز نہیں[98])، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین مقام ہے[99] اور ہم جو ہیں، ہم تو خدا کے حضور صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو (ہمہ وقت) اُس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں[100]۔ ۱۶۴-۱۶۶

یہ لوگ[101] کہا کرتے تھے کہ اگر پہلوں کی یاددہانی[102] ہمارے پاس ہوتی تو ہم خدا کے

۹۸؎ یہ کلام کے بیچ میں جبریل امین نے اُن سب حماقتوں کی تردید کر دی ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ گویا جن کو معبود بنایا گیا تھا، اُنھی کے گل سرسبد نے بتا دیا کہ خدا کے مقابلے میں اُن کی حیثیت کیا ہے۔

۹۹؎ یعنی خدا کی اولاد اور اُس کی خدائی میں شریک ہونا تو درکنار، ہمارا حال تو یہ ہے کہ اپنے حدود سے باہر پر نہیں مار سکتے۔ خدا نے جو مقام ہمارے لیے متعین کر دیا ہے، بس وہی ہمارا مقام ہے۔ ہماری یہ مجال نہیں ہے کہ اُس سے ذرہ برابر تجاوز کریں۔

۱۰۰؎ یعنی جو باتیں تم خدا کے بارے میں کہہ رہے ہو، اُس کو اُن سے پاک قرار دینے میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ اُن کی نماز کی طرف اشارہ ہے۔ سورہ کے شروع میں یہی چیز 'فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

۱۰۱؎ یعنی قریش مکہ جو سورہ کے مخاطب ہیں۔

۱۰۲؎ اِس سے خدا کی کتاب مراد ہے۔ اصل میں اِس کے لیے لفظ 'ذِکۡر' استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ خود قرآن کے لیے جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اِس سے اِس حقیقت کو ظاہر

لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾
وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ
لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ
عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾

خاص بندے ہوتے۔[۱۰۳] لیکن (وہ اِن کے پاس آگئی تو) اِنھوں نے اُس کا انکار کر دیا۔ سو عنقریب جان لیں گے کہ اب اِس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ۱۶۷-۱۷۰

(تم خدا کے رسول ہو اور) رسول کی حیثیت سے اپنے بھیجے ہوئے بندوں کے بارے میں ہمارا یہ فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے کہ مدد کے حق دار وہی ہوں گے۔ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہنے والا ہے۔[۱۰۴] سو کچھ دنوں کے لیے اِن سے اعراض کرو اور اِنھیں دیکھتے رہو کہ عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے۔ ۱۷۱-۱۷۵

کرنا مقصود ہے کہ خدا کی کتابیں اصلاً اِسی یاددہانی کے لیے نازل کی گئی ہیں۔

۱۰۳؎ یہی بات سورۂ فاطر (۳۵) کی آیت ۴۲ میں بھی نقل ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسری قوموں کی طرح ہم اُس یاددہانی کو ہرگز نہ جھٹلاتے، بلکہ اُس کی پیروی کرتے اور خدا کے خاص بندے بن کر دکھاتے۔

۱۰۴؎ یہ اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جو قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ رسولوں کے مخالفین اُن کو کبھی مغلوب نہیں کر سکتے۔ اللہ اپنے رسولوں کی لازماً مدد کرتا ہے اور وہ غالب ہو کر رہتے ہیں اور اُن کے مخالفین باز نہ آئیں تو لازماً صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جاتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس کے لیے اگر ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ آسمان سے اپنے فرشتوں کے لشکر بھی اتارتا ہے۔ آیت میں اِسی کو 'جُنْدَنَا' (ہمارا لشکر) کہا ہے۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمۡ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِيۡنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ حَتّٰى حِيۡنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبۡصِرۡ فَسَوۡفَ يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۸۲﴾

پھر کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ سو جب وہ اِن کے صحن میں اترے گا تو بڑی ہی بری ہوگی اُن لوگوں کی صبح[۱۰۵] جنھیں اُس سے خبردار کر دیا گیا۔ (اِس لیے چھوڑ دو) اور کچھ دنوں کے لیے اِن سے اعراض کرو اور دیکھتے رہو کہ عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے۔ ۱۷۶-۱۷۹

تیرا پروردگار، عزت کا مالک، اُن سب باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں اور اُس کے پیغمبروں پر سلامتی ہے[۱۰۶] اور شکر اللہ ہی کے لیے ہے، جہانوں کا پروردگار ہے[۱۰۷]۔ ۱۸۰-۱۸۲

۱۰۵؎ یہ لفظ اِس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ عرب میں غارت گری کا اصلی وقت صبح کا وقت ہی ہوتا تھا۔ 'و اصباحا' کے نعرے میں اِس کا یہی مفہوم ملحوظ ہے۔

۱۰۶؎ اوپر یہی بشارت ہر پیغمبر کے لیے وارد ہوئی ہے۔ یہاں خاص طور پر اشارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

۱۰۷؎ اِس لیے کہ یہ اُسی کی عدالت ہے جو اِس طرح ظاہر ہوتی اور اہل ایمان کے لیے اُس عدل کامل کے ظہور کی شہادت بن جاتی ہے جو آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے۔

سورۃ ص

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صٓ وَالۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ ﴿۲﴾ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوۡا وَّلَاتَ حِیۡنَ مَنَاصٍ ﴿۳﴾

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ ’ص‘[۱۰۸] ہے۔ قرآن گواہی دیتا ہے، سراسر یاددہانی[۱۰۹] کہ اِن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے،[۱۱۰] بلکہ یہ منکرین[۱۱۱] سخت تکبر اور ضدم ضدا میں مبتلا ہیں۔ (اِن کا خیال ہے کہ اِن کے لیے عذاب کہاں)! اِن سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں تو اُنھوں نے ہاے پکار کی (کہ اپنے آپ کو بچا لیں)، مگر وہ بچنے کا وقت نہیں تھا۔ ۱-۳

۱۰۸؎ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

۱۰۹؎ قرآن فی الواقع سرتاسر یاددہانی ہے۔ یہ انسان کو وہ حقائق یاد دلاتا ہے جو اُس کی فطرت میں ودیعت ہیں اور جن کا علم وہ اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آیا ہے؛ اُن حقائق پر متنبہ کرتا ہے جن کی منادی انبیا علیہم السلام کرتے رہے ہیں اور انسان اُنھیں بھلا بیٹھتا ہے؛ دنیا میں خدا کی دینونت کے ظہور کے واقعات یاد دلاتا ہے اور سب سے بڑھ کر اُس روز حساب کی یاددہانی کرتا ہے جس سے مرنے کے بعد سابقہ پیش آنے والا ہے۔

۱۱۰؎ قرآن کی گواہی یہاں قسم کے اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ مقسم علیہ ہے جو الفاظ میں مذکور نہیں ہے، اِس لیے کہ ذکر کے بغیر ہی واضح ہے۔

وَعَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴ۚ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝۵ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝۶ۚ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ

انھیں تعجب ہے کہ اِن کے پاس ایک خبردار کرنے والا اِنھی میں سے آ گیا ہے۔[۱۱۲]
اور اِن منکروں نے کہہ دیا کہ یہ ساحر ہے،[۱۱۳] سخت جھوٹا ہے۔ کیا اِس نے اتنے
خداؤں کو ایک خدا بنا دیا؟[۱۱۴] یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اِن کے سردار اٹھ کھڑے
ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو۔ بے شک، یہی چیز مطلوب ہے۔[۱۱۵] ہم

۱۱۱۔ یعنی قریش مکہ جو سورہ کے مخاطبین ہیں۔

۱۱۲۔ یعنی اِنھی جیسا ایک انسان ہے اور اِنھیں خدا کی طرف سے خبردار کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اِس کے لیے تو خدا اگر بھیجتا تو کسی مافوق بشر ہستی کو بھیجتا۔ ہمارے جیسا ایک انسان اِس کام کے لیے کس طرح بھیجا جا سکتا ہے؟

۱۱۳۔ یعنی ہرگز کوئی پیغمبر نہیں ہے، بلکہ کلام کا جادوگر ہے اور اپنی جادو بیانی سے لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے۔

۱۱۴۔ یہ بات وہ آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کے لیے کہتے تھے کہ دیکھو یہ شخص اُن ہستیوں کی الوہیت کا انکار کر رہا ہے جن سے تم عقیدت رکھتے اور اُنھیں اپنا معبود سمجھتے ہو۔

۱۱۵۔ یعنی اِس کی تمام کوششوں کے علی الرغم اپنے معبودوں پر جمے رہنا ہی مطلوب ہے۔ یہ اُس رویے کی تصویر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے قریش کے لیڈر بالعموم اختیار کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کبھی دیکھتے کہ لوگ آپ سے متاثر ہو رہے ہیں تو اِسی طرح کی کوئی بات کہہ کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوتے۔

الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۚۖ ﴿٧﴾ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ؕ ﴿٨﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۚ ﴿٩﴾ اَمْ

نے یہ بات اِس آخری ملت میں تو کبھی سنی نہیں۔[116] کچھ نہیں، یہ (اِس کی) گھڑی ہوئی ہے۔ کیا یہ یاددہانی ہم میں سے اِسی پر نازل کی گئی ہے[117]؟ نہیں، یہ باتیں کچھ نہیں، بلکہ یہ میری یاددہانی کی طرف سے شک میں ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اِنھوں نے اب تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا ہے۔[118] ۴-۸

(اپنے سوا یہ کسی کو ہماری عنایتوں کا حق دار نہیں سمجھتے)۔ کیا تیرے پروردگار،

۱۱۶؎ یعنی یہ بات کہ خدا ایک ہی ہے اور جسے یہ شخص ہمارے بزرگوں ـــــــ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام ـــــــ کی طرف منسوب کر کے کہہ رہا ہے، ہم نے یہ اپنے قریب کے لوگوں میں تو کبھی نہیں سنی۔ اُنھوں نے یہ بات اگر فی الواقع کہی ہوتی تو اِس کی کچھ بازگشت اِس دور آخر کے لوگوں میں بھی باقی ہونی چاہیے تھی۔ یہ، اگر غور کیجیے تو وہی استدلال ہے جو ہر زمانے کے لوگ اِسی طرح پیش کرتے رہے ہیں۔

۱۱۷؎ یہ بات وہ اپنی ریاست و امارت کے غرور میں کہتے تھے کہ ہمارے بڑے بڑے سرداروں کو چھوڑ کر کیا یہی رہ گئے تھے کہ اِس منصب کے لیے منتخب کیے گئے ہیں؟ یہ اُسی پندار کا اظہار ہے جس کا ذکر سورہ کی ابتدا میں 'فِیْ عِزَّةٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔

۱۱۸؎ مطلب یہ ہے کہ یہ تمام ضد اور غرور اور ہیکڑی صرف اِس لیے ہے کہ ابھی اِنھیں یقین نہیں ہوا کہ جس عذاب سے اِنھیں خبردار کیا جا رہا ہے، وہ فی الواقع آنے والا ہے۔ بلکہ اِس لیے بھی کہ اِنھیں مجرد استدلال سے کسی بات کا قائل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جب تک آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اُس وقت تک کسی چیز کو ماننے والے نہیں ہیں۔

لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۟ قف فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝۱۰ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۝۱۲ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ۝۱۳ اِنْ كُلٌّ اِلَّا

عزیز و وہاب[119] کی رحمت کے خزانے اِنھی کی تحویل میں ہیں؟ یا زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی سب چیزوں کی بادشاہی اِنھی کے اختیار میں ہے؟ (یہی بات ہے) تو آسمانوں میں چڑھ جائیں[120] (اور اُس کی رحمت کو روک دیں)۔ لشکروں میں سے کوئی بڑے سے بڑا لشکر[121] بھی، (خدا کے مقابل میں اٹھے گا تو) وہیں شکست کھا کر رہے گا۔ ۹-۱۱

اِن سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور میخوں والا[122] فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور

۱۱۹؎ یعنی وہ پروردگار جو اپنے تمام خزانوں کا تنہا مالک ہے، اُن میں جس طرح چاہے، تصرف کا اختیار رکھتا ہے اور نہایت فیاض بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...وہ اپنے اُن بندوں کو بھی بڑی فیاضی سے بخشتا ہے جو اِن کی نظروں میں اگرچہ کسی چیز کے اہل نہیں ہیں، لیکن خدا کی نظروں میں اُن کا بڑا مرتبہ ہے۔ چنانچہ اُس نے اگر اِن کو اِس زمین کے کچھ خزف ریزے دیے ہیں جن پر یہ اترا رہے ہیں تو اُس نے جس کو چاہا ہے، نبوت و رسالت اور علم و حکمت کی بادشاہی بخش دی ہے جس سے بڑے منصب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' (تدبر قرآن ۶/۵۱۵)

۱۲۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ'۔ اِن میں 'اَسْبَاب' سے مراد 'اَسْبَابُ السَّمٰوٰتِ' ہے اور یہاں یہ لفظ اطراف و متعلقات کے معنی میں ہے۔

۱۲۱؎ اصل میں 'جُنْدٌ مَّا' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'جُنْد' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے

كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿١٤﴾ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿١٥﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿١٦﴾

ایکہ والے[123] بھی جھٹلا چکے ہیں۔ یہ گروہ تھے جنھوں نے اِسی طرح شکست کھائی۔[124] اِن میں سے ہر ایک نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب اُن پر نازل ہو کے رہا۔ یہ بھی ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی ڈھیل نہیں ہے۔[125] یہ تو کہہ چکے کہ ہمارے پروردگار، ہمارا حساب تو روز حساب سے پہلے ہی ہم کو چکا دے۔[126] ۱۲-۱۶

ہے اور 'مَا' اِسی تفخیم کی تاکید کے لیے آیا ہے۔

۱۲۲؎ یعنی کثیر لشکروں والے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...عربی میں میخوں سے خیموں کو تعبیر کرتے ہیں اور پھر خیموں سے بطریق کنایہ فوجیں مراد لیتے ہیں۔ یہ اُسی طرح کا کنایہ ہے، جس طرح 'قُدُوْرٌ رَّاسِيَاتٌ' سے کسی شخص کی فیاضی کو تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی فیاضی کی تعبیر کے لیے یہ کنایہ آیا ہے۔ یہاں 'ذُو الْاَوْتَادِ' سے فرعون کی کثیر فوجوں کی طرف اشارہ ہے جو خیموں میں رہتی تھیں۔ فرعون کی فوجوں کی کثرت کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے اور یہ تمام فوجیں اُس کے ساتھ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر سمندر میں غرق ہوئیں۔" (تدبر قرآن ۵۱۶/۶)

۱۲۳؎ مدین والوں کی طرف اشارہ ہے۔ 'اَيْكَة' عربی زبان میں جنگل کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدین کے پاس کوئی بہت بڑا جنگل تھا جس کی بنا پر یہ نام اُنھیں دیا گیا۔

۱۲۴؎ اصل میں 'اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں خبر حذف کر دی ہے، اِس لیے کہ موقع کلام سے یہ خود واضح ہے اور بعد کا جملہ اِسے مزید واضح کر دیتا ہے۔

۱۲۵؎ یعنی مزید مہلت کی گنجایش نہیں ہے۔

اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَا دَاوٗدَ ذَا الۡاَیۡدِ ۚ اِنَّہٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرۡنَا الۡجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحۡنَ بِالۡعَشِیِّ وَ الۡاِشۡرَاقِ ﴿ۙ۱۸﴾

یہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو، (اے پیغمبر)، اور بڑی قوت کے مالک، ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو۔[۱۲۷] حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔[۱۲۸] ہم نے اُس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام اُس کے ساتھ تسبیح کرتے

ص ۳۸

۱۲۶؎ مطلب یہ ہے کہ جس روز حساب سے یہ ہمیں ڈراتا ہے، وہ پہلے ہی آ جائے تاکہ فیصلہ ہو جائے کہ یہ شخص سچا ہے یا محض دھونس دے رہا ہے۔ اپنے اوپر وہ کسی عذاب کا اندیشہ نہیں رکھتے تھے، اِس لیے رعونت اور استکبار کی وجہ سے یہ بھی کہہ گزرتے تھے۔

۱۲۷؎ اِس لیے کہ خود بھی اُس کے حلم و تحمل سے تسلی حاصل کرو اور اپنے مخاطبین کو بھی توجہ دلاؤ کہ اِن سے کہیں بڑھ کر قوت و شوکت اور دولت و حشمت کا مالک ہونے کے باوجود وہ کسی غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ داؤد علیہ السلام خدا کے پیغمبر بھی تھے اور بنی اسرائیل کے عظیم بادشاہ بھی۔ ہم سورۂ سبا (۳۴) کی تفسیر میں پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ اُن کی سلطنت خلیج عقبہ سے دریاے فرات کے مغربی کناروں تک پھیلی ہوئی تھی جس پر وہ ۹۶۵ ق م تک حکومت کرتے رہے۔

۱۲۸؎ یعنی زور و قوت نے اُس کے اندر رعونت پیدا نہیں کی تھی، بلکہ اُس کی خشیت و انابت کو اور بڑھا دیا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...قرآن نے یہاں 'ذَا الۡاَیۡدِ' اور 'اَوَّاب'، دونوں صفتوں کو ایک ساتھ ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ کوئی صاحب قوت و حکومت شخص اللہ تعالیٰ کا منظور نظر بندہ اُس وقت بنتا ہے، جب قوت و شوکت کے ساتھ اُس کے اندر 'اوابیت' کی صفت پائی جائے۔ اگر قوت و صولت اُس کے اندر 'عزت و شقاق' کی رعونت پیدا کر دے تو یہ نمرودیت اور فرعونیت ہے جو اللہ کے نزدیک ملعون و مبغوض ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/۵۲۲)

وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ۙ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰی دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی

تھے اور پرندوں کو بھی، جھنڈ کے جھنڈ[129] ـــــ سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ہم نے اُس کی سلطنت مضبوط کردی تھی، اُس کو حکمت عطا کی تھی اور نزاعات میں فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی۔ ۱۷-۲۰

تمھیں اُن لوگوں کی خبر پہنچی ہے[130] جو مقدمہ لے کر آئے تھے؟ جب وہ دیوار پھاند کر اُس کی محراب[131] میں داخل ہو گئے[132]، اُس وقت جب وہ داؤد کے پاس پہنچ گئے تو وہ اُن سے

۱۲۹؎ یعنی اپنے خاص لحن میں جب وہ زبور کے منظوم نغمے چھیڑتے تو دشت وجبل، چرند و پرند، سب اُن کے ہم نوا ہو کر اُن کے شریک بزم بن جاتے تھے۔قرآن نے دوسرے مقامات میں تصریح فرمائی ہے کہ اِس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے، لیکن انسان اُس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔تاہم حضرت داؤد کا معاملہ یہ نہیں تھا۔استاذ امام کے الفاظ میں، اللہ تعالیٰ نے جس طرح اُنھیں پہاڑوں کو موم کر دینے والا اور پرندوں کو جذب کر لینے والا سوز و لحن بخشا تھا، اُسی طرح اُن کو وہ گوش شنوا بھی عطا فرمایا تھا کہ وہ اُن کی تسبیح و مناجات کو سمجھ سکیں۔

۱۳۰؎ یہ اسلوب خطاب واقعہ کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتا ہے اور اِس میں مخاطبین کے لیے فی الجملہ تشویق و ترغیب بھی ہے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اُس کو سنیں۔

۱۳۱؎ یعنی داؤد علیہ السلام کی خلوت گاہ میں۔شاہی محلات کی تعمیر میں محرابوں کی کثرت ہوتی تھی۔اِسی سے یہ لفظ اُن کے کمروں، برآمدوں اور نشست گاہوں کے لیے بھی استعمال

بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾
إِنَّ هٰذَآ أَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ

ڈر گیا۔ اُنھوں نے فوراً کہا کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دو فریق معاملہ ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے، سو آپ ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے اور کوئی بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں سیدھی راہ بتائیے۔[۱۳۳] ۲۱-۲۲

یہ میرا بھائی ہے۔ اِس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی

ص
۳۸

ہونے لگا۔ اردو زبان میں بھی اِس کا یہ استعمال معروف ہے۔

۱۳۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ'۔ اِن میں تضمین ہے، یعنی 'تَسَوَّرُوا الْجِدَارَ وَدَخَلُوا الْمِحْرَابَ'۔

۱۳۳؎ آگے جو مقدمہ پیش کیا گیا ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ کوئی حقیقی فریق مقدمہ نہیں تھے، بلکہ ایسے لوگ تھے جو تمثیل کے اسلوب میں خود حضرت داؤد کو اُن کی کسی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے اِس طریقے سے اُن کے محل میں داخل ہوئے تھے۔ یہ اُن کے کوئی خیر خواہ بھی ہو سکتے ہیں اور خدا کے فرشتے بھی جو انسانی صورت میں آئے اور اُنھیں توجہ دلا کر چلے گئے۔ بائیبل سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے، لیکن غور کیجیے تو دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ اِس لیے کہ رعایا کے کسی فرد یا افراد کا اِس طرح دیوار پھاند کر فرماں روائے وقت کی خلوت گاہ میں جا پہنچنا آسانی کے ساتھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ تاہم اِس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کیسے خدا ترس اور متحمل مزاج بادشاہ تھے کہ اُن کی اِس حرکت پر کچھ بھی کبیدہ خاطر نہیں ہوئے، بلکہ اپنی عدل پروری کے باعث فوراً اُن کا مقدمہ سننے کے لیے تیار ہو گئے، اِس کے باوجود کہ اُن کا اسلوب گفتگو بھی، جیسا کہ 'لَا تُشْطِطْ' کے لفظ سے ظاہر ہے، کچھ ایسا شایستہ نہیں تھا۔

اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿٢٤﴾ السجدة

ہے۔[134] اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دو اور اِس نے بحث میں مجھے دبا لیا ہے۔[135] داؤد نے کہا: اِس نے تمھاری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملانے کا مطالبہ کر کے یقیناً تم پر ظلم کیا ہے[136] اور واقعہ یہ ہے کہ معاملے کے اکثر شریک اِسی طرح ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔[137] اِس سے وہی بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں۔ اُس وقت داؤد کو خیال ہوا کہ یہ تو ہم نے اُس کا امتحان کیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے پروردگار سے معافی چاہی اور اُس

۱۳۴؎ اُس زمانے کے تمدن میں لوگوں کی اصل دولت بھیڑوں اور دنبیوں کے ریوڑ ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمثیل میں اُنھی کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۳۵؎ یعنی چونکہ دولت مند ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں، گرد وپیش کے لوگ اِسی کی حمایت کر رہے ہیں، اِس لیے دب کر رہ گیا ہوں، بحث وجدال میں اِس سے جیتنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

۱۳۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ'۔ اِن میں لفظ 'سُؤَال' مطالبے کے مفہوم میں ہے۔ اِس مفہوم کے لیے عربی زبان میں اِس کا استعمال معروف ہے۔ اِس کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ ہے۔ یہ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ لفظ یہاں 'ضَمّ' یا 'خَلْط' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۱۳۷؎ یعنی اپنے ننانوے کو سو بنانے کی فکر میں اِسی طرح ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ص ۳۸

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

ص ۳۸

کے حضور جھک کر سجدے میں گر گیا[۱۳۸] اور (پورے دل سے اُس کی طرف) رجوع ہوا۔ تب اُس کی وہ خطا[۱۳۹] ہم نے معاف کر دی اور اُس کے لیے یقیناً ہمارے پاس تقرب کا خاص مقام اور اچھا انجام ہے۔۲۳-۲۵

اے داوٗد، ہم نے تمھیں زمین میں حاکم بنایا ہے تو لوگوں کے درمیان (اِسی طرح) انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو اور اپنی خواہش کے پیچھے نہ چلو کہ وہ تمھیں خدا کی راہ سے بھٹکا دے۔[۱۴۰] جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹکتے ہیں، اُن کے لیے یقیناً سخت سزا ہے، اِس لیے کہ اُنھوں نے روز حساب کو بھلا دیا۔۲۶

۱۳۸۔ اصل الفاظ ہیں: 'خَرَّ رَاكِعًا'۔ لفظ 'خَرَّ' دلیل ہے کہ وہ صرف جھکے ہی نہیں، اِس کے ساتھ اُنھوں نے سجدہ بھی کیا۔

۱۳۹۔ یہ خطا کیا تھی؟ قرآن نے اِس کی تصریح نہیں کی، لہٰذا ہمیں بھی اُس کو جاننے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کے سامنے مقدمہ جس تمثیل کی صورت میں رکھا گیا ہے، اُس کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ بادشاہ کی حیثیت سے کسی شخصی یا اجتماعی ضرورت کے لیے کسی دوسرے کی ملکیت سے تعرض کرنے کی کوئی خواہش غالباً اُن کے دل میں پیدا ہوئی یا اُن کی طرف سے اُس کا اظہار ہوا اور اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی یہ صورت پیدا کر دی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٩﴾

ص ۳۸

(لیکن یہ آ کر رہے گا،[۱۴۱] اِس لیے کہ) زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے عبث پیدا نہیں کیا ہے۔[۱۴۲] یہ اُن لوگوں کا گمان ہے جو انکار پر اڑ گئے ہیں۔ سو اِن منکروں کے لیے جہنم کی ہلاکت ہے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے اُن جیسا کر دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا خدا سے ڈرنے والوں کو اُس کے نافرمانوں جیسا کر دیں گے؟ (ہرگز نہیں، یہ قرآن اِسی حقیقت کی یاددہانی کرتا ہے)، یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے، (اے پیغمبر)، تمھاری طرف نازل کی ہے۔ اِس لیے کہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور اِس لیے کہ عقل والے اِس سے یاددہانی حاصل کریں۔ ۲۷-۲۹

۱۴۰؎ یہی ہدایت، ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام حکمرانوں کے لیے بھی ہے۔

۱۴۱؎ یعنی روز حساب۔

۱۴۲؎ یہ دلیل بیان فرمائی ہے کہ اگر حساب کا دن نہ آئے تو اِس کے صاف معنی یہ ہوں گے کہ یہ دنیا ایک باطل کارخانہ ہے، اِس میں کوئی حکمت اور کوئی مقصد نہیں ہے اور اِس کا خالق ایک کھلنڈرا ہے جس نے اپنا دل بہلانے کے لیے یہ دنیا بنا دی ہے جس میں حق و باطل اور خیر و شر میں سرے سے کوئی امتیاز ہی نہیں ہے۔ اِس طرح کی بات، ظاہر ہے کہ وہی لوگ کر

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ﴿۳۰﴾
اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْۤ

اور داؤد کو ہم نے سلیمان[143] (جیسا بیٹا) عطا کیا[144]۔ کیا ہی خوب بندہ تھا[145]! کچھ شک نہیں کہ وہ خدا کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا[146]۔ ۳۰

یاد کرو[147]، جب خاصے کے اصیل اور عمدہ گھوڑے شام کے وقت اُس کے ملاحظے

ص
۳۸

سکتے ہیں جو فیصلہ کر بیٹھے ہوں کہ ہر چیز کو مان لیں گے، لیکن آخرت کو کسی حال میں نہیں مانیں گے، اگرچہ اُس کے دلائل کیسے ہی ناقابل تردید ہوں۔

۱۴۳۔ سلیمان علیہ السلام کا زمانۂ سلطنت ۹۶۵ ق م سے لے کر ۹۲۶ ق م تک ہے۔

۱۴۴۔ یہ ذکر جس طریقے سے ہوا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کو وہ خدا کی طرف سے اُن کے حسن عمل کے صلے میں انعام کے طور پر دیے گئے تھے۔

۱۴۵۔ سلیمان علیہ السلام کے کمال عبدیت پر یہ خود اُن کے پروردگار کی شہادت ہے۔ اِس کے بعد وہ کیا چیز ہے جس کی کوئی بندۂ مومن اِس دنیا میں تمنا کر سکتا ہے؟

۱۴۶۔ یہی صفت داؤد علیہ السلام کے لیے بھی بیان ہو چکی ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس صفت میں گویا وہ اپنے جلیل القدر باپ کا ہو بہو عکس تھے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...’عبدیت‘ کا اصلی جمال ’اوابیت‘ میں ہے، یعنی بندے کا دل ہر وقت خدا کی طرف متوجہ رہے اور اگر کبھی کسی سبب سے ذرا بھی غفلت ہو جائے تو اِس طرح ٹوٹ کر اپنے رب کی طرف گرے کہ برسوں کی منزل منٹوں میں طے کر لے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند ہے۔ گناہ سے آدمی جتنا کھوتا ہے، اُس سے کہیں زیادہ وہ اُس سے پا لیتا ہے، اگر وہ سچے دل سے گناہ کے بعد توبہ کر لیتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۶/ ۵۳۰)

۱۴۷۔ اوپر جس طرح حضرت داؤد کی اوابیت کو مثال سے نمایاں کیا ہے، اُسی طرح اب یہ حضرت سلیمان کی اوابیت کی مثال بیان ہو رہی ہے۔

اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ ۚ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوۡہَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَ الۡاَعۡنَاقِ ﴿۳۳﴾

کے لیے پیش کیے گئے (اور اُن کے دیکھنے میں وہ ایسا محو ہوا کہ نماز جاتی رہی[148]) تو اُس نے کہا: یہ تو اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر، میں مال کی محبت میں لگ گیا[149]، یہاں تک کہ آفتاب (مغرب کے) پردے میں چھپ گیا ہے[150]۔ اُن کو میرے پاس واپس لاؤ۔ (وہ لائے گئے) تو (غلبۂ حال میں) وہ اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر تلوار کے ہاتھ چلانے لگا[151]۔ ۳۱-۳۳

ص
۳۸

۱۴۸؎ قرآن نے یہ بات الفاظ میں بیان نہیں کی، لیکن آگے کا جملہ اِسے واضح کر رہا ہے۔

۱۴۹؎ آیت میں فعل 'اَحْبَبْتُ' حرف 'عَنْ' کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ یہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ 'اَحْبَبْتُ' یہاں اعراض یا غفلت کے مفہوم پر متضمن ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہے کہ جس نماز سے غفلت ہوئی، وہ عصر کی نماز تھی۔ اِس لیے کہ دن کے آخری حصے میں اور غروب آفتاب سے پہلے یہی نماز ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ انبیا علیہم السلام کے دین میں نماز کے اوقات ہمیشہ وہی رہے ہیں جن کے مطابق اب ہم نمازیں ادا کرتے ہیں۔

۱۵۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ'۔ اِن میں 'تَوَارَتْ' کا فاعل 'الشَّمْس' ہے جسے آیت میں حذف کر دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...عربی میں معروف و مشہور چیزوں کے لیے فعل بھی اِس طرح لاتے ہیں اور ضمیریں بھی۔ فاعل یا مرجع کو قرینے سے سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں لفظ 'عَشِیّ' کی وجہ سے قرینہ واضح تھا، اِس وجہ سے فاعل کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔" (تدبر قرآن ۵۳۱/۶)

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿٣٤﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٣٥﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً

ص ٣٨

ہم نے سلیمان کو (ایک اور) آزمایش میں بھی ڈالا تھا اور اُس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا تھا۔[152] پھر اُس نے رجوع کیا[153] (اور) دعا کی کہ میرے پروردگار، مجھے معاف فرما دے اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا

۱۵۱؎ آیت میں لفظ 'طَفِقَ' اشارہ کر رہا ہے کہ یہ غلبۂ حال ہی کی ایک صورت تھی۔ اِس طرح کی کیفیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بھی طاری ہو گئی تھی۔ قرآن نے یہ واقعہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، سلیمان علیہ السلام کے جوش انابت اور غلبۂ اوابیت کے اظہار کے لیے سنایا ہے اور اِس لحاظ سے یہ بلاشبہ ایک شان دار واقعہ ہے۔ اِس سے دین و شریعت کے اصول وضوابط اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۱۵۲؎ یعنی ایسا بے بس اور غم زدہ بنا دیا تھا کہ اُس کے تخت پر گویا صرف ایک جسم پڑا ہوا رہ گیا جس میں سے روح نکل گئی تھی۔ یہ اُن حالات کی طرف اشارہ ہے، جب دشمنوں نے یورش کر کے اُن کے بیش تر علاقے چھین لیے اور باقی مقامات پر بھی ایسی گڑبڑ پھیلا دی تھی کہ نظم حکومت بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان اُس زمانے میں اپنے دارالحکومت میں بالکل محصور و مجبور ہو کر رہ گئے تھے۔ قرآن نے اِس پوری صورت حال کو کمال بلاغت کے ساتھ ایک جملے میں سمیٹ دیا ہے کہ ہم نے سلیمان کو اُس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا۔

۱۵۳؎ یعنی ایسے حالات میں بھی وہ مایوس نہیں ہوئے، بلکہ یہ خیال کر کے کہ شاید کسی غلطی پر اُن کی پکڑ ہوئی ہے، وہ توبہ و استغفار کے لیے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾
وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِى الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾

نہیں[۱۵۴]۔ بے شک، تو بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ سو ہم نے ہوا کو اُس کی خدمت میں لگا دیا جو اُس کے حکم سے، جدھر وہ جانا چاہتا تھا، ساز گار ہو کر چلتی تھی[۱۵۵]۔ ۳۴-۳۶

اور سرکش جنوں کو بھی اُس کے لیے مسخر کر دیا، ہر طرح کے ماہر معماروں اور غوطہ خوروں کو، (جو کام میں لگے رہتے) اور اُن کے علاوہ دوسروں کو بھی، جو زنجیروں میں بندھے رہتے تھے[۱۵۶]۔ ۳۷-۳۸

۱۵۴؎ یعنی میرے گناہوں کے باوجود ایسی بادشاہی دے جس کا سزاوار نہ میں ہوں، نہ میرے بعد کوئی اور ہو گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس دعا میں اصلی زور بادشاہی کی بے مثال عظمت و شوکت پر نہیں، بلکہ بلا استحقاق بادشاہی دیے جانے پر ہے کہ مجھے میرے گناہوں کے باوجود بادشاہی دے، جب کہ میرے بعد کوئی اور اِس کا سزاوار نہیں ٹھیرے گا۔ اِس دعا میں اپنے گناہ کا جو شدید احساس ہے، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی غایت خشیت و انابت کی دلیل ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۵۳۴)

۱۵۵؎ مطلب یہ ہے کہ بادبانی نظام کو وہ ایسی ترقی دینے میں کامیاب ہو گئے کہ اُس سے ہواؤں کو اِس طرح کنٹرول کیا جا سکتا تھا کہ سخت سے سخت طوفانی ہوائیں بھی سفر کے لیے ساز گار ہو جاتی تھیں اور اُن کے جہاز، جہاں وہ چاہتے، بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ جاتے تھے۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'اَصَابَ' استعمال ہوا ہے، یعنی جس مقام کو چاہتے اپنا ہدف بنا لیتے اور جب چاہتے، وہاں کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔

۱۵۶؎ یعنی ایک ایسا علم بھی اُس کو عطا فرمایا تھا کہ اُس سے شریر جنوں کو مسخر کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اُن میں سے کچھ کو پکڑ کر کاموں میں لگا دیا جاتا اور کچھ زنجیروں میں قید پڑے رہتے تھے

ص ۳۸

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾
وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ

یہ ہماری بے حساب بخشش ہے،[۱۵۷] اب تم (لوگوں کو دو اور) احسان کرو یا اُس کو روکے رکھو۔[۱۵۸] (ہم نے سلیمان سے کہا تھا) اور ہمارے پاس (آگے بھی) یقیناً اُس کے لیے تقرب کا خاص مقام اور اچھا انجام ہے۔ ۳۹-۴۰

اور ہمارے بندے ایوب[۱۵۹] کو یاد کرو، جب اُس نے اپنے رب سے فریاد کی[۱۶۰] کہ

ص ۳۸

کہ ضرورت کے وقت کام میں لگائے جا سکیں۔ آیت میں اُن کے لیے 'كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں لفظ 'كُلّ' ہمارے نزدیک صفت کی تاکید کے لیے ہے، جیسے 'هو العالم كل العالم'۔

۱۵۷؎ یعنی تمھارے قیاس وگمان اور امیدوں اور توقعات سے ماورا جس کا تم خواب وخیال میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔

۱۵۸؎ یہ اُس اختیار کا بیان ہے جو ہر مالک کو اُس کی ملکیت میں حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دینا چاہے یا روکنا چاہے، یہ سب اُس کی صواب دید تھی۔ وہ اپنی ملکیت میں اخلاقی حدود کے اندر جس طرح چاہے، تصرف کر سکتا تھا۔

۱۵۹؎ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی طرح یہ بھی اسرائیلی پیغمبر تھے جو غالباً نویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت ہوئے۔

۱۶۰؎ اِس فریاد کا ایک پس منظر ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...سفر ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب کو بڑی دولت وحشمت حاصل تھی، لیکن

بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ

شیطان نے مجھے سخت دکھ اور آزار میں مبتلا کر رکھا ہے[161]۔ ہم نے ہدایت کی کہ اپنا پاؤں زمین پر مارو[162]۔ (اُس نے مارا تو ایک چشمہ نکل آیا[163]۔ فرمایا): یہ تمھارے

اِس کے باوجود وہ نہایت خداترس اور عبادت گزار بندے تھے۔ اُن کی اِس حالت پر شیطان اور اُس کے ایجنٹوں کو بڑا حسد ہوا اور اُنھوں نے اُن کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اگر ایوب دن رات خدا کی عبادت ہی میں لگے رہتے ہیں تو یہ کیا کمال ہوا، خدا نے جب اتنا مال و اسباب دے رکھا ہے تو عبادت نہ کریں تو اور کیا کریں، ہم تو جب جانیں، جب خدا یہ ساری چیزیں اُن سے چھین لے اور پھر بھی وہ اُس کے عبادت گزار رہیں! بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے اُن کو محروم کر دیا۔ نہ اُن کے پاس مال کے قسم کی کوئی چیز باقی رہ گئی اور نہ اولاد و احفاد اور خدم و حشم باقی رہ گئے۔ لیکن وہ اِس عظیم مصیبت سے مایوس نہیں ہوئے، بلکہ اپنے رب کے حضور سجدے میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا پیدا ہوا تھا اور اب ننگا ہی اپنے رب کے پاس جاؤں گا۔ سفر ایوب میں ہے کہ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ تو نے میرے بندے کو دیکھ لیا کہ سب کچھ چھن جانے کے بعد بھی وہ میرا ہی ہے۔ اِس پر شیطان نے کہا کہ یہ مال و اولاد کا معاملہ تھا، اِس وجہ سے وہ صبر کر گیا، میں تو جب جانوں، جب تو اُس کو شدید قسم کے جسمانی آزاروں میں مبتلا کرے اور پھر بھی وہ تیرا عبادت گزار رہ جائے! چنانچہ اِس کے بعد وہ ایسے شدید قسم کے جسمانی آزار میں مبتلا ہوئے کہ سفر ایوب میں اِس کی تفصیل پڑھیے تو دل کانپ جاتا ہے۔ لیکن اِس کے بعد اُن کی انابت اللہ کی طرف اور بڑھ گئی اور اِس آزمایش میں بھی اُنھوں نے شیطان کو شکست دے دی۔'' (تدبر قرآن ۶/۵۳۹)

۱۶۱؎ اپنے دکھ اور آزار کو ایوب علیہ السلام نے شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ سبب کے پہلو سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... بندے کو جو آزمایشیں پیش آتی ہیں، وہ پیش تو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آتی ہیں،

وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ

نہانے اور پینے کے لیے ٹھنڈا پانی ہے۔ (اِس سے شفا ہو جائے گی۔ پھر) اُس کے اہل وعیال بھی ہم نے اُسے دوبارہ عطا فرمائے اور اُن کے ساتھ اتنے ہی اور بھی،[۱۶۴] اِس لیے کہ اُس پر اپنی طرف سے رحمت فرمائیں اور اِس لیے کہ عقل والوں کو یاددہانی ہو۔[۱۶۵] اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا لو اور اُس سے اپنے

ص
۳۸

لیکن اُن کے پیش آنے میں ایک اہم عامل شیطان بھی ہوا کرتا ہے۔ اِس وجہ سے مشیت و قدرت کے پہلو سے وہ خدا کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور سبب کے پہلو سے شیطان کی طرف۔ اِسی پہلو سے حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے دکھ اور آزار کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔'' (تدبر قرآن ۵۳۹/۶)

۱۶۲؎ یعنی جب اُنھوں نے شیطان کو شکست دے دی تو ہم نے یہ ہدایت فرمائی۔

۱۶۳؎ یہ کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ دریاؤں کے کنارے زمین کی بالائی سطح کو ہاتھ یا پاؤں سے کریدا جائے تو اِس طرح کی سوتیں اکثر پھوٹ پڑتی ہیں۔

۱۶۴؎ سفر ایوب میں اِس کی تفصیل ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

''...خداوند نے ایوب کو، جتنا اُس کے پاس پہلے تھا، اُس کا دوچند دیا۔ تب اُس کے سب بھائی اور سب بہنیں اور اُس کے سب اگلے جان پہچان اُس کے پاس آئے اور اُس کے گھر میں اُس کے ساتھ کھانا کھایا... یوں خداوند نے ایوب کے آخری ایام میں ابتدا کی نسبت زیادہ برکت بخشی اور اُس کے پاس چودہ ہزار بھیڑ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ اور ہزار جوڑی بیل اور ہزار گدھیاں ہو گئیں۔ اُس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں بھی ہوئیں ...اور اِس کے بعد ایوب ایک سو چالیس برس جیتا رہا اور اپنے بیٹے اور پوتے چوتھی پشت تک دیکھے۔'' (۴۲: ۱۰-۱۶)

وَلَا تَحۡنَثۡ ؕ اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

آپ کو مارو اور (اپنے کو سزا دینے کی جو قسم تم نے کھالی تھی،[166] اُس میں) حانث[167] نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اُسے (ہر حال میں) صابر پایا۔ کیا ہی خوب بندہ تھا! کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔[168] ۴۱-۴۴

۱۶۵؎ یعنی اِس بات کی یاددہانی کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے بندوں کی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے اُنھیں سخت ترین آزمایشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تاہم یہ آزمایشیں ایک حد سے متجاوز نہیں ہوتیں اور جو چیز اِن سے نجات کا باعث بنتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت ہی ہے۔

۱۶۶؎ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ ابتلا کے زمانے میں کوئی ایسی بات اُن کے منہ سے نکل گئی جو صبر اور انابت الی اللہ کے منافی تھی۔ اِس پر اُنھوں نے قسم کھالی کہ وہ اپنے آپ کو سزا دیں گے اور اِس کے لیے اتنے کوڑے ماریں گے۔

۱۶۷؎ قسم اگر اللہ کی یا اپنے نفس کی یا دوسروں کی حق تلفی کا باعث بن رہی ہو تو اُسے توڑ دینا ضروری ہے۔ لیکن یہ چونکہ عہد و پیمان پر خدا کی گواہی ہوتی ہے اور عہد و پیمان کا معاملہ دین میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اِس وجہ سے اُن کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ اِس طریقے سے رسمی طور پر اُس کو پورا کر لیں۔ اِس سے اُنھیں کوئی ناروا تکلیف بھی نہیں پہنچے گی اور قسم بھی پوری ہو جائے گی۔ دین میں قسم کا کفارہ اِسی طرح کی صورت حال کے لیے مقرر کیا گیا ہے، مگر ایوب علیہ السلام اُس وقت نہ کوئی مالی کفارہ ادا کرنے کے قابل تھے، نہ جسمانی۔ چنانچہ یہی ایک صورت رہ جاتی تھی جس سے وہ اپنے دل کی تسکین کر سکتے تھے۔ یہ ایک بندۂ مومن کو بے جا اذیت سے بچانے کے لیے خدا کی عنایت تھی۔ اِس سے حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی کے کسی کام سے بچنے کے لیے حیلے تراشنے کا جواز پیدا کرنے کی جسارت نہیں

وَاذۡكُرۡ عِبٰدَنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ اُولِى الۡاَيۡدِىۡ وَالۡاَبۡصَارِ ۝٤٥ اِنَّاۤ اَخۡلَصۡنٰهُمۡ بِخَالِصَةٍ ذِكۡرَى الدَّارِ ۝٤٦ وَاِنَّهُمۡ عِنۡدَنَا لَمِنَ الۡمُصۡطَفَيۡنَ الۡاَخۡيَارِ ۝٤٧

وَاذۡكُرۡ اِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَذَا الۡكِفۡلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ الۡاَخۡيَارِ ۝٤٨

ص ۳۸

اور ہمارے بندوں، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو، قوت[169] اور بصیرت والے۔ ہم نے اُن کو ایک خاص کام ــــ اُس گھر[170] کی یاددہانی ــــ کے لیے منتخب کیا تھا اور یقیناً وہ ہمارے ہاں برگزیدہ اور نیک بندوں میں سے تھے۔ ۴۵-۴۷

اور اسمٰعیل اور یسع[171] اور ذوالکفل[172] کو یاد کرو۔ یہ سب بھی اخیار میں سے تھے۔ ۴۸

کرنی چاہیے۔

۱۶۸؎ یہی صفت سلیمان علیہ السلام کے تذکرے میں بھی نمایاں کی گئی ہے۔ اِس سے اُس مقصد کی طرف توجہ ہوتی ہے جو اِن سرگذشتوں کے سنانے سے پیش نظر ہے۔

۱۶۹؎ یہ اُس پدرسرانہ قسم کی سرداری کی طرف اشارہ ہے جو اِن جلیل القدر پیغمبروں کو اپنے لوگوں میں حاصل تھی۔

۱۷۰؎ یعنی آخرت کے گھر کی۔ انبیا علیہم السلام اصلاً اُسی کی منادی کے لیے مبعوث ہوئے۔

۱۷۱؎ اِس سے ملتے جلتے نام کے جن دو پیغمبروں کا ذکر بائیبل میں ہوا ہے، اُن میں سے الیشع قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ اِن کا زمانہ ۸۱۳ ق م بتایا جاتا ہے۔ یہ دریاے اردن کے کنارے ایک مقام ابیل محولہ کے رہنے والے تھے۔ دوسرے یسعیاہ ہیں جن کا زمانہ ۶۲۰ ق م بتایا گیا ہے۔

۱۷۲؎ اِن کی سرگذشت حیات پردۂ خفا میں ہے۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ یہ بھی اُن

هٰذَا ذِكۡرٌ ؕ وَاِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ لَحُسۡنَ مَاٰبٍ ۙ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدۡنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الۡاَبۡوَابُ ۚ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيۡنَ فِيۡهَا يَدۡعُوۡنَ فِيۡهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَعِنۡدَهُمۡ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ اَتۡرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِيَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزۡقُنَا مَا لَهٗ مِنۡ نَّفَادٍ ۚۖ﴿۵۴﴾ هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيۡنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۙ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصۡلَوۡنَهَا ۚ فَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۵۶﴾ هٰذَا ۙ فَلۡيَذُوۡقُوۡهُ حَمِيۡمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنۡ شَكۡلِهٖۤ اَزۡوَاجٌ ؕ﴿۵۸﴾

ص
۳۸

یہ یاددہانی ہے۔ (اِس سے یاددہانی حاصل کرو) اور (یاد رکھو کہ) اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، ہمیشہ کے باغ جن کے دروازے اُن کے لیے کھلے ہوئے ہوں گے۔[۴۳ا] وہ اُن میں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اُن میں بہت سے میوے اور مشروبات (اپنے خدام سے) طلب کر رہے ہوں گے۔ اُن کے پاس شرمیلی ہم سن، عورتیں ہوں گی ـــــ یہ وہ چیز ہے جس کا حساب کے دن کے لیے تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ بے شک، یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ ۴۹-۵۴

ایک طرف یہ اور دوسری طرف سرکشوں کے لیے یقیناً بدترین ٹھکانا ہے، جہنم جس میں وہ جا پڑیں گے۔ سو کیا ہی برا مقام ہے! یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اِس کو چکھیں اور اِسی قسم کی دوسری چیزیں بھی (اُن کے لیے موجود) ہوں

پیغمبروں میں سے ہیں جن کا امتیازی وصف صبر ہے۔

۴۳ا یعنی پہلے سے کھول دیے جائیں گے، جیسے معزز مہمانوں کے استقبال کے لیے

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۗ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۗ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿۶۱﴾ وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ

ص
۳۸

گی۔ ۵۵-۵۸

(اُنھیں بتایا جائے گا: یہ تمھارے پیرووں کی بھیڑ چلی آ رہی ہے)۔ یہ بھیڑ بھی تمھارے ساتھ ہی داخل ہونے والی ہے۔ فوراً کہیں گے: اِن پر خدا کی مار! یہ تو آگ میں پڑنے والے ہیں۔ پیرو جواب دیں گے: بلکہ تم، تم پر خدا کی مار! یہ (جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں) تمھی ہمارے آگے لائے ہو۔[۱۷۴] سو کیا ہی برا ٹھکانا ہو گا! (اُس وقت) کہیں گے: اے ہمارے رب، یہ جو اِس کو ہمارے آگے لائے ہیں، اِن کو تو اِس (بھڑکتی) آگ میں دونا عذاب دے۔ ۵۹-۶۱

(اِس کے بعد ایک دوسرے سے) پوچھیں گے: کیا بات ہے، ہم اُن لوگوں کو یہاں نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو ہم بروں میں گنا کرتے تھے؟[۱۷۵] کیا (اِس لیے کہ) ہم نے یونہی

کھول دیے جاتے ہیں۔

۱۷۴؎ اِس فقرے میں مبتدا کا اعادہ بھی ہے اور دو مبتداؤں کے بیچ میں ایک جملۂ معترضہ بھی۔ ایک ایک لفظ سے غصہ گویا ابل رہا ہے۔

۱۷۵؎ یعنی اُن لوگوں میں گنا کرتے تھے جو دین آبائی کے دشمن ہیں، ہمارے معبودوں کی توہین کرتے ہیں اور قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔

تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾

ص
۳۸

(محض شرارت سے) اُن کو مذاق بنالیا تھا یا (وہ بھی یہاں موجود ہیں اور) اُن سے ہماری نگاہیں چوک رہی ہیں؟ کچھ شک نہیں، اہل دوزخ کی یہ تو تکار ایک واقعی بات ہے جو ہو کر رہنی ہے۔ ۶۲-۶۴

اِن سے کہو، (اے پیغمبر) کہ میں تو صرف ایک خبردار کرنے والا ہوں۔ (اپنے معبودوں کے بل پر تم میرے انذار سے بے پروا ہو رہے ہو تو سن لو کہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، یکتا اور سب پر غالب۔ وہی زمین اور آسمانوں اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، سب کا پروردگار ہے، زبردست اور بخشنے والا۔ کہو کہ جس سے میں خبردار کر رہا ہوں، وہ ایک بڑی خبر[۱۷۶] ہے اور تم اُس سے اعراض کیے ہوئے ہو۔ ۶۵-۶۸

مجھے عالم بالا کی کچھ خبر نہ تھی، جب دوزخ کے لوگ وہاں جھگڑ رہے ہوں گے۔[۱۷۷] (یہ وحی کی باتیں ہیں اور) مجھے یہ وحی صرف اِس لیے کی جاتی ہے کہ میں (خدا کی طرف سے) ایک کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ ۶۹-۷۰

۱۷۶؎ یعنی عذاب اور قیامت کی خبر۔

اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۱﴾ فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۷۲﴾ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمۡ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اِسۡتَكۡبَرَ وَ كَانَ مِنَ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِیۡنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِیۡمٌ ﴿۷۷﴾ وَّ اِنَّ عَلَیۡكَ لَعۡنَتِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ

ص ۳۸

(اِن کے انکار کی وجہ بھی وہی ہے، اے پیغمبر، جو ابلیس کی تھی)۔ اِنھیں وہ قصہ سناؤ، جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اُس کو درست کرلوں اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ چنانچہ فرشتے، سب کے سب اکٹھے سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نہیں گرا۔ اُس نے گھمنڈ کیا اور منکروں میں سے ہو گیا۔ پروردگار نے فرمایا: اے ابلیس، تجھے کیا چیز اُس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے[۱۷۸]؟ یہ تو نے تکبر کیا یا (اپنے زعم میں) تو کوئی برتر ہستی ہے؟ اُس نے جواب دیا: میں اِس سے کہیں بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اِس کو مٹی سے پیدا کیا ہے[۱۷۹]۔ فرمایا: اچھا تو یہاں سے[۱۸۰] نکل جا، اِس لیے کہ تو راندۂ درگاہ

۱۷۷؎ یہ اُسی تو تکار کا حوالہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۱۷۸؎ یعنی اہتمام کے ساتھ اپنے دست قدرت سے تخلیق کیا ہے۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ

الدِّيْنِ ﴿۷۸﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۷۹﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۲﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۸۳﴾ قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ﴿۸۴﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۵﴾

ص
۳۸

ہے اور تجھ پر اب جزا کے دن تک میری لعنت ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار، پھر مجھے اُس دن تک مہلت دے، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: جا، تجھے اُس دن تک کی مہلت ہے جس کا وقت معین ہے۔ اُس نے کہا: پھر مجھے بھی تیری عزت کی قسم، میں اِن سب کو گم راہ کر کے رہوں گا،[۱۸۱] تیرے اُن بندوں کے سوا جنھیں تو نے اُن میں سے خاص کر لیا ہو۔ فرمایا: تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں تجھ سے اور اُن سب لوگوں سے جہنم کو بھر دوں گا جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے۔[۱۸۲] ۷۱-۸۵

اپنی تخلیق کے اعتبار سے انسان فی الواقع خدا کا ایک شاہ کار ہے اور بڑے غیر معمولی اوصاف اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔

۱۷۹؎ قریش کے لیڈر بھی اِسی طرح کے زعم میں مبتلا تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے رئیس پر کیوں نہیں اتارا گیا؟ یہ اِسی بے مایہ شخص پر کیوں اترا ہے؟

۱۸۰؎ آیت میں 'مِنْهَا' کا لفظ ہے۔ اِس میں ضمیر کا مرجع وہی جنت ہے جس میں آدم کو رکھا گیا اور اُن کے آگے جنات اور فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا گیا تھا۔

قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ ﴿۸۶﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۷﴾ وَلَتَعۡلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعۡدَ حِيۡنٍ ﴿۸۸﴾

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ میں (یہ قرآن سنا رہا ہوں تو) اِس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں اپنے کو بنا کر پیش کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ تو صرف ایک یاددہانی ہے، دنیا والوں کے لیے، اور یقین رکھو کہ جو خبر یہ دے رہا ہے، اُس کی حقیقت تم کو تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جائے گی۔ ۸۶-۸۸

ص
۳۸

۱۸۱؎ یعنی تیری اُس اسکیم کو، جہاں تک ممکن ہوا، ناکام بنانے کی کوشش کروں گا جس کے تحت تو نے اپنی جنت کے لیے اولادِ آدم کو منتخب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۸۲؎ اِس میں، ظاہر ہے کہ مخاطبین کے لیے تنبیہ ہے کہ اِس آئینے میں وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں۔

کوالالمپور

۲۵ر مئی ۲۰۱۴ء

مرحلۂ ہجرت و براءت

الزمر - الاحقاف

۳۹ —— ۴۶

الزمر - المؤمن

٣٩ ـــــ ٤٠

الزمر ۔ المؤمن

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں میں انذار و بشارت کے ساتھ توحید پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔ پہلی سورہ میں، البتہ اثبات اور دوسری میں منکرین کے لیے تنبیہ و انذار اور اہل ایمان کے لیے تسلی، تشویق اور حوصلہ افزائی کا پہلو نمایاں ہے۔ اِسی طرح جو لوگ ابھی تذبذب میں تھے، اُنھیں بھی رہنمائی دی گئی ہے کہ مصلحتوں سے بے پروا ہو کر وہ بھی آگے بڑھیں اور دعوت حق کی اِس جدوجہد میں پیغمبر کے ساتھی بن جائیں۔ دونوں کی ابتدا الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی آیت سے ہوئی ہے۔ اِس سے خود قرآن نے اِن کے اِس تعلق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور الفاظ کے اِس فرق سے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ پہلی سورہ میں خدا کی حکمت اور دوسری میں اُس کا علم بنائے استدلال ہے۔

اِن سورتوں سے آگے مزید چھ سورتوں کے مطالب بھی کم و بیش وہی ہیں جو اوپر سورۂ 'المؤمن' کے بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اِن کا نام بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ہی، یعنی 'حٰم' رکھا ہے اور اِسی بنا پر یہ حوامیم کہلاتی ہیں۔

دونوں سورتوں کے مخاطب قریش ہیں اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورة الزمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۲﴾ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے، نہایت اہتمام کے ساتھ، جو زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[1]۔ ہم نے، (اے پیغمبر)، اِس کتاب کو تمھاری طرف قول فیصل کے ساتھ اتارا ہے[2]۔ سو اللہ ہی کی بندگی کرو، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے[3]۔ سنو، خالص اطاعت اللہ ہی کے لیے ہے[4]۔ اللہ کے سوا جن

---

۱ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قرآن کے مکذبین کے لیے تہدید و وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے، اُس کے ارادوں میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر لوگوں کو ڈھیل دے رہا ہے تو یہ اُس کی حکمت کا تقاضا ہے اور ڈھیل کے اِس عرصے میں اگر کچھ مزاحمتیں اِس کتاب کے منکرین کی طرف سے پیش آ رہی ہیں تو اُنھیں بھی اِسی حکمت پر محمول کرنا چاہیے۔ اِس لیے یہ منکرین بھی متنبہ ہوں اور آپ بھی مطمئن رہیے، اُس کا فیصلہ صادر ہو جائے گا تو کوئی اُسے ٹالنے والا نہیں ہو گا۔

۲ یعنی شرک اور توحید کے باب میں جو اختلافات پیدا کر دیے گئے ہیں، اُن کے لیے قول فیصل کے ساتھ اتارا ہے۔

لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۵ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۴﴾

لوگوں نے دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو اُن کی عبادت صرف اِس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب تر کر دیں۔[۵] اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ بے شک، اللہ اُن لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا[۶] جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔[۷] ۱-۳

(یہ احمق سوچتے نہیں کہ) اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو اولاد بنائے تو اپنی مخلوقات میں سے جو چاہتا، (اپنے لیے) خود منتخب کر لیتا۔[۸] (مگر) وہ اِس سے پاک ہے۔ وہ اکیلا خدا ہے، سب پر قابو رکھنے والا۔ ۴

۳؎ یعنی اِس طرح کہ پرستش بھی اُسی کی ہو اور کسی قید و شرط کے بغیر حکم بھی اُسی کا مانا جائے۔

۴؎ یعنی ایسی بے آمیز اطاعت جس میں نفس اور غیر، دونوں کی طرف سے کسی شرکت کا شائبہ نہ ہو۔

۵؎ دنیا بھر کے مشرکین اپنے شرک کے لیے بالعموم یہی استدلال کرتے ہیں۔

۶؎ مطلب یہ ہے کہ نہ دنیا میں ہدایت دیتا ہے اور نہ آخرت میں منزل مراد تک پہنچاتا ہے۔

۷؎ یعنی اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ اُس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے اور سب نعمتیں اُسی سے پاتے ہیں، لیکن دوسروں کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

۸؎ یعنی تمھارا انتظار نہ کرتا کہ تم اپنی طرف سے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کرو، بلکہ خود فیصلہ کرتا اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اعلان کر دیتا کہ فلاں اور فلاں کو اُس نے

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۵﴾
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ

زمین اور آسمانوں کو اُس نے مقصد سے پیدا کیا ہے[9]۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور سورج اور چاند کو اُسی نے مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک وقت مقرر کے لیے چلا جا رہا ہے[10]۔ سنو، وہی زبردست ہے، بڑا ہی بخشنے والا ہے[11]۔ ۵

اُسی نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا

اپنا بیٹا یا بیٹی بنایا ہے۔

۹ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ تمھارے مشرکانہ اوہام کے مطابق اپنے انجام کو پہنچیں اور اِس کے نتیجے میں حق و باطل میں سرے سے کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے۔

۱۰ مطلب یہ ہے کہ اُس نے صرف بنایا ہی نہیں، اپنی مخلوقات کا نظم بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے۔ کسی کا یارا نہیں ہے کہ اُس میں کسی نوعیت کی کوئی مداخلت کر سکے۔ چنانچہ سورج، چاند اور دوسرے سیاروں اور ستاروں کے لیے جو منزل مقرر کر دی گئی ہے، ہر ایک وقت مقرر کی پابندی کے ساتھ اُسی کے لیے چلا جا رہا ہے، کوئی اُسے اپنی راہ سے بے راہ نہیں کر سکتا۔

۱۱ یعنی کوئی نہ اُس پر غلبہ پا کر اُس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکتا ہے اور نہ اپنی طرف سے کسی کو بخشش کی امید دلا سکتا ہے۔ اُس کے بندے اگر مغفرت کا حق پیدا کر لیں تو وہ خود سب سے بڑھ کر بخشنے اور درگذر فرمانے والا ہے۔

البیان

الزمر ۳۹

لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿٦﴾

اور تمھارے لیے چوپایوں کی آٹھ قسمیں[12] اتاریں[13]، نر و مادہ۔ (اِس لیے کہ اُن سے اپنی معیشت کی ضرورتیں پوری کرو)۔ تمھاری ماؤں کے پیٹ میں وہ ایک کے بعد دوسری خلقت میں[14] تمھیں تین اندھیروں کے اندر[15] پیدا کرتا ہے۔ وہی اللہ تمھارا پروردگار ہے۔ اُسی کی بادشاہی ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کہاں بھٹکا دیے جاتے ہو[16]! ۶

۱۲؎ اصل میں 'ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'زَوْج' کا لفظ جوڑے کے لیے بھی آتا ہے اور جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی۔ یہاں یہ اِسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اِس سے بھیڑ، بکری، اونٹ اور گاے کے نر و مادہ مراد ہیں۔ عرب میں یہی چوپایے معروف تھے۔

۱۳؎ آیت میں چوپایوں کے لیے 'اَنْزَلَ لَكُمْ' کے الفاظ بالکل اُسی طرح آئے ہیں، جس طرح لوہے کے لیے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ 'وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ'۔ اِس سے مقصود لوگوں کو ہر چیز کے منبع کی طرف توجہ دلانا ہے۔

۱۴؎ یعنی نطفہ، علقہ وغیرہ جن کا ذکر دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ ہوا ہے۔

۱۵؎ یہ پیٹ، رحم اور مشیمہ (وہ جھلی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے) کے تہ بر تہ اندھیروں کی طرف اشارہ ہے۔

۱۶؎ اصل میں لفظ 'تُصْرَفُوْنَ' استعمال ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... 'تُصْرَفُوْنَ' مجہول کا صیغہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اِن واضح حقائق فطرت کے بعد کسی غلط سمت میں بھٹکنے کی گنجایش تو نہیں تھی، لیکن تم نے، معلوم نہیں، کس شیطان کے ہاتھ میں اپنی باگ پکڑا دی ہے جو تمھیں گم راہی کی وادیوں میں گردش کرا رہا ہے؟''

(تدبر قرآن ۶/۵۶۶)

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى ۗ ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٧﴾
وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ

الزمر ۳۹

اگر تم ناشکری کرو گے[۱۷] تو اللہ کا کچھ نہیں بگاڑو گے، اِس لیے کہ اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ ہاں، وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر شکر گزار ہو گے تو اُس کو وہ تمھارے لیے پسند کرے گا۔[۱۸] (یاد رکھو، قیامت کے دن) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمھاری واپسی تمھارے پروردگار ہی کی طرف ہو گی[۱۹]، تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو، وہ تمھیں بتا دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ ۷

انسان (کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اُس) کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو کر اُس کو پکارتا ہے۔ پھر جب اُس کا پروردگار اپنی

۱۷؎ یعنی اِس کے باوجود ناشکری کرو گے کہ خود بھی جانتے ہو کہ تمھاری پیدایش اور پرورش میں خدا کے سوا کسی اور کو کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۸؎ اور اِس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت، دونوں میں اپنی نعمتوں اور برکتوں سے تمھیں نوازے گا۔

۱۹؎ یعنی پروردگار ہی کی طرف ہو گی، تمھارے مزعومہ دیوی دیوتاؤں کی طرف نہیں ہو گی۔

لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴿٨﴾

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ

طرف سے اُس کو فضل عطا فرماتا ہے تو پہلے جس چیز کے لیے پکار رہا تھا، اُس کو بھول جاتا ہے اور اللہ کے شریک ٹھیرانے لگتا ہے کہ اُس کی راہ سے لوگوں کو گم راہ کرے[۲۰]۔ اِس سے کہو، (اے پیغمبر) کہ تھوڑے دن اپنے اِس کفر کے ساتھ بہرہ مند ہولو، اِس میں شبہ نہیں کہ بالآخر تم دوزخ والوں میں ہوگے۔ ۸

(لوگو)، کیا وہ جو رات کی گھڑیوں[۲۱] میں (اپنے پروردگار کے آگے) کبھی سجدے اور کبھی قیام میں عاجزی کرنے والے ہیں، آخرت سے اندیشہ ناک اور اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار ہیں[۲۲] اور جو اپنے شریکوں کے سہارے پر اُس کو بھلائے ہوئے ہیں، برابر ہو جائیں گے[۲۳]؟ اِن سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے

۲۰؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ یہاں قریش کے ائمۂ کفر کا معاملہ زیر بحث ہے جو خدا کی راہ سے خود بھی برگشتہ تھے اور دوسروں کو بھی اُس سے برگشتہ کرتے تھے۔

۲۱؎ یعنی اُس وقت، جب کوئی نہیں دیکھتا اور بندے کی عبادت ریا کے ہر شائبے سے پاک ہوتی ہے۔

۲۲؎ یہ اُن کی نماز کے باطن کا بیان ہے جو نرم بستروں سے اٹھا کر اُنھیں خدا کے حضور میں کھڑا کر دیتا ہے۔

۲۳؎ جملے کا یہ حصہ اصل میں محذوف ہے جو متکلم کے زور بیان سے واضح ہو رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۹﴾

قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَۃٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّی

والے کبھی یکساں ہو سکتے ہیں[۲۴]؟ حقیقت یہ ہے کہ (اِن سب باتوں سے) یاددہانی تو عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں[۲۵]۔ ۹

(اِنھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو، اے پیغمبر، اور میرے بندوں سے) کہہ دو کہ میرے بندو جو ایمان لائے ہو، تم اپنے رب سے ڈرتے رہو (اور یاد رکھو کہ) جو لوگ اِس دنیا میں بھلائی اختیار کریں گے، اُن کے لیے آخرت میں بھلائی

''... یہ اسلوب متکلم کی شدت یقین پر بھی دلیل ہوتا ہے اور اِس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اِس سوال کے جواب میں مخاطب کے لیے کسی اختلاف کی گنجایش نہیں ہے۔ مزید برآں بات کا ایک حصہ بغیر اظہار کے ظاہر ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۷۰)

۲۴۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قرآن کے نزدیک اہل علم وہی ہیں جن کے اوصاف اوپر بیان ہوئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... جن کے اندر یہ صفت موجود نہیں ہے، وہ قرآن کے نزدیک علم سے عاری ہیں، اگرچہ وہ چاند اور مریخ تک سفر کر آئیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی رہنمائی کے لیے اصلی علم یہ ہے کہ انسان کو یہ پتا ہو کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ہے، کہاں منتہی ہوگی، اِس کے خالق کی صفات کیا ہیں اور اُس کے ساتھ انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اگر اِس علم کی کلید اُس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اپنی زندگی کا مقصد و منتہا سمجھ جائے گا۔ اور اگر یہ علم حاصل نہ ہو سکا تو وہ اندھیرے میں ہے، اگرچہ وہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپ ڈالے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۷۲)

۲۵۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ یہ نہیں مان رہے تو اِس میں آپ کا یا قرآن کا کوئی قصور نہیں ہے، بلکہ یہ لوگ ہی علم و عقل سے عاری ہیں۔

الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾
قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴿۱۱﴾
وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ
عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳﴾
قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ
مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ
وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۵﴾

الزمر
۳۹

ہے۔ (تمھارے وطن کی زمین اگر تمھارے لیے تنگ کر دی گئی ہے تو مایوس نہ ہو)، خدا کی زمین وسیع ہے، (وہ اُس کی راہیں تمھارے لیے کھول دے گا اور اُس کے) جو (بندے اِن آزمایشوں میں) ثابت قدم رہیں گے، اُنھی کے لیے اُن کا صلہ بے حساب پورا کیا جائے گا۔ ۱۰

کہہ دو کہ مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے اور حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں[۲۶]۔ کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ۱۱-۱۳

کہہ دو کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ رہے تم تو اُس کے سوا جس کی بندگی چاہو، کرو، (میں اُس سے بری ہوں)۔ کہہ دو کہ خسارے میں تو درحقیقت وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن خسارے میں ڈال دیا۔ سنو،

۲۶؎ یعنی جس چیز کی دعوت دوسروں کو دیتا ہوں، سب سے پہلے خود اُس کو قبول کروں۔

لَهُم مِّن فَوۡقِهِمۡ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِن تَحۡتِهِمۡ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۱۶﴾
وَالَّذِيۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ يَّعۡبُدُوۡهَا وَاَنَابُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الۡبُشۡرٰى ۚ فَبَشِّرۡ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۸﴾
اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ ؕ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى

یہی کھلا ہوا خسارہ ہے۔ اُن کے لیے اُن کے اوپر سے بھی آگ کے سائبان ہوں گے اور اُن کے نیچے سے بھی۔ یہی چیز ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ میرے بندو، اِس لیے مجھ سے ڈرو۔ ۱۴-۱۶

اِس کے برخلاف جو شیطان[۲۷] سے بچے کہ اُس کی بندگی کریں اور اللہ کی طرف متوجہ رہے، اُن کے لیے خوش خبری ہے۔ سو میرے اِن بندوں کو خوش خبری دو، یہ جو بات کو توجہ سے سنتے، پھر اُس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۱۷-۱۸

پھر کیا جس پر عذاب کی بات پوری ہو چکی[۲۸] اور جس کا ٹھکانا اب دوزخ ہی ہے تو کیا

۲۷ اصل میں لفظ 'الطَّاغُوت' آیا ہے۔ اپنے مصداق کے لحاظ سے یہ واحد، جمع، مذکر، مونث، سب کے لیے آجاتا ہے اور اِس کے لیے ضمیریں بھی اِسی رعایت سے استعمال ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ یہاں مونث کی ضمیر ہے، جب کہ سورۂ نساء (۴) کی آیت ۶۰ میں ضمیر مذکر استعمال ہوئی ہے۔

۲۸ یعنی اپنے کرتوتوں کی پاداش میں جو عذاب کا مستحق ہو چکا ہے۔

الزمر ۳۹

البیان

النَّارِ ﴿۱۹﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

تم اُس کو بچاؤ گے جو دوزخ میں پڑا ہے؟ البتہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، اُن کے لیے بالاخانے اور بالاخانوں کے اوپر بھی آراستہ[29] بالاخانے ہیں۔ اُن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ ۱۹-۲۰

(یہ سمجھتے ہیں کہ اِن کے اقتدار پر زوال نہ آئے گا)؟ تم نے دیکھا نہیں، (اے پیغمبر کہ) اللہ نے آسمان سے پانی اتارا اور زمین میں اُس کے چشمے بہا دیے۔ پھر وہ اُس سے طرح طرح کے رنگ بدلتی کھیتی نکالتا ہے، پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے تو اُس کو تم دیکھتے ہو کہ زرد پڑ گئی ہے۔ پھر وہ اُس کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اِس میں، یقیناً عقل والوں کے لیے بڑی یاددہانی ہے[30]۔ ۲۱

۲۹؎ اصل میں لفظ 'مَبْنِيَّة' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں 'بنی الدار' جس طرح مکان بنانے کے مفہوم میں آتا ہے، اُسی طرح مکان آراستہ کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہ اُسی سے اسم مفعول ہے۔

۳۰؎ یعنی اِس بات کی یاددہانی کہ اِس دنیا کی ہر چیز عارضی ہے، لہٰذا ہر عاقل کی نگاہ خدا کی اُس ابدی بادشاہی پر رہنی چاہیے جو آگے اُس کی منتظر ہے۔
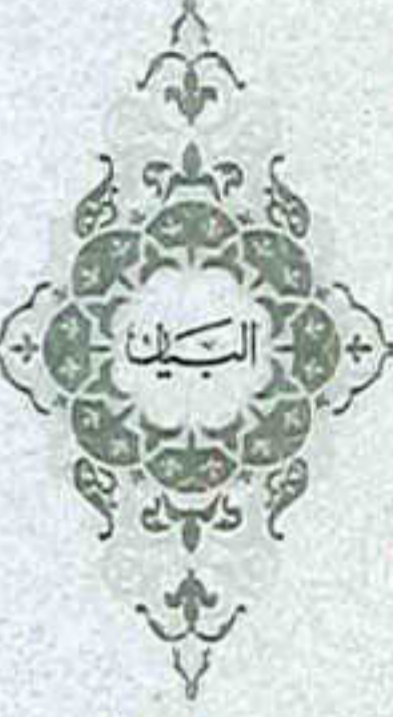
اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۲﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۖق تَقْشَعِرُّ

(اِن پر افسوس، اِن کے دل سخت ہو گئے)۔ پھر کیا وہ جن کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہیں، اُن لوگوں کے برابر ہو جائیں گے جن کے دل سخت ہو چکے ہیں؟ سو خرابی ہے اُن کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد دہانی کے معاملے میں سخت ہو گئے۔ یہی کھلی گم راہی میں ہیں۔ ۲۲

(لوگو)، اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب کی صورت میں جس کا ہر جز و دوسرے سے ہم رنگ[۳۱] اور جس کی سورتیں جوڑے جوڑے ہیں[۳۲]۔ اِس سے

الزمر
۳۹

۳۱؎ یہ ہم رنگی اور مشابہت ایسی واضح ہے کہ اِسے قرآن کا ہر قاری محسوس کر سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگر آپ قرآن کی تلاوت کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ایک مبتدی یہ دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے، لیکن قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن تکرار محض سے بالکل پاک ہے۔ اُس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتی، بلکہ ہر جگہ اُس کے اطراف و جوانب اور اُس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مقام کی مناسبت سے اُس میں مناسب حال تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے، دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے، ایک جگہ اُس کا اصل رخ غیر معین ہوتا ہے، دوسرے سیاق و سباق میں وہ رخ بالکل معین ہو جاتا ہے۔ بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے، دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں

مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ

اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کے جسم[۳۳] اور اُن کے دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک پڑتے ہیں[۳۴]۔ یہ اللہ

نہیں آتی، لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب، ظاہر ہے کہ اِسی مقصد کے لیے ہے کہ اِس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ میں بطور تحدیث نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات جتنی خود قرآن سے واضح ہوئی ہیں، دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوئی ہیں۔ میر انیس نے کہا ہے کہ:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممکن ہے خود اُن کے اپنے کلام کے بارے میں یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو، لیکن قرآن کے باب میں یہ بات بالکل حق ہے۔ ایک ایک بات اتنے گوناگوں و بوقلموں اسلوبوں سے سامنے آتی ہے کہ اگر آدمی ذہن سلیم رکھتا ہو تو اُس کو پکڑ ہی لیتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۲۸)

۳۲؎ یہ بھی، ظاہر ہے کہ اُسی مقصد سے ہے، جس کی وضاحت اوپر ہوئی ہے۔

۳۳؎ لفظ 'جُلُوْد' اِس آیت میں رونگٹوں کے معنی میں بھی آیا ہے اور پورے جسم کے معنی میں بھی۔ یہ اِس قاعدے کے مطابق ہے کہ عربی زبان میں کل بول کر جزو بھی مراد لیا جاتا ہے اور جزو بول کر کل بھی۔

۳۴؎ آیت میں لفظ 'تَلِيْنُ' آیا ہے جس کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ ہے۔ اِس سے یہ 'مَيْل' کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ اِس میں جسم کے نرم ہو کر جھک پڑنے کی جو تعبیر اختیار کی گئی ہے، اُس سے مراد یہ ہے کہ اُن کے اندر کبر و غرور کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...آدمی کے اندر کبر و غرور ہو تو اُس کی گردن تنی ہوئی، جسم اکڑا ہوا رہتا ہے اور وہ زمین پر پاؤں دھمکتے ہوئے چلتا ہے۔ برعکس اِس کے جن کے اندر خدا کا خوف ہو، اُن کے اندر فروتنی و تواضع ہوتی ہے جس کا اثر اُن کی چال ڈھال اور اُن کے جسم کی ایک ایک ادا

يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۲۳﴾
اَفَمَنۡ يَّتَّقِىۡ بِوَجۡهِهٖ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَقِيۡلَ لِلظّٰلِمِيۡنَ ذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۲۴﴾
كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَاَتٰٮهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الۡخِزۡىَ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ

الزمر ۳۹

کی ہدایت ہے، اِس سے وہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق) ہدایت بخشتا ہے (اور اُسی کے مطابق گم راہ بھی کرتا ہے)، اور جس کو اللہ گم راہی میں ڈال دے، اُسے پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔۲۳

پھر کیا جو قیامت کے دن برے عذاب کی مار اپنے چہرے پر روکے گا[۳۵]، وہ اِن ہدایت پانے والوں کے برابر ہو جائے گا؟ ایسے ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب چکھو اُس کمائی کا مزہ جو تم کرتے رہے۔۲۴

اِن سے پہلے والوں[۳۶] نے بھی اِسی طرح جھٹلا دیا تھا تو اُن پر ہمارا عذاب وہاں سے آ گیا، جہاں سے اُن کو خیال بھی نہ تھا[۳۷]۔ پھر اللہ نے اُن کو دنیا کی زندگی میں بھی

سے نمایاں ہوتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۵۸۳)

۳۵۔ یہ انتہائی بے بسی کی تصویر ہے، اِس لیے کہ آدمی، جب تک اپنی مدافعت پر کچھ بھی قادر ہوتا ہے، اپنے چہرے پر کبھی مار نہیں پڑنے دیتا۔

۳۶۔ یہ اُن قوموں کی طرف اشارہ ہے جن پر رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کیا گیا۔

۳۷۔ یہ اُس سنت کے مطابق ہوا جو رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی تکذیب کرنے والوں کے لیے مقرر ہے۔ ہم پیچھے جگہ جگہ اِس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾
وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا

رسوائی کا مزہ چکھایا[38] اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش، یہ لوگ اِس کو سمجھتے! ۲۵-۲۶

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں[39]، اِس لیے کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ایسے قرآن کی صورت میں جو عربی زبان میں ہے، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ نہیں ہے[40]، اِس لیے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچیں[41]۔ (یہ شرک اور توحید کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو) اللہ (اِن کے لیے) ایک غلام کی تمثیل بیان کرتا ہے

۳۸؎ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے حق کے مقابل میں سرکشی اور استکبار کا رویہ اختیار کیا اور اِس جرم کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت اور رسوائی کا عذاب ہی ہے۔

۳۹؎ انبیا علیہم السلام جن حقائق کی تعلیم دیتے ہیں، اُن کی تفہیم کے لیے تمثیل کا اسلوب سب سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ الہامی صحائف میں اِسی بنا پر اِسے بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ تورات، زبور، انجیل سب امثال سے معمور ہیں اور سلیمان علیہ السلام کے صحیفۂ حکمت کا تو نام ہی ''امثال'' ہے۔

۴۰؎ یعنی کوئی بات فلسفیانہ اینچ پینچ کے اسلوب میں نہیں کہی گئی، بلکہ جو کچھ فرمایا ہے، فصیح و بلیغ زبان میں اور نہایت سادہ اور دل پذیر اسلوب میں فرمایا ہے جس سے متکلم کا مدعا ہر جگہ بغیر کسی ابہام کے اور پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔

۴۱؎ یہی وہ آخری مقصد ہے جس کے لیے قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے اِس اہتمام کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔

لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ

جس میں کئی آقا شریک ہیں جو آپس میں کشمکش رکھتے ہیں[۴۲] اور ایک دوسرے غلام کی جو پورا کا پورا ایک ہی شخص کی ملکیت ہے۔ کیا اِن دونوں کا حال یکساں ہوگا؟ (ہرگز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ) شکر کا سزاوار صرف اللہ ہے، لیکن اِن میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۴۳]۔ ۲۷-۲۹

(اِن کی ہٹ دھرمی پر غم نہ کھاؤ، اے پیغمبر)۔ تم کو بھی یقیناً مرنا ہے اور یہ بھی

۴۲؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤں کے درمیان یہ کشمکش ناگزیر ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام مشرکین اپنے دیوتاؤں کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ اُن میں سے بیش تر کے درمیان ایسی رقابت اور چشمک رہتی ہے جو بعض اوقات مدتوں کے لیے جنگ و جدال کا باعث بن جاتی ہے۔

۴۳؎ یہ توحید کی نفسیاتی دلیل ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ کوئی غلام بھی اِس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ ایک آقا کی غلامی کی جگہ اُس کو ایک سے زیادہ مختلف الاغراض اور برسرِ نزاع آقاؤں کی غلامی کرنی پڑے۔ انسانی فطرت ایک خدا کی غلامی پر تو اِس وجہ سے راضی و مطمئن ہے کہ اُس کے اندر جو افتقار و احتیاج ہے، خدا کو مانے بغیر اُس کا کوئی حل نہیں ملتا۔ اِس کی دلیل اُس کے باطن میں بھی موجود ہے اور اُس کے باہر بھی۔ رہے دوسرے اصنام و آلہہ، تو ایک خدا سے جب اُس کی احتیاج پوری ہوگئی تو وہ اُن کی غلامی کا پٹا اپنی گردن میں کیوں ڈالے! اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسے مخمصے میں پھنساتا ہے جس میں پھنسنے پر کوئی ذی ہوش بھی راضی نہیں ہوتا۔'' (تدبرقرآن ۶/۵۸۵)

رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ ۚۖ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

مرنے والے ہیں۔ پھر طے ہے کہ تم سب لوگ اپنا مقدمہ قیامت کے دن اپنے پروردگار کے حضور پیش کرو گے۔ سو اُس دن اُن سے بڑھ کر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا کون ہوگا جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور سچائی کو[۴۴] جھٹلا دیا، جب کہ وہ اُن کے پاس آگئی! ایسے منکروں کا ٹھکانا کیا جہنم میں نہ ہوگا؟ ۳۰-۳۲

ہاں، جو سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے[۴۵] پورے دل کے ساتھ اُس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں، جو چاہیں گے، ہوگا۔ یہ صلہ ہے اُن کا جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں۔ اِس لیے[۴۶] کہ جو عمل اُنھوں نے کیے تھے، اُن کے بدتر انجام کو اللہ اُن سے دور کرے اور اُن کا اجر اُن کو عطا فرمائے، اُن کے اعمال کا بہترین صلہ۔[۴۷] ۳۳-۳۵

۴۴؎ یعنی قرآن کو جو سراسر سچائی ہے۔

۴۵؎ اصل میں 'صَدَّقَ بِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے پہلے 'مَنْ' وضاحت قرینہ کی بنا پر محذوف ہے۔

۴۶؎ جزا و سزا کے جس دن کا ذکر اوپر ہوا ہے، یہ اُس کے برپا کرنے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبۡدَهٗ ؕ وَيُخَوِّفُوۡنَكَ بِالَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِعَزِيۡزٍ ذِى انۡتِقَامٍ ﴿۳۷﴾

الزمر ۳۹

(تم اِن سے کیوں ڈرو، اے پیغمبر)؟ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ تم کو اُن سے ڈراتے ہیں جو اِنھوں نے اُس کے سوا بنا رکھے ہیں[۴۸]۔ (اِن کی پروا نہ کرو، اِنھیں خدا نے گم راہی میں ڈال دیا ہے) اور جنھیں خدا (اپنے قانون کے مطابق[۴۹]) گم راہی میں ڈال دے، اُنھیں پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور جنھیں خدا ہدایت بخشے، اُنھیں کوئی گم راہ کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ (اِس لیے کیوں ڈرو)؟ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے[۵۰]؟ ۳۶-۳۷

۴۷؎ آیت میں 'اَسْوَاُ' اور 'اَحْسَنُ' کے الفاظ آخرت کی جزا و سزا کے لیے استعمال ہوئے ہیں، اِس لیے کہ یہ سزا بھی ابدی ہے اور جزا بھی۔ اِس کے بعد کیا چیز ہے جو اِس سے بدتر یا بہتر ہو سکتی ہے؟

۴۸؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دعوت توحید کے جواب میں مشرکین آپ کو ڈراتے تھے کہ ہمارے معبودوں کا انکار کرتے ہو تو یاد رکھو، ایک دن یہ تمھیں برباد کر کے رکھ دیں گے۔ یہ اِنھی ڈراووں کی طرف اشارہ ہے۔

۴۹؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ اللہ اُنھی کو گم راہ کرتا ہے جو خود گم راہی اختیار کرتے اور کوئی اصلاح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

۵۰؎ یعنی اُن لوگوں سے جو اُس کے حقوق پر ڈاکا ڈالتے اور اُس کے بندوں پر ظلم کرتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾

الزمر ۳۹

اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔[۵۱] کہو، پھر تم نے سوچا ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو اللہ کے سوا جن دیویوں کو تم پکارتے ہو، کیا یہ اُس کی پہنچائی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتی ہیں؟ یا اللہ مجھ پر کوئی فضل کرنا چاہے تو کیا یہ اُس کے فضل کو روکنے والی ہو سکتی ہیں؟ کہہ دو، میرے لیے اللہ کافی ہے، بھروسا کرنے والے اُسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ ۳۸

کہہ دو کہ میری قوم کے لوگو، تم اپنے طریقے پر کام کرو، میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا۔[۵۲] پھر جلد تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُس کو رسوا کر دیتا ہے اور کس پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے جو ٹک کے رہ جاتا ہے۔[۵۳] ۳۹-۴۰

۵۱؎ یہ سوال اِس لیے کیا ہے کہ مخاطبین جس تضادِ فکر میں مبتلا ہیں، اُس کی طرف توجہ دلائی جائے۔

۵۲؎ اِس جملے میں 'عَلٰى مَكَانَتِیْ' کے الفاظ 'اِنِّیْ عَامِلٌ' کے بعد محذوف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خو نہیں چھوڑتے تو میں بھی اپنی دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں۔ میرے پروردگار نے جو کام میرے سپرد کیا ہے، میں اُس کو کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ خدا اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔

۵۳؎ یہ اُس عذاب کا حوالہ ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں اُن کی قوموں پر آتا

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالۡحَقِّ ۚ فَمَنِ اهۡتَدٰی فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۴۱﴾

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا ۚ فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾

الزمر ۳۹

(تم پر اِن کو سمجھانے ہی کی ذمہ داری ہے، اے پیغمبر)۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ کتاب ہم نے تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے۔ لہٰذا جو ہدایت پائے گا، وہ اپنے لیے پائے گا اور جو گم راہی اختیار کرے گا تو اُس کی گم راہی کا وبال بھی اُسی پر ہوگا۔ تم اِن پر کوئی ذمہ دار نہیں بنائے گئے ہو۔ ۴۱

حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی جانیں قبض کرتا ہے، جب اُن کی موت کا وقت آجاتا ہے اور جن کی موت نہیں آئی ہوتی، اُنھیں بھی نیند کی حالت میں اِسی طرح قبض کر لیتا ہے۔ پھر جن کی موت کا فیصلہ کر چکا، اُن کو روک لیتا ہے اور جو باقی ہیں، اُنھیں ایک مقرر وقت تک کے لیے رہا کر دیتا ہے۔ اِس میں، یقیناً اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں[۵۴]۔ ۴۲

ہے۔ اِس کی صفات یہی ہیں کہ یہ مستکبرین کو رسوا کر دیتا ہے اور آتا ہے تو اُس وقت تک ڈیرے ڈالے رہتا ہے، جب تک پیغمبر کے مخالفین کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ نہیں دیتا۔

۵۴ مطلب یہ ہے کہ موت اور زندگی، سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ اِن کے معبودوں کا اِس میں کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی اُن سے اندیشہ ناک ہو۔ مرنے کے بعد جو زندگی شروع

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ

(اِس کے باوجود)، کیا اِنھوں نے اللہ کے مقابل میں دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے؟ اِن سے کہو، اگرچہ وہ کچھ اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ کچھ عقل و شعور رکھتے ہوں؟ کہو کہ سفارش تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے[۵۵]۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اُسی کی ہے۔ پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ (یہ اِسی حماقت کا نتیجہ ہے کہ) جب اکیلے خدا کا ذکر کیا جائے تو جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے (کہ اُس میں خدا کی

ہوگی، وہ بھی اللہ کے حکم سے شروع ہوگی۔ وہ ہر روز صبح و شام لوگوں کو اُس کا مشاہدہ کراتا ہے۔ چنانچہ سوتے ہیں تو گویا موت کو دیکھتے ہیں اور سو کر اُٹھتے ہیں تو بعث و نشر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ موت اور موت کے بعد اُٹھنے کا یہ ریہرسل ہر شخص کے سامنے ہو رہا ہے، بشرطیکہ وہ دیکھنے والی آنکھیں رکھتا ہو۔ اہل ایمان کو اِسی عبرت نگاہی کے لیے تلقین کی گئی ہے کہ سو کر اُٹھیں تو دعا کریں کہ 'ألحمدللّٰه الذی أحیانا بعد ما أماتنا و إلیه النشور'۔*

۵۵؎ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ یہ اگر ہوئی تو اللہ کے اذن سے ہوگی اور اُنھی کے لیے ہوگی جن کے لیے اللہ اجازت دے گا اور اِس میں وہی بات کہی جائے گی جو بالکل حق ہوگی۔ خدا کے سامنے کسی کے لیے بے انصافی کی کوئی بات کہنے کی گنجایش نہیں ہے۔

* بخاری، رقم ۶۳۱۶۔ مسلم، رقم ۶۸۸۷۔ ''شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہم کو موت کے بعد پھر زندگی عطا فرمائی اور ایک دن لوٹنا بھی اُسی کی طرف ہے۔''

الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا

الزمر
۳۹

بے لاگ عدالت اپنا فیصلہ سنائے گی)، اُن کے دل کڑھتے ہیں[۵۶] اور جب اللہ کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو فوراً خوش ہو جاتے ہیں[۵۷]۔ (اِن کا معاملہ اب اللہ کے حوالے کرو اور) کہو کہ اے اللہ، زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے، غائب و حاضر کے جاننے والے، اپنے بندوں کے درمیان تو ہی اُس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ ۴۳-۴۶

(یہ اِس وقت نہیں مان رہے، لیکن) اِن ظالموں[۵۸] کے پاس اگر وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اُس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی تو برے عذاب سے بچنے کے لیے یہ (بغیر کسی تردد کے) روز قیامت اُس کو فدیے میں دینا چاہیں گے۔ لیکن اللہ کی طرف سے اِنھیں وہ معاملہ پیش آئے گا، جس کا یہ گمان بھی نہیں رکھتے

۵۶۔ اِس لیے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اُنھیں پھر نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

۵۷۔ اِس لیے کہ اِس سے یہ توقع پیدا ہو جاتی ہے کہ اُن کے یہ معبود اپنی سفارش سے اُنھیں بچا لیں گے۔

۵۸۔ یعنی جنھوں نے خدا کے شریک ٹھیرا کر اپنی جان پر ظلم ڈھایا ہے۔

وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۴۸﴾
فَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ ثُمَّ اِذَا خَوَّلۡنٰهُ نِعۡمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ ؕ بَلۡ هِىَ فِتۡنَةٌ وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۹﴾ قَدۡ قَالَهَا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا

تھے[۵۹]۔ اِن کے اعمال کے برے نتیجے اِن کے سامنے آ جائیں گے اور اِنھیں وہی چیز گھیر لے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ ۴۷-۴۸

سو انسان (کا معاملہ بھی عجیب ہے، اُس) کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، پھر جب اُس پر ہم اپنی طرف سے فضل فرماتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میرے علم کی وجہ سے ملا ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ یہ ایک آزمایش ہے، لیکن اِن کے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۶۰]۔ اِن سے پہلے والوں نے بھی یہی بات کہی تھی تو جو کچھ

۵۹؎ یعنی یہ معلوم ہو گا کہ خدا جتنا بڑا کریم ہے، اتنا ہی بڑا عادل اور منتقم وقہار بھی ہے۔

۶۰؎ یعنی اِس حقیقت کو نہیں جانتے کہ رزق وفضل انسان کے علم واختیار سے نہیں، بلکہ اللہ کی حکمت اور مشیت سے حاصل ہوتا ہے اور اِسی حکمت ومشیت کے تحت وہ کسی کو زیادہ دے کر اُس کے شکر کو جانچتا ہے اور کسی کو کم دے کر اُس کے صبر کا امتحان کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...وہی جس کو چاہتا ہے، زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، کم دیتا ہے۔ کتنے ہیں جو بغیر سعی وتدبیر کے چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر اِس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور کتنے ہیں جو رات دن دنیا ہی کی فکر میں سر کھپاتے ہیں اور دنیا کمانے کا علم بھی رکھتے ہیں، لیکن پاتے اتنا ہی ہیں جتنا اللہ نے اُن کی تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔ یہ مشاہدہ بھی آئے دن اِس دنیا میں ہوتا رہتا ہے کہ ایک شخص آج کروڑ پتی یا ارب پتی، بلکہ تخت وتاج کا مالک ہے اور دوسرے دن وہ بالکل دیوالیہ یا کسی جیل کی کوٹھڑی میں بند ہے۔ اِن کھلے ہوئے مشاہدات کے باوجود اگر

يَكْسِبُوْنَ ﴿٥٠﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥١﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ

وہ کماتے رہے، اُن کے کچھ بھی کام نہیں آیا اور اُن کے اعمال کے برے نتیجے اُن کے سامنے آ گئے۔ اِن لوگوں میں سے بھی، جنھوں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا ہے، اُن کے اعمال کے برے نتیجے، عنقریب اُن کے سامنے آ جائیں گے اور یہ خدا کو ہرا نہیں سکیں گے۔ کیا اِن کو معلوم نہیں کہ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے، رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اِس میں اُن لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں[61] ہیں جو ایمان لانا چاہتے ہوں[62]۔ ۴۹-۵۲

اِن سے کہو کہ میرے بندو، جنھوں نے (میرے شریک ٹھیرا کر) اپنی جانوں

الزمر ۳۹

کوئی شخص اپنے مال و جاہ کے متعلق 'اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ' کے گھمنڈ میں مبتلا ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ اُس کی عقل میں کچھ فتور ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۶۰۰)

۶۱؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ کائنات کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ اُس نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے اور اِس امتحان کا نتیجہ لازماً نکلنا ہے۔ چنانچہ قیامت آ کر رہے گی۔ یہ خدا کے عدل اور اُس کے علم و حکمت کا تقاضا ہے۔

۶۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'۔ اِن میں فعل، ہمارے نزدیک، ارادۂ فعل کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيۡبُوۡۤا اِلٰى رَبِّكُمۡ وَاَسۡلِمُوۡا لَهٗ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ الۡعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ ﴿۵۴﴾

وَاتَّبِعُوۡۤا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَةً وَّاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾ اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ

الزمر ۳۹

پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔[۶۳] اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ تم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اُس کے فرماں بردار بن جاؤ، اِس سے پہلے کہ تم پر اُس کا عذاب آ جائے۔[۶۴] پھر تمھاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ ۵۳-۵۴

تم اُس بہترین چیز[۶۵] کی پیروی کرو جو تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے، اِس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آئے اور تمھیں اُس کی خبر بھی نہ ہو۔

۶۳؎ یعنی اُس سے مایوس ہو کر دوسروں کے سہارے نہ پکڑو۔ غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کرو گے تو وہ بڑے سے بڑے گناہ کو بھی بخش دے گا۔

۶۴؎ یہ اُسی عذاب کا ذکر ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے۔

۶۵؎ یعنی قرآن مجید کی، جو تحریف کے تمام شوائب سے پاک خدا کی آخری کتاب ہے اور نہایت منفرد اور دل نشیں اسلوب اور فصیح و بلیغ عربی زبان میں دین فطرت کے حقائق کو اتنے مختلف پہلوؤں سے واضح کرتی ہے کہ کوئی بلید سے بلید آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی جگہ کوئی ابہام باقی رہ گیا ہے۔

يٰحَسۡرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطۡتُّ فِىۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ وَاِنۡ كُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِيۡنَ ﴿٥٦﴾ اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰٮنِىۡ لَكُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿٥٧﴾ اَوۡ تَقُوۡلَ حِيۡنَ تَرَى الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّ لِىۡ كَرَّةً فَاَكُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿٥٨﴾ بَلٰى قَدۡ جَآءَتۡكَ اٰيٰتِىۡ فَكَذَّبۡتَ بِهَا وَاسۡتَكۡبَرۡتَ وَكُنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿٥٩﴾

وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيۡنَ كَذَبُوۡا عَلَى اللّٰهِ وُجُوۡهُهُمۡ مُّسۡوَدَّةٌ ؕ اَلَيۡسَ فِىۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًى لِّلۡمُتَكَبِّرِيۡنَ ﴿٦٠﴾ وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيۡنَ

الزمر
٣٩

کہیں ایسا نہ ہو[٦٦] کہ (بعد میں) کوئی کہے کہ ہائے افسوس، میری اُس کوتاہی پر جو مجھ سے خدا کے معاملے میں صادر ہوئی، اور حقیقت یہ ہے کہ میں تو مذاق ہی اڑاتا رہا۔ یا یہ کہے کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی اُس سے ڈرنے والوں میں ہوتا۔ یا عذاب کو دیکھے تو کہے کہ کاش، مجھے دنیا میں پھر جانا ہو کہ میں بھی خوبی سے عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں! کیوں نہیں، (میں نے تو ہدایت بخشی تھی، چنانچہ) میری آیتیں تمھارے پاس آئی تھیں، پر تم نے اُنھیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور منکروں میں شامل رہے۔ ۵۵-۵۹

(لوگو)، قیامت کے دن تم دیکھو گے کہ اُن کے چہرے سیاہ ہیں، جنھوں نے (خدا کے شریک ٹھیرا کر) خدا پر جھوٹ باندھا ہے۔ اِن تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا

٦٦ے اصل الفاظ ہیں: 'اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی'۔ اِن میں 'اَنْ' سے پہلے مضاف عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۖ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿٦٢﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٣﴾

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ

الزمر
٣٩

کیا جہنم میں نہ ہوگا؟[٦٧] (اُس دن) اللہ اُن لوگوں کو اُن کے مامن میں[٦٨] نجات عطا فرمائے گا جو اُس سے ڈرتے رہے۔ اُن کو نہ وہاں کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ زمین اور آسمانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ (اُس کے خزانوں سے کوئی دوسرا کسی کو کچھ نہیں دے سکتا، اِس لیے) جنھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیا ہے، وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۶۰-۶۳

اِن سے کہو، نادانو، (یہ واضح حقائق ہیں)، کیا پھر بھی تم مجھے اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کے لیے کہتے ہو؟ دراں حالیکہ تمھاری طرف بھی، (اے پیغمبر)، یہ وحی بھیجی جا چکی ہے اور اُن کی طرف بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں کہ اگر تم شرک کرو گے

٦٧۔ یعنی جہنم ہی میں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ ایسے سرکش اگر جہنم کے سزاوار نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا؟

٦٨۔ یعنی جنت میں، جہاں اُن کے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے۔

عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا

الزمر ۳۹

تو تمھارا عمل اکارت ہو کر رہ جائے گا[۶۹] اور تم ضرور خسارے میں پڑو گے۔ اِس لیے ہرگز شرک نہ کرو، بلکہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اُسی کے شکر گزار بندوں میں رہو[۷۰]۔ ۶۴-۶۶

اِن لوگوں نے خدا کی قدر نہیں کی، جیسا کہ اُس کی قدر کرنے کا حق تھا (اور اُس کے شریک ٹھیرا دیے، ورنہ اُس کی عظمت کا عالم تو یہ ہے کہ) قیامت کے دن پوری زمین (گویا) اُس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اُس کے دہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اُن چیزوں سے جنھیں یہ شریک ٹھیراتے ہیں۔ (اُس دن ساری خدائی کا حال یہ ہوگا کہ) صور میں پھونکا جائے گا تو زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں، سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، سوائے اُن کے جنھیں اللہ

۶۹؎ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کے ساتھ کسی عمل کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے اُن بندوں کی نیکیاں قبول کرتا ہے جو تنہا اُسی کو پوجتے ہیں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتے۔

۷۰؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے بعد بندہ اپنے پروردگار کا شکر گزار نہیں رہتا، بلکہ اُس کی بندگی میں دوسروں کو شریک کر کے بالکل ناشکرا بن جاتا ہے۔

هُمۡ قِيَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ وَجِآيۡءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ

چاہے[1]۔ پھر اُس میں دوبارہ پھونکا جائے گا تو دفعتاً وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے[2]۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی[3]۔ اور اعمال کی کتاب رکھ دی جائے گی اور گواہی کے لیے پیغمبر حاضر کیے جائیں گے اور وہ بھی جو گواہی کے منصب پر فائز کیے گئے[4]۔ اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا، اُن پر

۱؎ یہ غالباً اُن ملائکہ کی طرف اشارہ ہے جو عرش الٰہی کے اردگرد خدا کی حمد و تسبیح میں مصروف ہوں گے۔ سورہ کے آخر میں اُن کا ذکر ہے۔

۲؎ اوپر جو مضمون بیان ہوا ہے، یہ اُسی کی مزید توسیع ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... مطلب یہ ہے کہ جس دن کی ہولناکی کا یہ عالم ہے، اُس دن کس کی مجال ہے کہ خدا کے آگے ناز و تدلل کے ساتھ بڑھ کر کسی کی وکالت یا سفارش کر سکے اور جس خدا کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اُس کے ایک نفخۂ صور سے ساری خدائی بے ہوش اور پھر ساری خدائی بیدار ہوگی، کون ہے جو اُس کا ہم سر بننے کا مدعی ہو سکے!'' (تدبر قرآن ۶/۶۱۱)

۳؎ یعنی وہ زمین جو نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ قیامت کے دن وجود میں آئے گی اور ہمارے آفتاب کے بجائے اللہ کے نور سے روشن ہوگی جس سے محسوسات و مرئیات سے آگے تمام حقائق و معانی بھی روشنی میں آجائیں گے۔ قرآن میں جگہ جگہ اِس کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

۴؎ یعنی ذریت ابراہیم کے لوگ جو زمین پر نبیوں کی دعوت کے گواہ بنائے گئے۔ اُن کی نمایندگی، ظاہر ہے کہ اُن کے مجددین و مصلحین کریں گے۔ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۷۸ اور آل عمران (۳) کی آیت ۳۳ میں قرآن نے ذریت ابراہیم کے اِس منصب کی تصریح فرمائی ہے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٦٩﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٧٠﴾

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰى اِذَا جَآءُوهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُونَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿٧١﴾ قِيلَ ادْخُلُوا

الزمر
۳۹

کوئی ظلم نہ ہوگا اور ہر شخص کو، جو کچھ اُس نے کیا تھا، پورا دے دیا جائے گا[۷۵]۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں[۷۶]۔ ۶۷-۷۰

(اِس کے بعد توحید کی دعوت کا) انکار کرنے والے گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اُس کے پاس پہنچیں گے تو اُس کے دروازے (اُن کے لیے) کھول دیے جائیں گے اور اُس کے داروغے اُن سے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس تمھی لوگوں میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمھارے پروردگار کی آیتیں تمھیں سناتے اور تمھارے اِس دن کی ملاقات سے تمھیں ڈراتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: ہاں، آئے تو سہی، مگر عذاب کی بات منکروں پر پوری ہو کے رہی[۷۷]۔ کہا جائے گا: جہنم کے دروازوں میں داخل ہو

۷۵ یعنی کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی اور ہر ایک اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کاٹے گا۔

۷۶ یہ تمام تفصیل اِس لیے کی گئی ہے کہ مشرکین آنکھیں کھولیں کہ اصل حقیقت کیا ہے اور وہ کیا آرزوئیں لیے بیٹھے ہیں۔

۷۷ یہ انتہائی حسرت کا جملہ ہے کہ خدا نے منکرین حق کے لیے روز ازل جس فیصلے کا اعلان کر دیا تھا، افسوس ہے کہ وہ نافذ ہو کے رہا۔

اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٧٤﴾

جاؤ، اُس میں ہمیشہ رہنے کے لیے۔ سو تکبر کرنے والوں[۸] کا یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۷۱-۷۲

اِس کے برخلاف جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اُس کے پاس پہنچیں گے اور اُس کے دروازے (اُن کے لیے) کھول دیے جائیں گے اور اُس کے پاسبان اُن سے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، خوش رہو اور اِس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ، اور وہ اُن کے جواب میں کہیں گے کہ شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو اِس زمین کا وارث بنا دیا، اب ہم جنت میں، جہاں چاہیں، ٹھیریں[۹]، تو یہ صلہ ہوگا اُن کا[۸۰]۔ سو عمل کرنے والوں[۸۱] کا یہ کیا ہی اچھا صلہ ہے! ۷۳-۷۴

۸ے یہ اُنھی منکرین کی صفت ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اِس سے انکار کے سبب پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ درحقیقت اُن کا تکبر ہی تھا جو انکار کا باعث بن گیا۔

۹ے یعنی پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ جہاں چاہیں، فروکش ہو جائیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس سے معلوم ہوا کہ وہاں کسی کی خواہشوں اور ارادوں میں مزاحم ہونے والی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جس کا اِس جہان میں کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی حقیقت اُسی وقت سمجھ میں آئے گی، جب وہ نیا جہان نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ اور انسان اپنی نئی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ظہور میں آئے گا اور یہ زمین سورج کے بجائے

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٥﴾

(اُس دن، جب زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہوگی) اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش الٰہی کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں[۸۲]۔ اُس دن لوگوں کے درمیان ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور (ہر طرف سے) صدا بلند ہوگی کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے، جہانوں کا پروردگار[۸۳]! ۷۵

الزمر ۳۹

اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔'' (تدبر قرآن ۶/۶۱۵)

۸۰۔ یہ جواب شرط ہے جو اصل میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۸۱۔ اوپر اِسی جگہ 'مُتَكَبِّرِيْن' کا لفظ ہے۔ اُس کے مقابل میں یہاں بظاہر 'خَاشِعِيْن' یا 'مُتَّقِيْن' کا محل تھا، مگر قرآن نے اِن کی جگہ 'عٰمِلِيْن' کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ کرنا چاہا ہے کہ جنت کے حصول کے لیے اصلی چیز عمل ہے۔ چنانچہ استاذ امام کے الفاظ میں، جو لوگ سفارشوں کے بل پر جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں، وہ جنت الحمقا میں بس رہے ہیں۔

۸۲۔ آیت ۶۷ سے آگے بڑھتے ہوئے یہاں تک آئیے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت 'وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا' سے متصل ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس میں جن فرشتوں کا ذکر ہے، وہ حاملین عرش اور اُن کے زمرے کے فرشتے ہیں۔ 'حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ' کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

۸۳۔ یعنی اہل ایمان بھی یہی کہیں گے اور حاملین عرش بھی اُن کے ہم نوا ہوں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو جو چیز سزاوار حمد و شکر بناتی ہے، وہ اُس کا عدل اور نیک و بد کے درمیان اُس کا فرق و امتیاز ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے اور ایک اندھیر نگری کے خالق کو کوئی حمد و شکر کا سزاوار نہیں مان سکتا۔ قیامت کے دن

سورة المؤمن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَ قَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوۡلِ ؕ لَاۤ

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ' ہے[۸۴]۔ اِس کتاب کی تنزیل[۸۵] اللہ کی طرف سے ہے، جو زبردست ہے[۸۶]، سب کچھ جاننے والا ہے[۸۷]، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے[۸۸]، سخت سزا

جب اُس کے کامل عدل اور اُس کی کامل رحمت کا ظہور ہوگا، تب ہر ایک کا تردد دور ہو جائے گا اور ہر گوشے سے اُس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا۔ گویا جس صبح حمد کے لوگ انتظار میں تھے، وہ طلوع ہوگئی اور یہ جہان خدا کے نور سے جگمگا اٹھا۔'' (تدبر قرآن ۶/۶۱۶)

۸۴۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔ یہی نام اِس سے آگے تمام مکی سورتوں کا بھی ہے اور یہ اُن کے اسلوب، مضامین اور مزاج میں فی الجملہ اشتراک پر دلالت کرتا ہے۔

۸۵۔ لفظ 'تَنۡزِیۡل' اہتمام پر دلالت کے لیے ہے اور اِس میں یہ اشارہ ہے کہ جس نے یہ اہتمام فرمایا ہے، لوگ اُس کے شکرگزار ہوں اور اُس نے جو کتاب نازل کی ہے، اُس کی قدر کریں اور اُس سے ہدایت حاصل کریں۔

۸۶۔ یعنی اگر قدر کرنے اور ہدایت حاصل کرنے کے بجائے آمادۂ مخالفت ہوں گے تو وہ زبردست ہے اور مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت، دونوں میں سزا دے سکتا ہے۔

۸۷۔ چنانچہ یہ بھی جانتا ہے کہ اِس کتاب کی تنزیل سے جو کشمکش برپا ہوئی ہے، اُس میں

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③
مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ④ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ

دینے والا اور بڑی قدرت والا ہے۔[89] اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، (بالآخر) اُسی کی طرف لوٹنا ہے۔[90] ۱-۳

اللہ کی آیتوں میں[91] وہی لوگ جھگڑے نکالتے ہیں جو (اُس کی پکڑ کے) منکر ہیں۔ سو اِس ملک میں اِن کی چلت پھرت تم کو کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔[92] اِن سے

المؤمن ۴۰

کون کیا کر رہا ہے۔

۸۸؎ یہ ترغیب کے لیے فرمایا ہے کہ جو لوگ اب تک سرکشی کرتے رہے ہیں، وہ بھی اگر اپنی روش سے باز آ جائیں تو خدا کا دامن رحمت وسیع ہے، وہ اُس میں جگہ پا سکتے ہیں۔

۸۹؎ اصل میں 'ذِی الطَّوْلِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'طَوْل' کا لفظ کئی معنی کے لیے آتا ہے۔ یہاں تقابل کے اصول کو پیش نظر رکھ کر قدرت کے معنی کو ترجیح دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی صفات کا یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ وہ اگر توبہ کرنے والوں کی توبہ آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے تو مخالفت کرنے والوں کے لیے اُس کے عذاب اور اُس کی قدرت کی شانیں بھی اِسی طرح ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔

۹۰؎ یعنی اُس کے سوا نہ کوئی سہارا دے سکتا ہے اور نہ اُس سے بھاگ کر کہیں جانے کی کوئی جگہ ہے۔ بالآخر لوٹنا اُسی کی طرف ہوگا اور اُس کے اذن کے بغیر کوئی بھی کسی کے کام نہ آسکے گا۔

سورہ کی یہ تمہید، اگر غور کیجیے تو مخاطبین کے لیے اظہار امتنان بھی ہے اور اُن کو تنبیہ بھی۔ اِس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا حوالہ اِن دونوں ہی پہلوؤں سے دیا گیا ہے۔

۹۱؎ اُسی کتاب کی آیتیں مراد ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

مِنۢ بَعۡدِهِمۡ ۖ وَهَمَّتۡ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوۡلِهِمۡ لِيَاۡخُذُوۡهُ وَجٰدَلُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِيُدۡحِضُوۡا بِهِ الۡحَقَّ فَاَخَذۡتُهُمۡ ۖ فَكَيۡفَ كَانَ عِقَابِ ۝۵ وَكَذٰلِكَ حَقَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۝۶

پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور اُن کے بعد کے گروہوں نے بھی۔ ہر قوم نے اپنے رسول پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا اور باطل کے ہتھیاروں سے جھگڑے کہ اِس سے حق کو پسپا کر دیں تو میں نے اُن کو پکڑ لیا[93]۔ پھر کیسی تھی میری سزا[94]! تیرے پروردگار کی بات[95] اِن منکروں پر بھی اِسی طرح پوری ہو چکی ہے کہ یہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ ۴-۶

---

۹۲ یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس میں عتاب کا رخ، اگر غور کیجیے تو قریش کے اُنھی مستکبرین کی طرف ہے جو اپنی سیادت و امارت کے غرور میں آپ کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے اور قرآن جب اُنھیں عذاب کی وعید سناتا تھا تو اُس کا مذاق اڑاتے تھے۔

۹۳ چنانچہ تمھارے یہ منکرین بھی اِس کی جسارت کریں گے تو اِسی طرح پکڑے جائیں گے۔

۹۴ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'عِقَابِ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ اِس طرح کے متمردین پر اللہ جو عذاب بھیجتا ہے، وہ درحقیقت اُن کے اعمال کا قدرتی ردعمل ہوتا ہے، اُس میں اُن پر کوئی زیادتی نہیں کی جاتی۔

۹۵ یعنی وہ بات جو روز ازل کہہ دی گئی تھی کہ جو لوگ اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر شیطان کی پیروی کریں گے، اللہ اُن سب کو جہنم میں بھر دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۸﴾ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ

المؤمن ۴۰

(خدا کے فرشتوں کو اُس کے شریک ٹھیرا کر یہ اُن سے اپنے لیے سفارش کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ) عرش الٰہی کے حاملین اور جو اُس کے اردگرد ہیں، وہ تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اُس پر ایمان رکھتے ہیں[96] اور ایمان والوں کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اِس لیے جو توبہ کریں اور تیرے راستے کی پیروی کریں، تو اُن کی مغفرت فرما اور اُنھیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔[97] اے ہمارے رب، اور تو اُن کو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں داخل کر، جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا تھا اور اُن کو بھی جو اُن کے باپ دادوں اور اُن کی بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے صالح ہوں۔ بے شک، تو ہی زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔[98] اور اُن کو، (اے

96 یعنی اُسی طرح ایمان رکھتے ہیں، جس طرح خدا کے بندوں کو رکھنا چاہیے۔ وہ الوہیت کے کسی زعم میں مبتلا نہیں ہیں۔

97 مطلب یہ ہے کہ فرشتے دعا اور سفارش تو یقیناً کرتے ہیں، لیکن اُنھی کے لیے کرتے ہیں جو ایمان کے ساتھ صحیح راستے پر گام زن ہوں۔ وہ خدا کے شریک ٹھیرانے والوں کی سفارش نہیں کرتے۔

فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۹﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ

پروردگار)، برے اعمال کے نتائج سے بچا۔[99] حقیقت یہ ہے کہ اُس دن جن کو تو نے برے اعمال کے نتائج سے بچالیا تو وہی ہیں جن پر تو نے رحم فرمایا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۷-۹

(یہ سفارش کی امید لگائے بیٹھے ہیں)؟ اِن منکروں کو تو وہاں منادی کی جائے گی کہ اِس وقت جتنی بے زاری تم کو اپنے آپ پر ہے، خدا کی بے زاری تم سے اُس وقت اِس سے کہیں زیادہ رہی ہے، جب تمھیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم (رعونت کے ساتھ) انکار کر دیتے تھے۔ یہ کہیں گے: اے ہمارے رب، تو نے ہم کو دو بار موت اور دو بار زندگی دی،[100] سو (مر کر جی اٹھنے کے بارے میں تو اب کوئی شبہ نہیں رہا،

---

۹۸ یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو زبردست ہے، اِس لیے جو چاہے، کر سکتا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ حکیم بھی ہے، چنانچہ وہی کرے گا جو عدل و حکمت کا تقاضا ہوگا۔

۹۹ اصل الفاظ ہیں: 'وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ'۔ لفظ 'سَيِّاٰت' یہاں نتائج سیئات کے معنی میں ہے۔ یہ اُس قاعدے کے مطابق ہے کہ عمل اور نتیجۂ عمل کے لزوم کو بیان کرنے کے لیے فعل نتیجۂ فعل کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

۱۰۰ 'دو بار موت اور دو بار زندگی' سے مراد وہی چیز ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۸ میں کیا گیا ہے کہ تم اللہ کے منکر کس طرح ہوتے ہو، درآں حالیکہ تم مردہ تھے تو اُس نے تمھیں زندگی عطا فرمائی، پھر وہی مارتا ہے، اِس کے بعد زندہ بھی وہی کرے گا۔ پھر تم اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِکُمۡ بِاَنَّہٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ وَحۡدَہٗ کَفَرۡتُمۡ ۚ
وَ اِنۡ یُّشۡرَکۡ بِہٖ تُؤۡمِنُوۡا ؕ فَالۡحُکۡمُ لِلّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡکَبِیۡرِ ﴿۱۲﴾
ہُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُنَزِّلُ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ رِزۡقًا ؕ
وَ مَا یَتَذَکَّرُ اِلَّا مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾ فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ
وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾ رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ ۚ یُلۡقِی الرُّوۡحَ

چنانچہ) ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا تو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ جواب دیا جائے گا: تم اِس انجام کو اِس لیے پہنچے کہ جب اکیلے خدا کو پکارا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور اگر اُس کے شریک ٹھیرائے جائیں تو تم مان لیتے تھے۔ سو اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر ہی کے اختیار میں ہے[۱۰۱]۔ ۱۰-۱۲

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے[۱۰۲]۔ (اِس سے) یاددہانی، البتہ وہی حاصل کرتے ہیں جو رجوع کرنے والے ہیں[۱۰۳]۔ سو، (رجوع کرنے والو)، تم اللہ ہی کو پکارو، اپنی اطاعت کو اُسی کے لیے خالص کرکے، خواہ اِن منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ عالی مرتبت ہے، عرش کا مالک ہے، اپنے

۱۰۱؎ اور اُس کا فیصلہ وہی ہے جس سے تم اِس وقت دوچار ہو۔

۱۰۲؎ یعنی رحمت و نقمت، دونوں اُس کے اختیار میں ہیں۔ چنانچہ برق و رعد بھی وہی دکھاتا ہے اور آسمان سے بارش بھی وہی نازل کرتا ہے جس سے رزق و فضل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

۱۰۳؎ یعنی جو تعصّبات کے پردے چاک کرکے بات کی طرف متوجہ ہونے والے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بات کو سمجھنے کے لیے یہ شرط اول ہے۔

مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾
وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۚ۬

المؤمن
۴۰

بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم کی روح ڈال دیتا ہے[۱۰۴] تاکہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے خبردار کر دے۔ جس دن وہ خدا کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ اُن کی کوئی چیز بھی خدا سے چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ پوچھا جائے گا: آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد و قہار کی! آج ہر شخص کو اُس کی کمائی کا بدلہ ملے گا۔ آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ بے شک، اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ ۱۳-۱۷

اِن کو اُس آفت کے دن سے ڈراؤ، (اے پیغمبر)، جو قریب آ لگی ہے[۱۰۵]، جب کلیجے

۱۰۴۔ اِس سے یہاں وحی مراد ہے جس میں امرِ الٰہی کلام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ اِسے کوئی شخص اپنی خواہش یا کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کے حکم سے نازل ہوتی ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس پر نازل کرنی ہے۔ اِس کے سوا اِس کے حصول کا کوئی طریقہ نہیں ہے، اِلّا یہ کہ آدمی اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا کر بیٹھے اور اُسی سے الہام حاصل کرتا رہے، جیسا کہ صوفیانہ مذاہب کے ماننے والوں نے کیا ہے۔

۱۰۵۔ یعنی قیامت سے، جو موت کے دروازے سے گزرتے ہی ہر شخص کے سامنے کھڑی ہوگی۔ پھر یہاں تو مخاطب قریش ہیں، جنھیں جگہ جگہ اُس قیامتِ صغریٰ سے بھی خبردار کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد گویا اُن کے سر پر کھڑی تھی۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿١٨﴾ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿١٩﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٢٠﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٢١﴾

منہ کو آ رہے ہوں گے اور وہ غم سے گھٹے ہوئے ہوں گے۔ اُس دن ظالموں کا کوئی دوست نہ ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، جس کی بات مانی جائے۔ (پھر اُس کے حضور کوئی کیا سفارش کرے گا؟ اِس لیے کہ) اللہ تو نگاہوں کی چوری کو بھی جانتا ہے اور اُن سب بھیدوں کو بھی جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا، (اُس پر کسی کی سفارش اثر انداز نہ ہوگی)۔ اور اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ یقیناً اللہ ہی سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۱۸-۲۰

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں؟ وہ اِن سے قوت میں بھی اور اُن آثار کے لحاظ سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر تھے جو اُنھوں نے زمین میں چھوڑے ہیں[۱۰۶]۔ پھر اُن کے گناہوں کی پاداش میں اللہ نے

۱۰۶؎ آیت میں لفظ 'اَشَدّ' 'أَعْظَمُ وَ أَكْثَرُ' کے مفہوم پر متضمن ہے، چنانچہ 'اٰثَارًا' کے لیے بھی موزوں ہو گیا ہے۔ یہ عاد و ثمود اور اہل مدین وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کی قوت و جمعیت

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ

اُن کو پکڑا اور اُنھیں کوئی اللہ سے بچانے والا نہیں تھا۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آتے رہے، پر اُنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو اللہ نے اُن کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ طاقت ور ہے، سخت سزا دینے والا ہے۔۲۱-۲۲

اِسی طرح ہم نے موسیٰ کو بھی فرعون اور ہامان[107] اور قارون[108] کی طرف اپنی نشانیوں اور ایک واضح حجت[109] کے ساتھ بھیجا تھا تو اُنھوں نے کہہ دیا کہ یہ ایک جادوگر ہے،

اور تمدنی ترقیوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔

۱۰۷؎ یہ فرعون کا دست راست اور اُس کے تمام مظالم میں پوری طرح شریک تھا۔ قرآن کے بیانات سے اشارہ نکلتا ہے کہ اِس کی حیثیت غالباً اُس کے وزیر اعظم کی تھی۔

۱۰۸؎ یہ اگرچہ بنی لاوی میں سے اور موسیٰ علیہ السلام کے سگے چچا کا لڑکا تھا، لیکن اُن کی مخالفت میں اِس کا رویہ بالکل وہی تھا جو ابولہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اختیار کیا۔ بائیبل میں اس کا نام قورح آیا ہے اور قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے حد دولت مند اور اپنی دولت کے گھمنڈ میں مبتلا رہنے والوں میں سے تھا۔

۱۰۹؎ اِس سے عصا کا معجزہ مراد ہے جو درحقیقت موسیٰ علیہ السلام کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی ایک سند تھا۔ اِس کے علاوہ جو نشانیاں اُن کو دی گئیں، اُن کی تفصیل قرآن نے سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۳۳ میں کر دی ہے۔

بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۭ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ

سخت جھوٹا[۱۱۰]۔ پھر جب وہ ہماری طرف سے حق لے کر اُن کے پاس آ گیا تو اُنھوں نے حکم دیا کہ جو لوگ اِس کے ساتھ ایمان لائے ہیں، اُن کے بیٹوں کو قتل کرو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دو[۱۱۱]۔ لیکن اِن منکروں کی یہ تدبیر بالکل رایگاں گئی[۱۱۲]۔ ۲۳-۲۵

(اپنی اِس ناکامی کو دیکھ کر) فرعون نے (درباریوں سے) کہا: مجھے چھوڑو[۱۱۳]، میں

المؤمن ۴۰

۱۱۰؎ یعنی اِس شخص کے معجزے محض جادوگری ہیں اور اِس کا یہ دعویٰ کہ اِسے خدا نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، محض جھوٹ ہے۔

۱۱۱؎ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹانے اور اُن کو مغلوب رکھنے کی یہ ظالمانہ پالیسی اگرچہ پہلے سے چل رہی تھی، لیکن موسیٰ علیہ السلام کی دعوت برپا ہوئی تو اِسے مزید شدت کے ساتھ جاری رکھنے کا فرمان صادر ہوا۔ یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے۔ اِس میں بلاغت کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ لڑکوں کو ذبح کرنے کا ذکر 'بیٹوں' کے لفظ سے ہوا ہے اور لڑکیوں کو زندہ رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے 'تمھاری عورتوں' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلی تعبیر، اگر غور کیجیے تو پدری شفقت کے جذبات کو مجروح کرتی ہے اور دوسری غیرت کو چیلنج کرنے کا باعث بنتی ہے۔

۱۱۲؎ یعنی اِس کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے، وہ سب ناکام ہو گئے اور بنی اسرائیل کی طاقت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔

۱۱۳؎ یہ اسلوب بتا رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور شخصیت کو اُس وقت تک ایسی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ فرعون جیسا مطلق العنان بادشاہ بھی اپنے اعیان و اکابر کی تائید کے بغیر اُن پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں سمجھتا تھا۔

اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡهِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَ قَالَ مُوۡسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۲۷﴾

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ٭ۖ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَهٗۤ اَتَقۡتُلُوۡنَ

موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور (اپنی مدد کے لیے اب) وہ اپنے رب کو بلالے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمھارا دین نہ بدل ڈالے یا ملک میں فساد نہ پھیلا دے[114]۔ موسیٰ (نے یہ بات سنی تو اُس) نے کہا: میں نے ہر اُس متکبر کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ لے لی ہے[115]۔ ۲۶-۲۷

(یہی موقع تھا کہ) فرعون کے خاندان میں سے ایک بندۂ مومن[116] نے، جو اپنے

۱۱۴ یعنی میری قوم کے لوگ بھی اُس کی دعوت سے متاثر ہو کر اُسے قبول نہ کر لیں یا اپنی قوم کے لوگوں کو، جنھیں ہم نے غلام بنا رکھا ہے، منظّم کر کے وہ ہمارے خلاف بغاوت نہ کرا دے۔

۱۱۵ یہ اُس پناہ کا حوالہ ہے جو رسولوں کو اُن کے مخالفین کے مقابل میں حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی فرمایا ہے کہ 'وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'* (اللہ اِن لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا)۔

۱۱۶ یہ اُسی بندۂ مومن کا ذکر ہے جس کے بارے میں سورۂ یٰس (۳۶) کی آیت ۱۴ میں فرمایا ہے کہ پھر ہم نے ایک تیسرے سے اپنے دو پیغمبروں کی مدد کی۔ یہ شاہی خاندان کے ایک فرد تھے، لیکن اِن کی ہم دردیاں شروع ہی سے حضرت موسیٰ کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ سورۂ قصص (۲۸) میں ہے کہ جب اُن کے ہاتھوں اتفاقاً ایک قبطی کا قتل ہو گیا تو یہی دوڑتے ہوئے آئے اور موسیٰ علیہ السلام کو اعیان حکومت کے برے ارادوں سے آگاہ کیا اور مصر سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔

* المائدہ ۵: ۶۷۔

رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ

ایمان کو چھپائے ہوئے تھا[117]، کہا: کیا تم ایک شخص کو محض اِس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ حالاں کہ وہ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس نہایت واضح نشانیاں لے کر آیا ہے[118]۔ (خدا کے بندو)، اگر وہ جھوٹا[119] ہے تو اُس کے

المؤمن ۴۰

۱۱۷؎ اِس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُس وقت تک وہ ایمان کے اظہار کو خود موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی دعوت کے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ فرعون اب اُن کے قتل کے درپے ہو رہا ہے تو اُنھوں نے مصلحت کی نقاب اتار کر پھینک دی اور یہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

۱۱۸؎ اِس ایک ہی فقرے میں اُنھوں نے فرعون اور اُس کے اعیان کے سامنے کئی حقائق رکھ دیے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ایک تو یہ کہ اللہ ہی کو اپنا رب ماننا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اِس میں کسی اختلاف کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے تو وہ ایک نہایت روشن حق کا اظہار کر رہا ہے جس پر وہ تائید و تحسین کا سزاوار ہے نہ کہ قتل کا۔ بڑے ہی ظالم ٹھیریں گے وہ لوگ جو ایسے شخص کے قتل کی جسارت کریں گے۔

دوسری یہ کہ جو نشانیاں لے کر آئے ہیں، وہ اُن کے فرستادۂ الٰہی ہونے کی نہایت واضح دلیل ہیں۔ صرف اندھے ہی اُن کے خدائی ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ جس رب کے رسول کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں، وہ تمھارا بھی رب ہے۔ یہ تمھاری جہالت ہے کہ تم اُس کے سوا کسی اور کو رب بنائے بیٹھے ہو۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۳۹)

۱۱۹؎ یعنی تمھارے خیال میں۔ یہ اسلوب اپنی طرف سے کسی شک کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ بر سبیل تنزل محض مخاطب کی رعایت سے اختیار کیا جاتا ہے۔

الَّذِیْ یَعِدُکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ یٰقَوْمِ لَکُمُ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ظٰھِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۫ فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰہِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِیْکُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی وَمَآ اَھْدِیْکُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

جھوٹ کا وبال اُسی پر پڑے گا اور اگر سچا ہے تو جس عذاب کی وعید وہ تمھیں سنا رہا ہے، اُس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کر رہے گا۔[120] یقین رکھو، اللہ کسی ایسے شخص کو بامراد نہیں کرے گا جو حد سے گزرنے والا ہو، سخت جھوٹا ہو۔[121] میری قوم کے لوگو، آج تمھیں بادشاہی حاصل ہے کہ ملک میں تمھارا غلبہ ہے،[122] لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو مجھے بتاؤ کہ کون ہے جو اُس کے مقابل میں ہماری مدد کر سکے گا؟ فرعون نے کہا: میں تم کو وہی راے دے رہا ہوں جو میں سمجھتا ہوں کہ اِس وقت دینی چاہیے اور تم کو وہی راہ دکھا رہا ہوں جو ٹھیک ہے۔[123] ۲۸-۲۹

۱۲۰؎ یہ اُس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔

۱۲۱؎ اِس میں، اگر غور کیجیے تو فرعون پر نہایت بلیغ تعریض ہے، اگرچہ بات ایک کلیے کے انداز میں کہی گئی ہے۔

۱۲۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَکُمُ الْمُلْکُ الْیَوْمَ، ظٰھِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ'۔ اِن میں 'ظٰھِرِیْنَ' ہمارے نزدیک 'لَکُمْ' کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۱۲۳؎ فرعون نے یہ بات اُن کی بات کاٹ کر کہی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس بے محل مداخلت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اِس مرد مومن کی تقریر بغیر کسی مداخلت کے جاری رہی تو اِس سے اُس کے بہت سے درباری متاثر ہو جائیں گے۔ اِس وجہ سے ہوشیار سیاسی لیڈروں کی طرح اُس نے اپنی نیک نیتی، اصابت راے اور مصلحت اندیشی کی دھونس جمانے کی کوشش کی۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۴۱)

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ جَاۗءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ

البیان

المؤمن
۴۰

اُس شخص نے، جو ایمان لے آیا تھا، (اِس مداخلت کی پروا نہیں کی اور بات جاری رکھتے ہوئے) کہا: میری قوم کے لوگو، (تم نے موسیٰ کو قتل کرنے کی کوشش کی تو) مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر بھی اُسی طرح کا دن نہ آجائے جو (اِس سے پہلے) بہت سے گروہوں پر آچکا ہے اور وہی حال نہ ہو، جیسا نوح کی قوم اور عاد و ثمود[124] اور اُن لوگوں کا حال ہوا تھا جو اُن کے بعد ہوئے۔ (اِس لیے کہ رسولوں کی تکذیب کے بعد وہ اِسی کے مستحق تھے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر کسی طرح کا ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ میری قوم کے لوگو، میں تم پر ہانک پکار کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے اور تمھیں خدا سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ (اِس کے باوجود نہیں سمجھتے ہو تو اِس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ) جنھیں اللہ گم راہ کر دے، اُن کو پھر کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے[125]۔ اِس سے پہلے یوسف بھی تمھارے پاس اِسی طرح نہایت واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے تو جو

۱۲۴؎ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ سب قومیں فرعون سے پہلے ہو چکی تھیں اور اِن کے حالات بھی اُس عہد کے لوگوں کے لیے معلوم و معروف تھے۔

۱۲۵؎ اللہ کس طرح گم راہ کرتا ہے؟ پیرے کے آخر میں اِس کی وضاحت فرما دی ہے۔

مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚۖ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ

باتیں وہ تمھارے پاس لے کر آئے تھے، اُن کی طرف سے تم شک ہی میں پڑے رہے، یہاں تک کہ جب اُن کی وفات ہوگئی تو تم نے کہہ دیا کہ (یہ بھی رسول نہیں تھے اور) اللہ اِن کے بعد بھی (ہماری طرف) ہرگز کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔[۱۲۶] اللہ اِسی طرح اُن لوگوں کو گم راہ کرتا ہے جو حد سے بڑھے ہوئے اور شک میں پڑے ہوتے ہیں۔[۱۲۷] وہ جو بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں۔

۱۲۶؎ یعنی نہ صرف یہ کہ یوسف علیہ السلام کو نہیں مانا، بلکہ آیندہ کے لیے بھی فیصلہ کر دیا کہ جس طرح اب تک خدا نے ہمارے پاس کوئی رسول نہیں بھیجا، آیندہ بھی نہیں بھیجے گا۔

۱۲۷؎ یہ اُس سنت الٰہی کی وضاحت ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ جس اصول پر مبنی ہے، اُس کی طرف ... جگہ جگہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کو خیر و شر کی جو معرفت اور عقل و فہم کی جو نعمت اُس نے بخشی ہے، لوگ اُس کی قدر کریں۔ جو لوگ اِن کی قدر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کے لیے ہدایت و معرفت کی مزید راہیں کھولتا ہے۔ جو اِن کی قدر نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس کی خواہشوں سے مغلوب ہو کر واضح سے واضح حق کو بھی مشتبہ بنانے کی کوشش کرتے اور اِسی مقصد کے لیے اپنی ساری ذہانت صرف کرتے ہیں، اُن کو مزید ہدایت دینا تو الگ رہا، اُن کی اِس ناقدری کی پاداش میں اللہ تعالیٰ اُن کا وہ نور بھی سلب کر لیتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۴۳)

مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ

المؤمن ۴۰

اللہ کے نزدیک اور ایمان والوں کے نزدیک یہ سخت مبغوض ہے۔ اللہ اِسی طرح ہر مغرور اور سرکش کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔[۱۲۸] ۳۰-۳۵

فرعون نے (پھر مداخلت کی[۱۲۹] اور اُن کا مذاق اڑاتے ہوئے) کہا کہ اے ہامان، میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا دو کہ میں اطراف میں پہنچوں، آسمانوں کے اطراف میں، پھر موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں تو اِسے ایک جھوٹا آدمی سمجھتا ہوں۔ اِس طرح فرعون کی نگاہوں میں اُس کی بدعملی خوش نما

---

۱۲۸ یعنی اِس لیے مبغوض ہیں کہ بغیر کسی دلیل کے کج بحثی کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ذہنوں میں یہ غرور سما جاتا ہے کہ اُن کے مزعومات کے خلاف کوئی بات حق کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ، ظاہر ہے کہ نہایت قابل نفرت رویہ ہے۔ چنانچہ اللہ اِس کی پاداش میں اُن کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے، جس سے اُن کی عقلیں الٹ جاتی ہیں اور یہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوتا ہے، جس کی وضاحت اوپر ہوئی ہے۔

۱۲۹ بندۂ مومن کی تقریر جس عروج پر پہنچ گئی تھی، اُس سے قدرتی طور پر اہل دربار متاثر ہوتے نظر آئے ہوں گے۔ چنانچہ اُس نے پھر مداخلت کی اور وہ بات کہی جو آگے بیان ہوئی ہے۔ یہ محض ایک اشغلہ تھا جو اِس لیے چھوڑا گیا کہ اِس تقریر کے نتیجے میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کسی سنجیدہ بحث کا موضوع نہ بنے، بلکہ مذاق کا موضوع بن کر رہ جائے۔

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ز وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ

بنا دی گئی اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔ (یہ اُس نے ایک تدبیر کی تھی) اور فرعون کی یہ تدبیر بھی غارت ہو کر رہی۔ ۳۶-۳۷

اُس شخص نے، جو ایمان لے آیا تھا، (اِس پر بھی اپنی بات جاری رکھی اور) کہا: میری قوم کے لوگو، تم میری پیروی کرو، میں تمھیں سیدھی راہ دکھا دوں گا۔[۱۳۰] اے میری قوم، یہ دنیا کی زندگی تو چند دن کا سامان ہے، حقیقت یہ ہے کہ اصل ٹھیرنے کی جگہ آخرت ہی ہے۔ اور (وہاں ضابطہ یہ ہے کہ) جو برائی کرے گا، وہ تو اُسی کے برابر بدلہ پائے گا، مگر جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو یہی لوگ ہیں جو بہشت میں داخل ہوں گے، جس میں وہ بے حساب رزق پائیں گے۔ میری قوم کے لوگو، کیا ماجرا ہے، میں تمھیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی دعوت دے رہے ہو![۱۳۱] تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں خدا سے کفر کروں اور اُن چیزوں کو

۱۳۰؎ اوپر یہی بات فرعون نے کہی تھی۔ یہ ٹھیک اُس کا جواب ہے۔

۱۳۱؎ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون نے اُن کی تقریر میں مداخلت کی، اُسی طرح اُس کے بعض اعیان و اکابر نے بھی مداخلتیں کیں اور غالباً کچھ استدلال کرنے اور اُنھیں آباد

بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۘ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ

اُس کا شریک ٹھیراؤں جن کا مجھے کوئی علم نہیں ہے[۱۳۲] اور میں تمھیں خداے عزیز و غفار کی طرف بلا رہا ہوں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جن کی دعوت تم مجھے دے رہے ہو، اُن کو نہ دنیا میں پکارنے کا کوئی فائدہ ہے، نہ آخرت میں[۱۳۳]، اور یہ بھی کہ ہم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے اور یہ بھی کہ جو زیادتی کرنے والے ہیں[۱۳۴]، وہی دوزخ کے لوگ ہوں گے۔ سو جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں، عنقریب تم اُسے یاد کرو گے[۱۳۵]۔ میں اپنا معاملہ

اجداد کے دین پر قائم رکھنے کی کوشش بھی کی۔ فرعون کی مداخلت کا تو اُنھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا، لیکن اِن اعیان و اکابر کو جواب دیا ہے اور نہایت ہم دردی اور دل سوزی کے ساتھ دیا ہے۔ اِس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ فرعون سے اُنھیں کسی خیر کی امید نہیں تھی۔

۱۳۲؎ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شرک اور کفر میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جو شخص خدا کے شریک ٹھیراتا ہے، وہ درحقیقت اُس کا کفر کرتا ہے، اِس لیے کہ دین میں خدا کا صرف مان لینا مطلوب نہیں ہے، بلکہ اُس کی تمام صفات اور اُس کے تمام حقوق کے ساتھ ماننا معتبر ہے اور اِن حقوق میں سب سے بڑا حق اُس کی توحید و یکتائی کا تسلیم کرنا ہے۔" (تدبر قرآن ۷/۴۶)

۱۳۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ'۔ اِن میں فعل کی نفی اُس کے فائدے کی نفی کے پہلو سے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۱۳۴؎ یعنی خدا کے شریک ٹھیرا کر اپنی جان پر زیادتی کرنے والے ہیں۔

۱۳۵؎ یعنی اُس وقت، جب خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے گا، خواہ وہ دنیا میں صادر ہو یا

إِلَى اللّٰهِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ بَصِيرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٤٤﴾ فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿٤٥﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿٤٦﴾

اب اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگران ہے۔ ۳۸-۴۴

چنانچہ اُس کو تو اللہ نے اُن کی تدبیروں کے شر سے بچا لیا[۱۳۶]، مگر فرعون والوں کو (اِس کے بعد) بُرے عذاب نے گھیر لیا[۱۳۷]۔ دوزخ کی آگ کہ جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں[۱۳۸]، اور جس دن قیامت برپا ہو گی، حکم دیا جائے گا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب میں داخل کرو۔ ۴۵-۴۶

آخرت میں۔

۱۳۶۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اِس تقریر کے بعد فرعون اور اُس کے اعیان اُن کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں لگ گئے کہ کسی طرح وہ اپنے موقف سے دست بردار ہو کر واپس باپ دادا کے دین پر آ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت فرمائی اور وہ اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے۔ یہ حفاظت و نصرت اُن کو اِس لیے میسر ہوئی کہ جن حالات میں اور جس موقع پر اُنھوں نے اعلان حق کیا، اُس نے اُنھیں بھی ایک درجے میں گویا اُسی منصب پر کھڑا کر دیا جو رسولوں کے لیے خاص ہے۔ سورۂ یٰس میں 'فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ*' کے الفاظ سے ہماری اِس بات کی تائید ہوتی ہے۔

۱۳۷۔ یعنی پہلے غرقابی اور اُس کے بعد برزخ کی اذیت، جس کی طرف آگے اشارہ کیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'حَاقَ' کا لفظ اِس بات کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے کہ اِس عذاب نے اُن کو اِس طرح احاطے میں لے لیا کہ اُن کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

۱۳۸۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا معاملہ ایسا واضح ہو، جیسا کہ فرعونیوں کا تھا، اُن پر

* ۳۶: ۱۴۔ ''پھر ہم نے ایک تیسرے شخص سے اُس کی تائید کی۔''

وَاِذۡ یَتَحَآجُّوۡنَ فِی النَّارِ فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ ﴿۴۸﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَۃِ جَہَنَّمَ ادۡعُوۡا رَبَّکُمۡ یُخَفِّفۡ عَنَّا

اُس دن کا خیال کرو، جب یہ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے تو جو کم زور تھے، وہ اُن سے جو بڑے بنے رہے، کہیں گے کہ ہم تمھارے تابع تھے، پھر کیا آپ لوگ اِس آگ کا کچھ حصہ بھی ہم سے بٹائیں گے؟ وہ جو بڑے بنے رہے، جواب دیں گے: اب تو ہم سب اِسی میں ہیں۔ اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے۔[۱۳۹] (چنانچہ ہر طرف سے مایوس ہو کر) یہ آگ میں پڑے ہوئے لوگ دوزخ کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں سے

مرنے کے بعد ہی اُن کے اعمال کے اعتبار سے کیفیات کا صدور ہونے لگتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا حساب پوچھنے اور اُن کے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روایتوں میں اِسی کو عذاب قبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیکوکاروں کے لیے بھی یہی قاعدہ ہے۔ چنانچہ راہ حق کے شہیدوں کے متعلق فرمایا ہے کہ 'اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ'* (وہ اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں، اُنھیں روزی مل رہی ہے)۔

۱۳۹ مطلب یہ ہے کہ نہ ہمارے مزعومات کی رعایت ہوئی اور نہ تمھارا یہ عذر مسموع ہوا کہ تم ہمارے دباؤ میں تھے۔ اللہ نے ٹھیک حق و عدل کے مطابق اپنا فیصلہ سنا دیا ہے اور اب ہم سب اپنے کرتوتوں کے نتائج بھگتنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔ اِس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہر شخص، خواہ وہ کتنا ہی دبا ہوا ہو، ایمان و اسلام کا مکلّف ہے۔ وہ یہ ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر سبک دوش نہیں ہو سکتا۔

* اٰل عمران ۳: ۱۶۹۔

يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٥٠﴾ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ

کسی ایک دن کی تخفیف کر دے۔ وہ جواب دیں گے: کیا تمھارے پاس تمھارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آتے رہے تھے؟ وہ اعتراف کریں گے کہ ہاں، آتے تو ضرور رہے۔ داروغے کہیں گے: پھر تم ہی درخواست کرو اور منکروں کی پکار (اُس دن) بالکل صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔[140] ۴۷-۵۰

(ہم نے جس طرح موسیٰ کی مدد کی)، یقین رکھو، ہم اپنے رسولوں کی اور اُن پر ایمان لانے والے اُن کے ساتھیوں کی (اُسی طرح) دنیا کی زندگی میں بھی لازماً مدد کرتے ہیں[141] اور اُس دن بھی کریں گے، جب گواہ کھڑے ہوں گے۔[142] جس دن

۱۴۰؎ یعنی نہ اُن کے مزعومہ دیوی دیوتا اُن کی فریاد سنیں گے، نہ مذہب و سیاست کے پیشوا کچھ کام آئیں گے اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ شنوائی ہوگی۔ امید کے تمام دروازے اُن کے لیے اُس دن بند ہو جائیں گے۔

۱۴۱؎ رسول اور اُس کے ساتھیوں کے لیے یہی سنت الٰہی ہے کہ اُن کے لیے خدا کی نصرت دنیا میں بھی لازماً آتی ہے اور اُن کے مخالفین تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ آیت میں 'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ اِنھی ساتھیوں کے لیے آئے ہیں۔ ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ اِس سنت الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں۔

۱۴۲؎ یعنی قیامت کے دن۔ یہ گواہ خدا کے پیغمبر بھی ہوں گے، اُس کے فرشتے بھی اور ذریت ابراہیم کے لوگ بھی جو خدا کی طرف سے اِس منصب پر فائز کیے گئے۔ اِس کی تفصیلات دوسرے مقامات میں بیان ہو چکی ہیں۔

اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾
وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡهُدٰى وَاَوۡرَثۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ الۡكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكۡرٰى لِاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ

(خدا کے شریک ٹھیرا کر) اپنی جان پر ظلم کرنے والوں کو اُن کی معذرت کچھ بھی نفع نہ دے گی اور اُن پر لعنت پڑے گی اور اُن کے لیے بہت برا ٹھکانا ہو گا۔ ۵۱-۵۲

(چنانچہ دیکھ سکتے ہو کہ فرعون غرقاب ہوا اور) ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی اور عقل والوں کی رہنمائی اور یاددہانی کے لیے بنی اسرائیل کو اپنی کتاب[۱۴۳] کا وارث بنا دیا تھا۔ اِس لیے ثابت قدم رہو، (اے پیغمبر)، یقیناً اللہ کا وعدہ برحق ہے[۱۴۴] اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے رہو[۱۴۵] اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی

۱۴۳؎ یعنی تورات کا۔

۱۴۴؎ یہ اُسی وعدے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی ثابت قدم رہیں۔ جو حشر فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر کا ہوا تھا، وہی قریش کے اِن فراعنہ کا بھی ہونا ہے۔ اِن میں سے اگر کوئی اپنی قوم کا حقیقی خیرخواہ ہے تو اُسے اُس بندۂ مومن کی مثال سامنے رکھنی چاہیے جس نے فرعون کے دربار میں اعلان حق کیا تھا۔ لیکن اِن کے رویے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سے ایک ایک شخص اپنا سارا زور قوم کو عذاب الٰہی کی طرف دھکیلنے میں صرف کر رہا ہے۔ لہٰذا مطمئن رہو، خدا کا فیصلہ عنقریب صادر ہونے والا ہے۔ اہل ایمان کے لیے، اُس کے بعد، خدا کی مدد پوری شان کے ساتھ ظاہر ہو گی اور یہ اُسی انجام کو پہنچ جائیں گے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔

۱۴۵؎ یہ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن تبعاً آپ کے پیرو بھی اِس میں

بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾
لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ

المؤمن
۴۰

تسبیح کرتے رہو۔۵۳-۵۵

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بغیر کسی سند کے، جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکال رہے ہیں، اُن کے دلوں میں تو صرف بڑائی کی ہوس سمائی ہے[۱۴۶] جس کو وہ کبھی پانے والے نہیں ہیں۔ سو (اِن سے بے پروا ہو جاؤ اور) اللہ کی پناہ مانگتے رہو۔ وہی درحقیقت سننے والا، دیکھنے والا ہے[۱۴۷]۔۵۶

(اِنھیں تعجب ہے کہ لوگ مرنے کے بعد کس طرح اٹھائے جائیں گے)! واقعہ یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (اِن کا خیال ہے کہ سب مر کر مٹی ہو جائیں گے۔

شامل ہیں۔ خطاب کا یہ اسلوب قرآن میں جگہ جگہ اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ ہدایت پوری جماعت کے لحاظ سے ہے۔ اِس میں گناہوں کے لفظ سے کسی کو متوحش نہیں ہونا چاہیے۔

۱۴۶ یعنی مخالفت کی وجہ محض بڑائی کی ہوس ہے، اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حق اِن پر واضح نہیں ہوا یا اُس کے خلاف یہ کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے ہیں۔

۱۴۷ لہٰذا مطمئن رہو، اِن متکبروں کے شر سے وہی تم کو محفوظ بھی رکھے گا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ

ہرگز نہیں)، اندھے اور بینا[۱۴۸] برابر نہیں ہو سکتے اور نہ ایمان والے اور نیکوکار اور جو برائی کرنے والے ہیں، وہ برابر ہو سکتے ہیں۔ (لوگو)، تم بہت کم سوچتے ہو۔[۱۴۹] یہ بالکل قطعی ہے کہ قیامت آ کے رہے گی، اِس میں کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ مان نہیں رہے ہیں۔ (اِس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بندگی سے گریزاں ہیں) اور تمھارا پروردگار کہہ چکا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری التجائیں قبول کروں گا۔[۱۵۰]

۱۴۸؎ اِس سے عقل و دل کے اندھے اور بصیرت رکھنے والے مراد ہیں۔

۱۴۹؎ یعنی ذرا سا بھی عقل و فہم سے کام نہیں لیتے، ورنہ یہ حقائق ایسے نہیں تھے کہ سمجھ میں نہ آتے۔

۱۵۰؎ یہ بندگی کی دعوت کا انتہائی دل نواز اسلوب ہے۔ عالم کا پروردگار انسان کو خود بلا رہا ہے کہ وہ اپنی حاجات اُس کے سامنے پیش کرے۔ اُس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ اُس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے کسی وسیلے یا سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کا ہر بندہ، جب چاہے اور جہاں سے چاہے، اُس کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کر سکتا ہے اور جو کچھ مانگنا چاہے، اُس سے مانگ سکتا ہے۔ اُس نے اگر صحیح چیز، صحیح طریقے سے اور صحیح وقت پر مانگی تو اُس کا پروردگار ضرور اُسے عطا فرمائے گا اور اگر کسی حکمت کے تحت موخر کرے گا تو کسی دوسرے وقت میں عطا فرما دے گا۔ بندے کو چاہیے کہ وہ خدا کے فیصلوں پر راضی رہے، اُس سے مایوس ہو کر ابلیس کی طرح سرکشی اختیار نہ کرے اور نہ اُس کا دروازہ چھوڑ کر دوسروں کے دروازے پر جائے، بلکہ زندگی کے آخری سانس تک اُسی کی دہلیز سے چمٹا رہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ ﴿۶۰﴾

اَللّٰهُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡهِ وَ النَّهَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۶۲﴾

یہ حقیقت ہے کہ جولوگ غرور کے مارے میری بندگی سے سرتابی کرتے ہیں،[۱۵۱] وہ ذلیل ہوکر عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے۔ ۵۷-۶۰

(لوگو)، اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے تاریک بنایا تاکہ اُس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ اُس میں کام کرو۔[۱۵۲] حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔[۱۵۳] یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے،[۱۵۴] ہر چیز کا خالق، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔[۱۵۵] پھر کہاں سے اوندھے ہو جاتے ہو؟

۱۵۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ'۔ اِن میں 'عَنۡ' اِس بات کا قرینہ ہے کہ 'اِسۡتِکۡبَار' یہاں اعراض کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۱۵۲؎ اِس آیت میں 'الَّیۡل' کے بعد 'مُظۡلِمًا' اور 'مُبۡصِرًا' کے بعد 'لِتَعۡمَلُوۡا' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر محذوف ہیں۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۱۵۳؎ لہٰذا بندگی سے سرتابی کرتے اور اُس کے شریک ٹھیرانے لگتے ہیں۔

۱۵۴؎ یعنی جس نے رات اور دن کا یہ الٹ پھیر پیدا کیا، پھر اِس کے باوجود کہ دونوں اضداد تھے، اُن کے اندر ایسی سازگاری اور ہم آہنگی رکھ دی کہ دونوں مل کر انسان کی پرورش کرتے ہیں اور اِس طرح زبان حال سے بتاتے ہیں کہ ہمارا خالق، اللہ ہی تمھارا پروردگار ہے۔

۱۵۵؎ یہ اُس کے خالق ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اِس لیے کہ جب نہ خلق میں اُس کا کوئی

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٦٣﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٥﴾
قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٦﴾

اِسی طرح وہ لوگ بھی اوندھے ہوتے رہے ہیں جو (تم سے پہلے) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ ۶۱-۶۳

اللہ ہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور تمھاری صورت گری کی تو تمھاری صورتیں نہایت عمدہ بنائیں اور تم کو پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا فرمایا۔ یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، جہانوں کا پروردگار۔ وہی زندہ ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اُسی کو پکارو، اطاعت کو اُس کے لیے خالص کر کے۔ شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے، جہانوں کا پروردگار۔ ۶۴-۶۵

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ مجھے تو اِس سے روک دیا گیا ہے کہ میں اُن کی بندگی کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ (نہیں، میں اُن کی بندگی نہیں کرسکتا)، جب کہ میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس کھلی دلیلیں آچکی ہیں اور مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں اپنے آپ کو رب العٰلمین کے حوالے کر دوں[156]۔ وہی ہے جس نے

شریک ہے، نہ مخلوقات کے نظم و تدبیر میں تو اُس کے سوا کسی کو معبود کیوں بنایا جائے؟

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۶۸﴾

تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر تم کو وہ بچے کی صورت میں ماں کے پیٹ سے نکالتا ہے، پھر تم کو پروان چڑھاتا ہے کہ اپنی جوانی کو پہنچو، پھر تم کو مہلت دیتا ہے کہ بڑھاپے کو پہنچ جاؤ۔[۱۵۷] اور تم میں سے کوئی اِس سے پہلے ہی مر جاتا ہے اور کسی کو وہ مہلت دیتا ہے[۱۵۸] کہ تم ایک مقرر مدت پوری کر لو اور یہ سب اِس لیے کہ تم (حقائق کو) سمجھو۔[۱۵۹] وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت بھی۔ (اُس کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے)۔ چنانچہ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ ۶۶-۶۸

---

۱۵۶ یعنی پرستش بھی اُسی کی کروں اور اطاعت بھی اُسی کی اور پورے دل کے ساتھ اُس کے سامنے سرافگندہ رہوں۔

۱۵۷ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ، ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا'۔ اِن میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں اور دونوں سے پہلے عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق ایک ایک جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔

۱۵۸ اوپر جس اسلوب کا ذکر ہے، اُسی کے مطابق یہ الفاظ بھی آیت میں محذوف ہیں۔

۱۵۹ یعنی وہ حقائق جو خدا کی قدرت و حکمت اور توحید و آخرت سے متعلق انبیا علیہم السلام نے واضح فرمائے ہیں۔

المؤمن ۴۰

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ

المؤمن ۴۰

تم نے دیکھے نہیں یہ لوگ جو (اِن سب حقائق کو دیکھتے اور اِس کے باوجود) اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں، یہ کہاں سے پھیر دیے جاتے ہیں؟ (یہی) جنھوں نے اللہ کی اِس کتاب کو[۱۶۰] جھٹلا دیا اور اُن صحیفوں کو بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا۔ سو عنقریب جان لیں گے، جب اِن کی گردنوں میں طوق اور اِن کے پاؤں میں[۱۶۱] زنجیریں ہوں گی۔ یہ کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے، پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ پھر اِن سے پوچھا جائے گا: کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے مقابل میں شریک ٹھیراتے تھے؟ یہ کہیں گے: وہ ہم سے کھوئے گئے، نہیں، بلکہ ہم تو اِس سے پہلے کسی چیز کو پوجتے ہی نہیں رہے۔ اللہ اِس طرح اِن منکروں کے حواس گم کر دے گا (کہ مانیں گے بھی اور انکار بھی کریں گے[۱۶۲])۔ ارشاد

۱۶۰؎ یعنی قرآن مجید کو، جو وہی تعلیم دیتا ہے جو اللہ کے پیغمبر اور اُس کی تمام کتابیں دیتی رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن کو جھٹلا دیا تو گویا سب کو جھٹلا دیا۔ آگے اِسی کی وضاحت ہے۔

۱۶۱؎ یہ الفاظ اصل میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہیں۔

تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ

ہو گا: یہ تم اِس انجام کو اِس لیے پہنچے کہ زمین میں ناحق رِیجھتے پھرتے رہے[163] اور اِس لیے کہ تم اتراتے تھے۔ (اب جاؤ)، جہنم کے دروازوں میں[164] داخل ہو جاؤ، تم اُس میں ہمیشہ رہو گے۔ سو کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا! ۶۹-۷۶

(یہ نہیں مان رہے، اے پیغمبر)، تو صبر کرو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ پھر جس عذاب کی وعید ہم اِنھیں سنا رہے ہیں، اُس کا کچھ حصہ ہم

۱۶۲؎ اِس کیفیت کی طرف قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں بھی اشارے ہیں کہ ایک ہی سانس میں یہ متکبرین اپنے معبودوں کا اقرار بھی کریں گے اور انکار بھی کہ شاید یہی چیز اِن کے لیے کچھ نافع ہو جائے۔

۱۶۳؎ اِسے ناحق اِس لیے کہا ہے کہ انسان کو دنیا میں جو چیزیں بھی ملتی ہیں، اُن میں سے کوئی بھی اُسے اُس کے کسی ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں ملتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے۔ اِس وجہ سے صرف اُسی کے لیے تکبر زیبا ہے، کسی دوسرے کے لیے یہ زیبا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا تکبر کرتا ہے تو یہ 'بِغَيْرِ الْحَقِّ' ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خاص ردا اپنے اوپر ڈالنے کی جسارت کر رہا ہے، جو شرک ہے۔ 'الکبریاء رداءی' میں اِسی حقیقت کی یاددہانی کی گئی ہے۔''
>
> (تدبر قرآن ۷/ ۶۴)

۱۶۴؎ یہ اُن سات دروازوں کی طرف اشارہ ہے جن کی تفصیل دوسرے مقام میں ہو چکی ہے۔

نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٧٧﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٧٨﴾

المؤمن ۴۰

تمھیں دکھا دیں یا تم کو وفات دیں اور اِس کے بعد اِن سے نمٹیں،[165] بہرکیف اِن کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے۔ ۷۷

تم سے پہلے بھی ہم نے بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ اُن میں وہ بھی ہیں جن کے حالات ہم نے تمھیں سنا دیے ہیں اور وہ بھی جن کے حالات ہم نے تمھیں نہیں سنائے۔ اُن میں سے کسی رسول کا مقدور نہ تھا کہ اللہ کے اذن کے بغیر وہ کوئی نشانی لے آئے۔[166] اِس لیے (انتظار کرو)، جب اللہ کا حکم آ جائے گا تو پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اُس وقت یہی اہل باطل خسارے میں ہوں گے۔ ۷۸

۱۶۵؎ یہ اُس سنت الٰہی کا حوالہ ہے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر رہے۔ اِس میں بالعموم یہی دو صورتیں پیش آتی ہیں۔ پہلی صورت کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں۔ دوسری صورت کی مثال یہود ہیں جن کی پیٹھ پر عذاب کا تازیانہ مسیح علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد برسنا شروع ہوا۔

۱۶۶؎ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمھارے مخاطبین اگر بار بار عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کا فیصلہ کسی رسول کے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ اِسے ہمیشہ خدا نے کیا ہے اور اب بھی وہی اپنی حکمت کے تحت، جب مناسب سمجھے گا، کرے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

المؤمن ۴۰

(لوگو، نشانیاں مانگتے ہو تو ذرا یہ نشانی بھی دیکھو کہ) اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے چوپایے پیدا کیے کہ اُن میں سے کسی سے سواری کا کام لو اور کسی کو تم کھاتے ہو اور اُن میں تمھارے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں۔ یہ اِس لیے بھی پیدا کیے گئے کہ تمھارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو، تم اُن پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاؤ۔[۱۶۷] (تم اگر غور کرو تو صحراؤں اور سمندروں میں) تم اُن پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو۔ وہ اپنی اور بھی نشانیاں تمھیں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے! ۷۹-۸۱

(یہ نہیں مانتے) تو کیا یہ اِس ملک میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں؟ وہ اپنی قوت کے لحاظ سے بھی اِن سے کہیں بڑھ کر اور زمین میں اپنے آثار کے لحاظ سے بھی اِن سے کہیں زیادہ تھے[۱۶۸] تو اُن کی یہ کمائی اُن کے کچھ کام بھی نہیں آئی۔ ۸۲

۱۶۷؎ یہ اشارہ اونٹ کی طرف ہے جو اہل عرب کے لیے گویا سفینۂ صحرا تھا۔

۱۶۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ'۔ اِن میں

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾

المؤمن ۴۰

چنانچہ اُن کے رسول جب اُن کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو وہ اپنے اُس علم پر نازاں رہے[169] جو اُن کے پاس تھا اور اُنھیں اُس عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ پھر جب اُنھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم خداے واحد پر ایمان لائے اور ہم اُن سب چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم خدا کے شریک ٹھیراتے تھے۔ پر جس وقت ہمارا عذاب دیکھ چکے تو اُن کا یہ ایمان اُن کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہوا۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو اُس کے بندوں میں جاری رہی ہے۔ اور جو منکر تھے، وہ اُس وقت خسارے میں رہے۔ ۸۳-۸۵

'اَکْثَرَ' کا تعلق 'اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ' سے اور 'اَشَدَّ' کا 'قُوَّۃً' سے ہے۔

۱۶۹؎ یعنی وہ علم جو اُنھوں نے دنیوی ذرائع سے حاصل کیا تھا اور جسے وہ اپنی تمدنی ترقیوں کی بنیاد سمجھتے تھے۔

کوالالمپور

۲۶/ جولائی ۲۰۱۴ء

حٰمٓ السجدہ - الشوریٰ

۴۱ ـــــ ۴۲

حٰمٓ السجدہ ۔ الشوریٰ

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع توحید کا اثبات اور اُس کے حوالے سے قریش کو انذار و بشارت ہے۔ پہلی سورہ میں، البتہ تنبیہ اور دوسری میں تفہیم کا پہلو نمایاں ہے۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ حٰم السجدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۲﴾ کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۳﴾ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۚ فَاَعۡرَضَ

—— ۱ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ' ہے[1]۔ یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی تنزیل ہے[2]۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتوں کی تفصیل کی گئی ہے۔ عربی قرآن کی صورت میں، اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں[3]، بشارت دینے والی اور خبردار کرنے والی۔ (اِن پر افسوس)، اِن

۱؎ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'۔ اِن میں مبتدا ہمارے نزدیک محذوف ہے۔ لفظ 'تَنۡزِیۡل' کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ اہتمام، تدریج اور تفخیم شان پر دلیل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اِسی رعایت سے استعمال کیا گیا ہے، یعنی یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے رحمٰن و رحیم کی صفات کا حوالہ تکذیب کی شناعت کو ظاہر کرتا ہے کہ اُس نے تو اِن لوگوں پر ایک عظیم رحمت و برکت نازل فرمائی، لیکن اِن پر افسوس، یہ اُس کے بجائے عذاب اور نقمت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آگے اِسی کی تفصیل ہے۔

۳؎ آیت میں فعل، ہمارے نزدیک، ارادۂ فعل کے مفہوم میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس اسلوب بیان میں عربوں کے لیے ایک تحریص و ترغیب بھی ہے کہ اُنھیں جاننے اور

اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿٤﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿٥﴾

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦﴾

کی اکثریت نے مگر اِس سے منہ موڑ لیا ہے، لہٰذا سن کر نہیں دے رہے ہیں اور (بڑی رعونت کے ساتھ) کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو، ہمارے دل اُس سے پردوں میں ہیں اور جو کچھ ہمیں سنا رہے ہو[۴]، ہمارے کان اُس سے بہرے ہیں اور ہمارے اور تمھارے درمیان ایک حجاب حائل ہے۔ سو جو کچھ تمھیں کرنا ہے، کر گزرو[۵]، ہم بھی، جو کچھ کرنا ہے، کر کے رہیں گے۔ ۱-۵

اِن سے کہہ دو، (مجھے کیا کرنا ہے، میں خدا نہیں ہوں کہ تم پر عذاب نازل کر دوں)۔ میں بھی اُسی طرح ایک انسان ہی ہوں، جیسے تم ہو۔ مجھے وحی کے ذریعے سے بتایا جاتا ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ سو اپنا رخ سیدھے اُسی کی طرف کیے رہو اور اُس

سمجھنے کا حریص ہونا چاہیے، اِس لیے کہ وہ امی رہے ہیں اور اب پہلی بار اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اُن کی تعلیم کے لیے اُن کی زبان میں اپنی کتاب اتاری ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۸۷)

۴؎ یہ الفاظ اصل میں محذوف ہیں۔ 'مِمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ' کا تقابل اِس حذف کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۵؎ اوپر 'بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا' کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں، اُن کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو گویا مدعا یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا ہے۔ اب وہ عذاب وغیرہ لے آؤ، جس کی دھمکی روز ہمیں سناتے ہو۔

الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ

سے مغفرت چاہو۔ اور (سن لو کہ) اِن مشرکوں کے لیے تباہی ہے جو زکوٰۃ (کی صورت میں لوگوں کا جو حق اِن پر عائد ہے، اُسے) ادا نہیں کرتے اور یہی آخرت کے منکر ہیں[۶]۔ (اِن میں سے)، البتہ جو ایمان لے آئے ہیں اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، اُن کے لیے، یقیناً ایسا صلہ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ ۶-۸

اِن سے پوچھو، کیا تم اُس ہستی کا انکار کر رہے ہو[۷] جس نے دو دنوں میں[۸] زمین

[۶] اِس لیے کہ اگر مانتے بھی ہیں تو اِس عقیدے کے ساتھ کہ یہ کچھ بھی کرتے رہیں، اِن کے شرکا و شفعا اِن کو بہر حال بخشوالیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس زور و تاکید کے ساتھ اِس بات کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اِنھوں نے خدا کے اُس عدل اور اُس حکمت ہی کی نفی کر دی جس پر آخرت کی بنیاد ہے۔ دوسرے اگر منکر ہیں تو محض استبعاد یا شک میں مبتلا ہیں، لیکن اِنھوں نے تو قیامت کا سارا فلسفہ ہی ہدم کر دیا۔'' (تدبر قرآن ۷/۸۰)

[۷] قرآن نے یہاں شرک کو خدا کے انکار سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...خدا کو ماننا معتبر صرف وہ ہے جو اُس کی تمام صفات اور اُن کے تمام حقوق و مقتضیات کے ساتھ ہو۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانے، لیکن اِس طرح مانے کہ اُس سے خدا کی کل یا بعض صفات کی نفی ہو رہی ہو تو یہ ماننا دین میں معتبر نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت کفر ہی ہے۔ اِسی وجہ سے قرآن نے شرک کو جگہ جگہ کفر سے تعبیر اور مشرکین کو صریح الفاظ میں 'يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ' سے خطاب فرمایا ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/۸۱)

[۸] اِن سے خدائی دن مراد ہیں جن کے بارے میں تصریح ہے کہ بعض صورتوں میں ہمارے

وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ ﴿٩﴾ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ

بنائی، اور اُس کے شریک ٹھیراتے ہو؟ یہ ہے جہانوں کا پروردگار۔ اور اُس نے زمین کے اندر اُس کے اوپر سے[9] پہاڑ گاڑ دیے اور اُس میں برکتیں رکھ دیں[10] اور سب

شمار سے پچاس ہزار سال کے برابر بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بیان کیا گیا ہے کہ زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں پیدا کیا گیا۔ یہاں اُن کی تفصیل کی جا رہی ہے کہ کس چیز کی خلقت میں کتنے دن صرف ہوئے۔

9 یعنی ایسے نمایاں کہ ہر شخص اُن کو دیکھ سکتا ہے۔ دوسری جگہ مزید وضاحت ہے کہ یہ زمین کے توازن کو قائم رکھے ہوئے ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ اپنی تمام مخلوقات کو لے کر یہ کسی طرف لڑھک جائے۔

10 زمین میں انسان کی پرورش کا جو اہتمام ہے، یہ اُس کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''اِسی برکت کا کرشمہ ہے کہ یہ ہر قسم کی نباتات اگاتی ہے جن کے پھل اور پھول انسان اور دوسری مخلوقات کے کام آتے ہیں۔ یہ اِسی کا فیض ہے کہ ایک دانہ انسان بوتا ہے اور زمین سیکڑوں دانوں کی شکل میں اُس کا حاصل اُس کو واپس کرتی ہے۔ ایک گٹھلی یا ایک قلم آدمی زمین میں لگاتا ہے اور ایک مدت دراز تک اُس کا پھل وہ اور اُس کے اخلاف کھاتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اِسی برکت کا ثمرہ ہے کہ انسان اپنی سائنس کے ذریعے سے اِس کے جتنے پرت الٹتا چلا جاتا ہے، اتنے ہی اِس کے اندر سے خزانے پر خزانے نکلتے آ رہے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ انسان کی سائنس تھک جائے گی، لیکن زمین کے خزانے کم ہونے والے نہیں ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۸۲)

اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ ھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَ لِلۡاَرۡضِ ائۡتِیَا طَوۡعًا اَوۡ کَرۡھًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیۡنَا

ضرورت مندوں کے لیے یکساں، اُس کی غذائیں اُس میں ودیعت کر دیں[۱۱]۔ یہ سب ملا کر چار دنوں میں[۱۲]۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو (زمین کے ساتھ ہی وجود میں آ چکا تھا اور) اُس وقت دھوئیں کی صورت میں تھا[۱۳]۔ سو اُس کو اور زمین کو

خم السجدہ ۴۱

۱۱۔ غذا کے یہی ذخائر ہیں جو انسان کی سعی و تدبیر سے برآمد ہوئے ہیں اور قیامت تک برآمد ہوتے رہیں گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں اور اُن کے بقا کے لیے جس قسم کی غذا کی احتیاج اُن کے اندر رکھی ہے، اُن سب کی جبلی احتیاج کے اعتبار سے یہ غذائی ذخیرے ودیعت فرمائے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ کچھ مخلوقات تو وجود میں آ گئی ہوں، لیکن اُن کی پرورش کے لیے جس غذا کی ضرورت ہے، وہ وجود میں نہ آئی ہو۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر، زمین کی تہوں میں، سمندروں کی تاریکیوں میں، جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹی یا بڑی مخلوق موجود ہے، اُس کے گرد و پیش میں اُس کا طبعی رزق موجود ہے۔ ایک بکری گھاس کھا کر زندہ رہتی ہے، اُس کے لیے اللہ نے گھاس پیدا کی ہے۔ ایک شیر گوشت سے زندہ رہتا ہے، اس کو اللہ نے شکار کے اسلحہ بھی دیے ہیں اور شکار کے لیے جانور بھی پیدا کیے ہیں۔ اور یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ کسی کو بھی اپنی مایحتاج سے زبردستی مناسبت نہیں پیدا کرنی پڑی ہے، بلکہ جس کو جو کچھ بھی ملا ہے، اُس کے جبلی تقاضوں کے مطابق ملا ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۸۳)

۱۲۔ یعنی دو دن زمین کی خلقت کے اور دو دن اِن سب کاموں کے جن کا ذکر ہوا ہے۔ یہ آخر میں سب کو جمع کر کے فرمایا ہے: 'فِیۡۤ اَرۡبَعَةِ اَیَّامٍ'۔ آیت میں 'سُوَّال' کا لفظ اُسی معنی میں ہے، جس میں یہ سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیت ۳۴ میں استعمال ہوا ہے: 'وَ اٰتٰىكُمۡ مِّنۡ كُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡهُ'۔

۱۳۔ یہ غالباً وہی چیز ہے جسے اِس زمانے کے سائنس دان سحابیہ (nebula) سے تعبیر

طَآئِعِيْنَ ﴿١١﴾ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ط وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ق وَحِفْظًا ط ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿١٢﴾

حکم دیا کہ تعمیل کرو، خوشی سے یا ناخوشی سے[14]۔ دونوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہیں[15]۔ پھر دو دنوں میں اُن کے سات آسمان ہونے کا فیصلہ فرمایا[16] اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا اور تمھارے اِس قریبی آسمان کو ہم نے چراغوں سے رونق دی اور اُسے خوب محفوظ بنا دیا[17]۔ یہ خدائے عزیز و علیم کا منصوبہ ہے[18]۔ ۹-۱۲

حٰم السجدة ۴۱

کرتے ہیں۔ اُن کا تصور بھی یہی ہے کہ کائنات جس مادے سے بنی ہے، ابتدا میں وہ اِسی دخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔

۱۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا'۔ یہ اُسی طرح کا اسلوب ہے، جیسے حضرت سلیمان نے ملکۂ سبا کو لکھا تھا کہ 'وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ'*۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مطیع و فرماں بردار بن کر رہو اور جو حکم دیا جائے، اُس سے انحراف کی جسارت نہ کرو۔

۱۵؎ اِس سے معلوم ہوا کہ جن چیزوں کو بظاہر لایعقل سمجھا جاتا ہے، وہ بھی اپنے رب کی باتوں کو سمجھتی اور اُن کا جواب دیتی ہیں۔ ہم اگر اُن کی باتوں کو یا اُن کی تسبیح و تحمید کو نہیں سمجھتے تو یہ ہماری نارسائی ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ حق نہیں ہے کہ اپنے اِس نارسا علم کے ساتھ اِس طرح کی چیزوں پر کوئی حکم لگائیں۔

۱۶؎ یعنی آسمان اگرچہ وجود میں آچکے تھے، لیکن ابھی محض ہیولیٰ تھے، لہٰذا اُن کو بھی آخری صورت دے کر پوری کائنات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

۱۷؎ آیت میں 'حِفْظًا' کا نصب تاکید فعل کے لیے ہے، یعنی اچھی طرح محفوظ بنا دیا۔ یہاں،

* النمل ۲۷: ۳۱۔

اگر غور کیجیے تو اسلوب تبدیل ہوگیا ہے اور غائب کے بجائے متکلم کے صیغے استعمال فرمائے ہیں جو التفات و امتنان پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۸؎ مطلب یہ ہے کہ کائنات کی شہادت تو یہ ہے اور اِدھر تمھاری جہالت کا یہ عالم ہے کہ اُس کے شریک ٹھیراتے ہو! اِن آیتوں سے جو تعلیم نکلتی ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پہلی بات یہ نکلتی ہے کہ یہ دنیا نہایت تدریج واہتمام کے ساتھ ایک طے کردہ پروگرام کے مطابق وجود میں آئی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اِس کو کسی نے بس یوں ہی کھیل تماشے کے طور پر بنایا ہے اور یہ یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ اہتمام اِس کے بامقصد و باغایت ہونے کی ناقابل انکار دلیل ہے اور اِس کا باغایت و بامقصد ہونا لازماً آخرت کو مقتضی ہے۔

دوسری یہ کہ اِس کا خالق بے نہایت قدرت اور غیر محدود علم کا مالک ہے، اِس وجہ سے اِس کام میں نہ اُس کو کسی کی مدد کی ضرورت ہوئی اور نہ کوئی اُس کی مدد کرسکنے کا اہل ہے۔

تیسری یہ کہ آسمان و زمین، دونوں نے مل کر ایک مکان کی شکل اختیار کی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو فروکش کیا ہے، اِس وجہ سے یہ خیال بالبداہت غلط ہے کہ اِس کی چھت پر کسی اور کا تصرف ہے اور اِس کے فرش کا کوئی اور مالک ہے، بلکہ آسمان و زمین، دونوں کی سازگاری اِس بات کی دلیل ہے کہ جس عزیز و علیم نے اِن کو پیدا کیا ہے، وہی اِن پر متصرف بھی ہے۔

چوتھی یہ کہ اِس دنیا میں ربوبیت کا جو ہمہ گیر نظام ہے، وہ اِس بات پر شاہد ہے کہ یہ خدائے عزیز و علیم ہی کا قائم کیا ہوا ہے، کوئی دوسرا اِس نظام کو قائم کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اِس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ اُسی کے آگے دست سوال دراز کریں، اِس لیے کہ حقیقی نافع و ضار وہی ہے۔

پانچویں یہ کہ ربوبیت کا یہ وسیع نظام اِس بات کا مقتضی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں لوگ اپنے منعم حقیقی کے روبرو حاضر ہوں۔ اُن سے نعمتوں کے حق سے متعلق پرسش ہو۔ جنھوں نے اُن کا حق پہچانا ہو، وہ اُس کا صلہ پائیں اور جنھوں نے ناشکری کی ہو، وہ اُس کی سزا بھگتیں۔" (تدبر قرآن ۷/۸۶)

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اب بھی اگر منہ موڑتے ہیں تو کہہ دو کہ جیسی کڑک عاد و ثمود پر ہوئی تھی[19]، میں تم کو اُسی طرح کی کڑک سے ڈراتا ہوں، جب اُن کے آگے اور پیچھے سے[20] اُن کے رسول اُن کے پاس آئے کہ اُنھیں ہر پہلو سے سمجھا دیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارا رب چاہتا کہ کسی کو رسول بنا کر بھیجے تو فرشتے اتارتا، اِس لیے ہم تو اُس پیغام کے منکر ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو[21]۔ ۱۳-۱۴

۱۹؎ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ہود علیہ السلام اِنھی کی طرف بھیجے گئے تھے۔ ثمود عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ چنانچہ اِنھیں عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اِن کی طرف حضرت صالح کی بعثت ہوئی۔ دوسرے مقامات میں تفصیل ہے کہ اِن قوموں پر جو عذاب آیا، اُس میں شمال کی تند ہوائیں، ژالہ باری اور رعد و برق، سب جمع ہو گئے تھے۔ قرآن اِسی بنا پر اُسے کبھی ایک اور کبھی دوسری چیز سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں اُس کے ایک نمایاں وصف 'صٰعِقَة' سے اُس کا ذکر فرمایا ہے۔

۲۰؎ یہ وہی تعبیر ہے جو ابلیس نے اپنے چیلنج میں اختیار کی تھی کہ میں آگے اور پیچھے سے اُن کو گھیروں گا، یعنی ہر طرف سے اُن پر حملہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے لیے اِسی تعبیر کو اختیار کرکے واضح فرمایا کہ ابلیس کے فتنوں سے بچانے کے لیے وہ بھی اِسی طرح آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آکر انتھک، ہمہ جہت اور شبانہ روز جاں فشانی کے ساتھ اپنے مخاطبین کو سمجھاتے رہے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿١٥﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ

سو عاد کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی حق کے[۲۲] زمین میں بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے کہ ہم سے بڑھ کر طاقت میں کون ہے! کیا اُنھوں نے سوچا نہیں کہ جس خدا نے اُن کو پیدا کیا ہے، وہ اُن سے طاقت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہے؟ (اِس طرح بڑے بن بیٹھے) اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔ سو ہم نے نحوست کے چند دنوں میں[۲۳] اُن پر سرما کی تند ہوا[۲۴] بھیج دی تا کہ اُن کو اِسی دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب[۲۵]

۲۱۔ اِس اسلوب میں جو طنز ہے، وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اُن کا مطلب یہ تھا کہ آپ لوگ بزعم خویش جس پیغام کے حامل بن کر آئے ہو، ہمیں اُس سے صاف انکار ہے، یعنی نہ ہم آپ لوگوں کو رسول مانتے اور نہ آپ لوگوں کے پیغام کو پیغام۔ اِس وجہ سے ہم پر اِس قسم کی کوئی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔" (تدبر قرآن ۷/۹۱)

۲۲۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اپنی بڑائی کا اظہار صرف اُسی کو زیبا ہے جو کائنات کا خالق ہے۔ اُس کے سوا جو بھی اِس کا اظہار کرے گا، ناحق کرے گا۔ یہ اُس کے سوا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔

۲۳۔ یعنی جب سردی کی شدت سے ہر چیز پر اداسی، افسردگی اور نحوست چھائی ہوئی تھی۔

۲۴۔ یہ عرب میں شمال سے چلتی تھی اور اِس کے ساتھ سرما کے بادل بھی ہوتے تھے اور گرج چمک بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسی کو انتہا تک پہنچا کر اُن کے لیے عذاب بنا دیا۔

۲۵۔ یعنی ایسا عذاب جو اُن کو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں نمونۂ عبرت بنا دے۔ یہ، ظاہر ہے کہ اُس سنت الٰہی کے مطابق ہوا جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔

الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١٦﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٧﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿١٨﴾

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ

حم السجدہ ۴۱

چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو اِس سے کہیں زیادہ رسوا کر دینے والا ہو گا اور وہاں اُن کو کوئی مدد بھی نہیں پہنچے گی[۲۶]۔ ۱۵-۱۶

رہے ثمود تو ہم نے اُن کو بھی ہدایت کی راہ دکھائی، مگر اُنھوں نے ہدایت پر اندھا بن کر رہنے کو ترجیح دی۔ سو اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کو ذلت کے عذاب کی کڑک نے آ دبوچا اور ہم نے اُن کو بچا لیا جو ایمان لائے اور ہم سے ڈرنے والے تھے۔ ۱۷-۱۸

اُس دن کا خیال کرو، جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف ہانک کر اکٹھے کیے جائیں گے[۲۷]۔ پھر (اِن کے اعمال کے لحاظ سے) اِن کی درجہ بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ وقت آ جائے گا کہ دوزخ تک آ پہنچیں گے تو جو کچھ یہ کرتے رہے، اِن کے

۲۶؎ یعنی نہ اُن کے دیوی دیوتا کچھ کام آئیں گے اور نہ اُن کی قوت و جمعیت، جس پر دنیا میں نازاں رہے۔

۲۷؎ آیت میں 'يُحْشَرُ' کے بعد 'اِلٰى' ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ لفظ 'يُسَاقُوْنَ' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔

وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢١﴾

کان اور اِن کی آنکھیں اور اِن کے جسم کے رونگٹے[۲۸] اِن پر اُس کی گواہی دیں گے۔ یہ اپنے جسموں سے پوچھیں گے: تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے: ہم کو اُسی اللہ نے گویا کر دیا جس نے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔ (اِس طرح گواہی دیں گے اور لوگو، یہ بات بھی یاد رکھو کہ) اُسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور اب اُسی کی طرف لوٹائے جا رہے ہو[۲۹]۔ ۱۹-۲۱

۲۸ یہ احاطے کے لیے ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ آدمی کے جسم کا رواں رواں اُس دن گواہی کے لیے زبان بن جائے گا۔ یہ، اگرچہ یہاں بھی بنا ہوا ہے، لیکن اِس کو سنتے وہی ہیں جن کے دل شنوا ہیں۔

۲۹ یہ جملہ 'جُلُوْد' کے جواب کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اِس کا عطف اصل سلسلۂ کلام پر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...'جُلُوْد' سے سوال اور اُن کے جواب کا ذکر بیچ میں بطور جملۂ معترضہ آ گیا ہے۔ اصل بات جو اوپر فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اُس دن اُن کے کان، آنکھ اور اُن کے دوسرے تمام اعضا اُن کے خلاف گواہی دیں گے اور مقصود اِس سے اِس حقیقت کی وضاحت ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ آدمی کے اپنے ہی اعضا اُس کے سارے راز کھول دینے کے لیے ناطق ہو جائیں گے تو کسی اور کی گواہی اور شہادت و شفاعت اُس کے لیے کیا نافع ہو سکے گی؟ مدعی کی اپنی گواہی تو لاکھوں کی گواہی پر بھاری ہو سکتی ہے۔ اِسی پر عطف کرتے ہوئے فرمایا کہ 'اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اُسی نے تم کو اول بار پیدا کیا ہے اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے'۔ یعنی اگر تم نے یہ امید باندھ رکھی ہے کہ تمھاری واپسی تمھارے اِن

حٰمٓ السجدۃ ۴۱

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾

حٰم السجدہ
۴۱

تم یہ اندیشہ نہیں رکھتے تھے[۳۰] کہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسموں کے رونگٹے تمھارے خلاف گواہی دیں گے، بلکہ تم نے تو گمان کر رکھا تھا کہ اللہ بھی اُن بہت سی چیزوں سے واقف نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ تمھارا یہی گمان ہے جو تم نے اپنے پروردگار کے بارے میں کیا تھا، جس نے تم کو غارت کیا اور تم خسارے میں پڑ گئے۔ ۲۲-۲۳

سو اگر یہ صبر کریں، تب بھی دوزخ ہی اِن کا ٹھکانا ہے اور اگر نہ کریں، تب بھی۔ اور اگر یہ معافی چاہیں گے تو اِنھیں معافی بھی نہیں دی جائے گی۔ ۲۴

مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کی طرف ہوگی، جن کی تم پرستش کرتے ہو تو یہ خیال محض وہم پر مبنی ہے۔ جن کو خلق و تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے، آخر وہ مولیٰ و مرجع کس طرح بن جائیں گے!'' (تدبر قرآن ۷/ ۹۴)

۳۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ' (تم چھپتے نہیں تھے)۔ یہ ظاہر ہے کہ اِسی لیے کہ اُنھیں اپنے اعضا سے اپنے خلاف کسی گواہی کا اندیشہ نہیں تھا۔ یہ لازم سے ملزوم پر استدلال کا اسلوب ہے۔ ترجمہ اِسی رعایت سے کیا گیا ہے۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوا لَهُم مَّا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيٓ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿٢٥﴾

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ﴿٢٦﴾ فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾ ذَٰلِكَ جَزَآءُ أَعْدَآءِ

(یہ اس انجام کو اِس لیے پہنچے کہ اِن کے گناہوں کی پاداش میں) ہم نے اِن پر برے ساتھی مسلط کر دیے[۳۱] تو اِن کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز اُنھوں نے اِن کو خوش نما بنا کر دکھائی اور بالآخر وہی بات اِن پر بھی پوری ہو کے رہی[۳۲] جو اِن سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گروہوں پر پوری ہوئی۔ یقیناً یہ خسارے میں رہنے والے تھے۔ ۲۵

یہ منکرین کہتے ہیں کہ اِس قرآن کو نہ سنو اور اِس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو تا کہ تم غالب رہو[۳۳]۔ سو ہم اِن منکروں کو ضرور سخت عذاب چکھائیں گے اور جو کچھ یہ کرتے

۳۱؎ یہ اُس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر ہے۔ چنانچہ یہ ساتھی جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ سورۂ زخرف (۴۳) کی آیت ۳۶ میں اِس کی وضاحت ہے۔

۳۲؎ یعنی یہ بات کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے مکذبین اِسی دنیا میں عذاب سے دوچار ہوں گے۔

۳۳؎ یعنی تمھاری بات اونچی رہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ سنا رہے ہیں، وہ اِس شور و شغب میں بالکل دب جائے۔

اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۖ جَزَآءً بِمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿٢٨﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ
وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٢٩﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ

رہے، ضرور اُس کا اِن کو بدترین صلہ دیں گے۔[۳۴] یہ اللہ کے دشمنوں کا بدلہ ہے۔ (جانتے ہو کیا ہے)؟ یہ آگ ہے۔[۳۵] اِن کے لیے اِن کے اِس جرم کی سزا میں کہ یہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے تھے، اِسی میں ہمیشہ کا ٹھکانا ہو گا۔ ۲۶-۲۸

وہاں یہ منکرین کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں وہ جن اور انسان ذرا دکھا دے جنھوں نے ہمیں گم راہ کیا تھا کہ ہم اُن کو اپنے پیروں تلے روندیں تا کہ وہ ذلیل وخوار ہوں۔ ۲۹

اِس کے برخلاف جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر (تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر) اُس پر ثابت قدم رہے، (اُن کی تسلی کے لیے قیامت کے دن، اِس سے پہلے کہ فیصلہ ہو)، اُن پر یقیناً فرشتے نازل ہوں گے اور کہیں گے کہ اب نہ کوئی اندیشہ کرو، نہ غم اور اُس جنت کی خوش خبری قبول کرو، جس کا

---

[۳۴] مطلب یہ ہے کہ جس جرم کا ارتکاب یہ لوگوں کو قرآن کی دعوت سے روک کر کر رہے ہیں، ابھی اُس کی شناعت کا اِنھیں احساس نہیں ہے۔ لہٰذا جو فصل یہ اپنے لیے بو رہے ہیں، جب اُس کا حاصل سامنے آئے گا، تب اِنھیں معلوم ہو گا کہ وہ کس بدترین صورت میں سامنے آیا ہے۔

[۳۵] اصل میں 'النَّار' کا لفظ ہے۔ یہ خبر ہے جس کا مبتدا حذف کر دیا ہے۔

تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ

وعدہ تم سے کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی رہے[۳۶] اور آخرت کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں۔ (ہم جس جنت کی خوش خبری تمھیں دے رہے ہیں)، اُس میں تمھارے لیے ہر وہ چیز موجود ہے جسے تمھارا دل چاہے گا اور اُس میں ہر وہ چیز حاضر ہے جو تم طلب کرو گے ـــــ اُس کی طرف سے سامان ضیافت[۳۷] کے طور پر، جو بڑا ہی بخشنے والا ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔ ۳۰-۳۲

(تم اِن کو اللہ کی طرف بلا رہے ہو، اے پیغمبر)، اور اُس سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرماں برداروں میں

۳۶؎ یعنی اُسی طرح جیسے شیاطین اُن لوگوں کے ساتھی رہے جنھوں نے اپنی باگ اُن کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ اِس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر شیطانوں کو یہ مہلت دے رکھی ہے کہ وہ انسانوں کو گم راہ کریں تو فرشتوں کو بھی یہ اذن دیا ہے کہ وہ اہل ایمان کو نیکی کی راہ سجھائیں اور اِس راہ میں جو مشکلیں پیش آتی ہیں، اُن میں اُن کی مدد کریں۔ یہ فیصلہ انسانوں کو کرنا ہے کہ وہ اِن میں سے کس کو اپنا ساتھی بناتے ہیں۔

۳۷؎ اصل میں لفظ 'نُزُل' استعمال ہوا ہے۔ یہ مہمان کی ابتدائی ضیافت کے لیے آتا ہے۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہل جنت کو آگے کیا ملنے والا ہے اور جس جنت کی تفصیلات قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اُس کا استحقاق پیدا کر لینے اور اُس میں داخل ہو جانے کے بعد وہ آگے کن مقامات و مراتب تک پہنچیں گے اور کن دنیاؤں میں داخل کیے جائیں گے۔

اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَ مَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَ مَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا

ہوں[۳۸]! حقیقت یہ ہے کہ بھلائی اور برائی، دونوں یکساں نہیں ہیں۔ (اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارے یہ منکرین اب برائی کے درپے[۳۹] ہیں، لیکن) تم برائی کے جواب میں وہ کرو جو اُس سے بہتر ہے[۴۰] تو دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، وہ گویا ایک سرگرم دوست بن گیا ہے[۴۱]۔ اور (یاد رکھو کہ) یہ دانش

خم السجدہ ۴۱

۳۸؎ یہ نہایت لطیف اسلوب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو آپ کی دعوت اور آپ کی شخصیت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ دیکھو یہ خدا کی توحید پر ایمان اور اُس کی بندگی کی دعوت ہے اور جو دینے کے لیے کھڑا ہوا ہے، وہ خود بھی عمل صالح کا پیکر اور اپنے پروردگار کا فرماں بردار ایک بندۂ مومن ہے۔ مگر تم پر افسوس، تم اِس کے باوجود سن کر نہیں دے رہے ہو!

۳۹؎ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ قریش کے اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جنون میں اِس حد تک بڑھ گئے تھے کہ آپ قرآن سنانے کے لیے کھڑے ہوتے تو لوگوں کو اکساتے تھے کہ غل مچا دو تا کہ اِس شخص کی آواز اُس میں ایسی دب جائے کہ کوئی اُسے سن نہ سکے۔ اِس کے جواب میں کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ آگے اُس کی وضاحت ہے۔

۴۰؎ یعنی صبر اور عفو و درگذر، اِس لیے کہ دعوت و اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہی رویہ بہتر ہے۔ چنانچہ خدا کی طرف سے فیصلۂ عذاب اور اتمام حجت سے پہلے ہر داعی حق کو اِسی کی ہدایت کی گئی ہے۔

۴۱؎ یہ انسان کی عام فطرت کو پیش نظر رکھ کر فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...جن کی فطرت مسخ نہیں ہو چکی ہوتی ہے، وہ جب دیکھتے ہیں کہ ایک شخص لوگوں کی بہی خواہی و ہمدردی میں اتنا بے چین ہے کہ اُن کی تمام گستاخیوں اور بدتمیزیوں کے

ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿٣٥﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ

اُنھی کو ملتی ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں اور یہ حکمت اُنھی کو عطا کی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں[۴۲]۔ اور اگر شیطان کی طرف سے (کسی موقع پر) تمھارے دل میں

باوجود اپنے کریمانہ رویے میں کوئی فرق آنے نہیں دیتا، بلکہ لوگوں کی اینٹوں اور پتھروں کا جواب دعاؤں سے دیتا ہے تو اُن کے دلوں میں اگر اُس کے خلاف کسی غلط فہمی کے باعث عداوت بھی ہو تو اُس کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر اُن کی یہ عداوت محبت سے بدل جاتی ہے اور وہ اُس کے جاں نثار ساتھیوں میں سے بن جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں سب سے زیادہ موثر عامل کی حیثیت آپ کے اِسی کردار کو حاصل رہی ہے۔ آپ کے دشمنوں میں سے جن کے اندر شرافت کا جوہر موجود تھا، وہ سب آپ کے اِسی کردار سے متاثر ہو کر آپ کے وفادار اور اسلام کے جاں نثار بنے۔ صرف وہی اشقیا اِس چیز سے متاثر نہیں ہوئے جن کی فطرت بالکل مسخ ہو چکی تھی۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۰۳)

۴۲؎ آیت میں 'وَمَا يُلَقّٰهَا' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن کی ضمیر کا مرجع وہی حکمت و موعظت ہے جس کی پیچھے ہدایت کی گئی ہے۔ عربی زبان میں اِس طرح ضمیر لانے کا طریقہ معروف ہے۔ اِس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اِس میں جو تعلیم مذکور ہے، اُس کا خلاصہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے چند نکات میں بیان فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اِس آیت سے تین باتیں معلوم ہوئیں:

ایک یہ کہ اوپر جو بات فرمائی گئی ہے، وہ ایک عظیم حکمت ہے۔

دوسری یہ کہ اِس حکمت کے حامل صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جن کے اندر صبر کا جوہر ہو۔ جن کے اندر یہ جوہر نہ ہو، وہ اِس کے اہل نہیں ہیں۔ اِس وجہ سے اِس کے طالبوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک لازوال خزانہ ہے۔ اِس وجہ سے ہر ہمت ور کو اِس کے حاصل کرنے کے لیے بازی کھیلنی چاہیے۔ بڑے ہی خوش بخت و بلند اقبال ہیں وہ

بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾
وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾

کوئی اکساہٹ پیدا ہو جائے[۴۳] تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔ بے شک، وہی سننے والا، جاننے والا ہے۔۳۳-۳۶

(لوگو، جو زمین و آسمان کا خالق ہے)، یہ رات اور دن اور سورج اور چاند بھی اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں[۴۴]۔ تم نہ سورج کو سجدہ کرو[۴۵] اور نہ چاند کو، بلکہ اُس اللہ کو سجدہ کرو جس نے اِنھیں بنایا ہے[۴۶]، اگر تم اُسی کی بندگی کرنے والے ہو[۴۷]۔ ۳۷

لوگ جو اِس بازی میں کامیاب ہو جائیں۔'' (تدبر قرآن ۷/۱۰۳)

۴۳؎ یعنی کوئی ایسا جذبہ ابھار دے جو اِس حکمت کے منافی ہو۔

۴۴؎ یعنی نہ خدا ہیں، نہ کسی پہلو سے خدائی میں شریک ہیں، بلکہ خدا کی قدرت وحکمت اور رحمت وربوبیت کی نشانیوں میں سے ہیں ——— یہ اب اُسی مضمون کو دوبارہ لیا ہے جو آیات ۹-۱۲ میں بیان ہوا ہے۔ بیچ میں جو مطالب آئے ہیں، وہ تنبیہ وتذکیر یا تسکین وتسلی کی نوعیت کے تھے، اِس وجہ سے کوئی بعد پیدا نہیں ہوا۔

۴۵؎ یہ عبادت کی تعبیر ہے، اِس لیے کہ یہ اُس کے سب سے زیادہ نمایاں مظاہر میں سے ہے۔

۴۶؎ اصل میں 'خَلَقَهُنَّ' کا لفظ آیا ہے۔ اِس میں ضمیر جمع اُن سب چیزوں کی طرف لوٹتی ہے جو پیچھے مذکور ہیں۔

۴۷؎ یعنی خدا کی بندگی کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ بندگی اِس طرح ہونی چاہیے کہ جو علامات اُس کی بندگی کے لیے خاص ہیں، اُن میں بھی کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں کی جو بندگی

حم السجدہ ۴۱

فَاِنِ اسۡتَكۡبَرُوۡا فَالَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوۡنَ لَهٗ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ وَهُمۡ لَا يَسۡـَٔمُوۡنَ ۩ ﴿۳۸﴾

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الۡاَرۡضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِىۡۤ اَحۡيَاهَا لَمُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۳۹﴾

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا لَا يَخۡفَوۡنَ عَلَيۡنَا ؕ اَفَمَنۡ يُّلۡقٰى

پھر اگر یہ تکبر کریں تو پروا نہیں، جو فرشتے تیرے پروردگار کی بارگاہ میں ہیں، وہ شب و روز اُسی کی تسبیح کر رہے ہیں اور (اُن کے ذوق و شوق کا یہ حال ہے کہ) کبھی تھکتے نہیں ہیں[۴۸]۔ ۳۸

اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بالکل بے جان پڑی ہے۔ پھر جب ہم (اپنی عنایت سے) اُس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ (زندہ ہو کر) لہلہاتی اور ابھرتی ہے[۴۹]۔ جس نے اُس کو زندہ کیا، یقیناً وہی مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۳۹

ہماری اِن نشانیوں کے بارے میں جو لوگ کج روی اختیار کر رہے ہیں[۵۰]، وہ ہم

کرتے تھے تو اُس کے متعلق اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ صرف اِس لیے وہ کرتے ہیں کہ یہ چیزیں خدا کی قربت کا ذریعہ ہیں۔ گویا اُن کی بندگی، اُن کے زعم میں، خدا ہی کی بندگی تھی۔ اِس ٹکڑے میں اُن کے اِسی زعم کی تردید ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/۱۰۸)

۴۸؎ مطلب یہ ہے کہ اِن سے کہیں اعلیٰ و اشرف مخلوقات خدا کی بندگی کے لیے موجود ہیں، یہاں تک کہ وہ فرشتے بھی جنھیں یہ معبود بنائے بیٹھے ہیں تو خدا کو اِن کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ اِس لیے اِن کو اِن کے حال پر چھوڑ دو اور تم بھی اِن کی کوئی پروا نہ کرو۔

فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾

سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔[۵۱] سو (فیصلہ کرلیں کہ) آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جائے گا یا وہ جو قیامت کے دن آئے گا اور اُسے کسی بات کا کھٹکا نہ ہوگا۔ (لوگو)، تم جو چاہو، سو کرو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جو تم کر رہے ہو، خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔[۵۲] ۴۰

جن لوگوں نے خدا کی اِس یاددہانی کا انکار کر دیا ہے، جب کہ وہ اُن کے پاس آ گئی ہے،[۵۳] اُنھوں نے اپنی شامت بلا لی ہے۔[۵۴] حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب

۴۹؎ یعنی سبزے اور نباتات سے ابھرتی، اپھتی اور بالکل تر و تازہ ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔

۵۰؎ یعنی یہ نشانیاں تو کسی اور طرف رہنمائی کر رہی ہیں اور اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث وہ کوئی اور راہ اختیار کر رہے اور لوگوں کو بھی اُسی کی طرف موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۵۱؎ اِس ابہام میں جو غضب ناکی مضمر ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چھپے ہوئے نہیں ہیں تو لازماً گرفت میں آئیں گے اور ایک دن اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھیں گے۔

۵۲؎ یہاں بھی وہی اسلوب ہے جو اوپر اختیار فرمایا ہے۔

۵۳؎ یعنی جب کہ اُس کے مضامین، اُس کی معجز بیانی اور اُس کے دلائل کی قوت، ہر چیز اُن کے سامنے آ چکی ہے۔

۵۴؎ یہ خبر ہے جو اصل میں حذف کر دی ہے اور اِس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ اِن کی بدانجامی کو ظاہر کرنے کے لیے اِن کے جرم کی سنگینی ہی کافی ہے، اُسے الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ

ہے۔ اِس میں نہ باطل اِس کے آگے سے داخل ہوسکتا ہے اور نہ اِس کے پیچھے سے۔[55]

۵۵ قرآن کے بارے میں جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے، یہ اُس کی دلیل بیان کی ہے کہ یہ لفظ اور معنی، دونوں کے اعتبار سے بالکل محفوظ اور اپنی دلالت میں بالکل قطعی ہے، اِس میں جن و انس کے کسی شیطان کی دراندازی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے بعض پہلوؤں کی مزید وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک یہ کہ قرآن اپنے آگے اور پیچھے، دونوں طرف سے بالکل محفوظ ہے۔ اِس کو اتارنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اِس کو لانے والے جبریل امین ہیں، اِس کے حامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اِس کو نقل و قبول کرنے والے اِس خلق کے پاکیزہ ترین اخیار و صالحین ہیں۔ گویا ابتدا سے لے کر انتہا تک 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است'۔ اِس میں کہیں بھی شیطان کی دراندازی کے لیے کوئی روزن نہیں ہے، نہ اِس کے آغاز کی طرف سے، نہ اِس کی انتہا کی طرف سے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا، جیسا کہ 'وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ' کے الفاظ سے واضح ہے، خود اہتمام فرمایا اور یہ قرآن مجید کا وہ امتیاز ہے جو اِس سے پہلے نازل ہونے والے صحیفوں کو حاصل نہیں ہوا۔ تورات و انجیل وغیرہ کی حفاظت کی ذمہ داری اُن کے حاملین پر ڈالی گئی تھی جو اُس کا حق ادا نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صحیفے بالکل محرف ہو کے رہ گئے اور اِن کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہو گیا، لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا اور اُس کو قیامت تک کے لیے ہر قسم کی آمیزش سے بالکل محفوظ کر دیا۔

اِس حفاظت کے کئی پہلو ہیں:

ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اِس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ یوں تو اِس نظام کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں، لیکن سورۂ جن کی تفسیر میں ہم واضح کریں گے کہ نزول قرآن کے زمانے میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تا کہ اُن

مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ﴿۴۲﴾

یہ نہایت اہتمام کے ساتھ اُس ہستی کی طرف سے اتاری گئی ہے جو سراسر حکمت ہے، ستودہ صفات ہے[56]۔ ۴۱-۴۲

کو قرآن میں اُس کے آگے سے (مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ) کچھ گھسانے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کام کے لیے اپنے جس فرشتہ کو منتخب کیا، اُس کی صفت قرآن میں 'ذِيۡ قُوَّةٍ' مطاع، قوی، امین اور 'عِنۡدَ ذِي الۡعَرۡشِ مَكِيۡنٌ' وارد ہوئی ہے، یعنی وہ فرشتہ ایسا زورآور ہے کہ ارواح خبیثہ اُس کو مغلوب نہیں کر سکتیں؛ وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے؛ وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اُس کے حوالے کی جاتی ہے، وہ اُس کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے، مجال نہیں ہے کہ اُس میں زیر زبر کا بھی فرق واقع ہو سکے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقرب ہے جو اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اِسی لیے فرمایا گیا کہ قرآن میں اُس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا، اول تو وہ ہر پہلو سے خود خیر الخلائق تھا، ثانیاً قرآن کو یاد رکھنے اور اُس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تنہا اُس کے اوپر نہیں ڈالی، بلکہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: 'لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ، اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ، فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ'* (اور تم اِس قرآن کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیز نہ چلاؤ، ہمارے اوپر ہے اِس کے جمع کرنے اور اِس کے سنانے کی ذمہ داری تو جب ہم اِس کو سنا چکیں تو اُس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمے ہے اِس کی وضاحت)۔ روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا، اُس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرب صحابہ یاد بھی رکھتے اور ہر رمضان میں حضرت جبریل کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی سہو و نسیان کا اندیشہ نہ رہے اور یہ مذاکرہ

* ۷۵: ۱۶-۱۹۔

حٰم السجدہ ۴۱

اُس ترتیب کے مطابق ہوتا جس ترتیب پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب کرنا پسند فرمایا۔ یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک کے آخری رمضان میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ پھر اِسی ترتیب اور اِسی قراءت کے مطابق پورا قرآن ضبط تحریر میں لایا گیا اور بعد میں خلفاے راشدین نے اِسی کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں*۔ یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو نہیں ہے کہ اُس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحت الفاظ اور بلاغت معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ جس کے سبب سے کسی غیر کا کلام اُس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام بھی، باوجودیکہ آپ اِس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اِس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِس وجہ سے اِس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اِس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی، اُن کی مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ اُن کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے، دونوں میں گہر اور پشیز کا فرق نظر آئے گا ـــــ اِس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَمِنْ خَلْفِهٖ) قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچواں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرما لیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو اُن کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے، بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے، لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ اِس وجہ

* یہ اگر کیا گیا تو محض اہتمام اشاعت کے لیے کیا گیا، جس طرح کہ مسلمانوں کی حکومتیں اب بھی کرتی رہتی ہیں۔ اِس سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ اِس طرح قرآن کا کوئی سرکاری نسخہ مرتب کرایا گیا تھا۔ قرآن جس طرح اب منتقل کیا جاتا ہے، اُسے ابتدا ہی سے لکھنے والے اِسی طرح لکھ کر اور یاد کرنے والے اِسی طرح یاد کر کے اگلی نسلوں کو منتقل کرتے رہے ہیں۔ وہ کبھی کسی سرکاری نسخے کا محتاج نہیں ہوا۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدۡ قِيۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ وَّ ذُوۡ عِقَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۴۳﴾
وَلَوۡ جَعَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِيًّا لَّقَالُوۡا لَوۡلَا فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ ؕ

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر)، تمھیں (اِن لوگوں کی طرف سے) وہی باتیں کہی جا رہی ہیں جو تم سے پہلے رسولوں کو کہی جا چکی ہیں۔ (اِس وقت اِنھیں ڈھیل دی گئی ہے، لیکن یہ بے خوف نہ ہوں)۔ واقعہ یہ ہے کہ تیرا پروردگار مغفرت والا اور اِس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔ ۴۳

(کہتے ہیں کہ یہ یاددہانی پہلی کتابوں کی زبان میں کیوں نہیں اتاری گئی)[۵۷]؟ ہم اگر اِس قرآن کو عجمی قرآن بنا کر اتارتے تو اُس وقت یہ اعتراض اٹھاتے کہ اِس کی

سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اِس میں کسی باطل کے گھسنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر اِس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہل علم اصل پر پرکھ کر اُس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱۱۱/۷)

۵۶؎ چنانچہ یہ محض اُس کا جود و کرم ہے کہ اُس نے یہ حکیمانہ کلام اتارا اور اپنی خلق کو اِس عظیم نعمت سے نوازا ہے۔

۵۷؎ یہ اعتراض غالباً یہود کا القا کیا ہوا ہے کہ اِس سے پہلے اگر تمام الہامی کتابیں ہماری زبان میں اتری ہیں تو یہ نئی کتاب عربی زبان میں کیوں نازل کی گئی ہے؟ اِس طرح کے اعتراضات، ظاہر ہے کہ وہ بنی اسمٰعیل کو قرآن جیسی نعمت سے محروم کرنے کے لیے ایجاد کرتے تھے، لیکن قریش کے نادان لیڈر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں اِنھی کو آگے نقل کرنا شروع کر دیتے تھے۔

ءَ اَعْجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّ شِفَآءٌ ؕ وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی ؕ اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۴۴﴾

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ

آیتیں (خود ہماری زبان میں) کھول کر بیان کیوں نہیں کی گئیں؟ کیا تعجب کی بات ہے کہ کلام عجمی اور مخاطب عربی! اِن سے کہو، ایمان والوں کے لیے تو یہ ہدایت ہے اور (دل کی بیماریوں کی) شفا ہے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لا رہے تو اُن کے کانوں میں، البتہ یہ گرانی ہے اور اُن کے اوپر یہ ایک حجاب بن گیا ہے[۵۸]۔ یہی ہیں جو (قیامت کے دن) اب کسی دور کی جگہ سے پکارے جائیں گے[۵۹]۔ ۴۴

اور (کہتے ہیں کہ موسیٰ کی کتاب کے بعد اِس نئی کتاب کی ضرورت کیوں پیش آئی)؟ یقیناً ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا فرمائی تھی، مگر اُس میں اختلاف پیدا کر

۵۸؎ یعنی چونکہ تاریکی کے خوگر ہیں، اِس لیے یہ آسمانی روشنی نمودار ہوئی ہے تو اِن کی آنکھیں ایسی خیرہ ہوگئی ہیں کہ اِن کی رہنمائی کے بجائے یہ اِن کے لیے اندھے پن کا ذریعہ بن گئی ہے۔

۵۹؎ یہ وہی پکار ہے جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۲۰) کی آیت ۱۰۸ میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت تو خدا کا پیغمبر اِن کے درمیان کھڑے ہو کر اِن کو بہت قریب سے پکار رہا ہے اور یہ سن کر نہیں دے رہے، مگر وہ دن بھی قریب آنے والا ہے، جب قیامت کا داعی بہت دور سے پکارے گا اور یہ اُس کے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے۔

سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

دیا گیا[60] اور تیرے پروردگار کی طرف سے اگر ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو[61] (خدا کی کتاب کے ساتھ اِس ظلم کی پاداش میں) اِن حاملین کتاب کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تو اب اُس کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جو الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ (اِس سے نجات کے لیے یہ خدا کی اِس یاددہانی سے فائدہ اٹھائیں تو اِنھی کا بھلا ہے، اِس لیے یاد رکھیں کہ) جو نیک عمل کرے گا تو اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا تو اُس کا وبال اُسی پر ہو گا اور تیرا پروردگار اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے[62]۔ ۴۵-۴۶

۶۰؎ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے نزول کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وہ دین و شریعت سے متعلق لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ مدعا یہ ہے کہ جب تورات میں اُس کے حاملین کی اُس کی حفاظت سے بے پروائی اور اُس کے کچھ حصے چھپانے اور کچھ ظاہر کرنے کے نتیجے میں ایسے اختلافات پیدا ہو گئے کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے بجاے وہ خود اختلافات کا ذریعہ بن گئی تو ضروری تھا کہ حق و باطل میں امتیاز اور لوگوں پر اتمام حجت کے لیے ایک نئی کتاب نازل کی جائے۔

۶۱؎ یعنی یہ بات کہ اِنھیں ابھی مہلت دینی ہے۔

۶۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ'۔ اِن میں مبالغہ پر جو نفی آئی ہے، وہ مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے اور ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

اِلَیۡہِ یُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ؕ وَ مَا تَخۡرُجُ مِنۡ ثَمَرٰتٍ مِّنۡ اَکۡمَامِہَا وَ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِہٖ ؕ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡہِمۡ اَیۡنَ شُرَکَآءِیۡ ۙ قَالُوۡۤا اٰذَنّٰکَ ۙ مَا مِنَّا مِنۡ شَہِیۡدٍ ﴿۴۷﴾ وَ ضَلَّ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَ ظَنُّوۡا مَا لَہُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۴۸﴾

اور (کہتے ہیں کہ یہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو، یہ کب نمودار ہوگی؟ اِن سے کہو)، قیامت کا علم تو اللہ ہی سے متعلق ہے۔ اور (صرف قیامت ہی نہیں)، یہ اُسی کا علم ہے کہ جس کے بغیر نہ میوے اپنے غلاف سے باہر نکلتے ہیں اور نہ کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے۔ (یہ اپنے شریکوں کے بل پر اُس سے بے پروا ہو رہے ہیں تو) یاد رکھیں، جس دن وہ اِن کو پکارے گا کہ میرے وہ شریک کہاں ہیں، (اُنھیں بلاؤ کہ تمھیں چھڑا لیں) تو کہیں گے کہ ہم نے تجھ سے عرض کر دیا کہ آج ہم میں سے کوئی بھی اُن کی گواہی دینے والا نہیں ہے[۶۳]۔ اُس وقت وہ سب اِن سے ہوا ہو جائیں گے جنھیں یہ اِس سے پہلے پکارتے رہے اور یہ سمجھ لیں گے[۶۴] کہ اب اِن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۴۷-۴۸

۶۳؎ یعنی اپنے جن معبودوں پر ہم کو ناز تھا، اُن کی حقیقت واضح ہوگئی۔ اب کوئی بھی اِس اعتراف کے لیے تیار نہیں ہے کہ تیرے ساتھ کسی شرک کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۶۴؎ اصل میں لفظ 'ظَنّ' استعمال ہوا ہے، لیکن یہ یہاں یقین کے معنی میں ہے اور اِس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ نادیدہ حقیقتوں کے بارے میں جو یقین انسان کو حاصل ہوتا ہے، اُس کے لیے یہی لفظ موزوں ہے۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۡ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿٤٩﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿٥٠﴾

انسان (کا معاملہ بھی عجیب ہے، وہ مصیبتوں کو آتے دیکھ کر) بھلائی کی دعا سے نہیں تھکتا، لیکن اگر اُس پر مصیبت آ جائے (اور وہ دیکھے کہ دعائیں نتیجہ خیز نہیں ہو رہی ہیں) تو مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اُس مصیبت کے بعد جو اُس کو پہنچی تھی، ہم اُس کو اپنی رحمت کی لذت چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت برپا ہو گی۔ لیکن (بالفرض ہوئی اور) میں اپنے رب کی طرف لوٹا دیا گیا تو کچھ شک نہیں کہ میرے لیے اُس کے ہاں بھی اچھا ہی ہے۔ (یہ اِن کے خواب ہیں جن کے بل پر یہ پیغمبر کا مذاق اڑا رہے ہیں)۔ سو اِن منکروں کو ہم ضرور اِن کے اعمال سے آگاہ کریں گے اور اِن کو لازماً ایک سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔[65] ۴۹-۵۰

---

۶۵ اِس سے پہلے جو بات نقل ہوئی ہے، وہ ایسی احمقانہ تھی کہ بات کو روک کر اُس پر یہ نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے۔ نیز اوپر سے بات لفظ 'اِنْسَان' کے ساتھ کی جا رہی تھی، لیکن اِس سے مراد چونکہ وہی منکرین ہیں جن کا ذکر پیچھے سے چلا آ رہا ہے، اِس لیے یہاں اُسے کھول دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس پست ہمتی اور ناشکرے پن اور اِس کے ساتھ انسان کے جس طنطنے کا ذکر ہوا ہے، وہ اِنھی منکرین کے باطن کی تصویر ہے جو پیغمبر کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ ﴿۵۱﴾
قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرۡتُمۡ بِهٖ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ هُوَ فِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۵۲﴾

انسان (کا معاملہ یہی ہے کہ اُس) پر جب ہم عنایت فرماتے ہیں تو وہ (غرور و استکبار سے) منہ موڑتا اور پہلو بدل لیتا ہے[66] اور جب اُس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے[67]۔ ۵۱

اِن سے کہو، ذرا غور تو کرو کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا کی طرف سے ہوا اور اِس پر بھی تم اِس کا انکار کرتے رہے تو اُس سے زیادہ گم راہ کون ہوگا جو بہت دور کی مخالفت میں جا پڑا[68]؟ ۵۲

۶۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ'۔ اِن سے وہی مضمون ادا کیا گیا ہے جو قرآن نے دوسرے مقامات میں 'تَوَلّٰى بِرُكۡنِهٖ'، 'ثَانِىَ عِطۡفِهٖ' وغیرہ محاورات سے ادا کیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ غرور و استکبار سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کی تعبیر ہے۔ 'جانب' کے معنی پہلو کے ہیں۔ آدمی جب کسی سے غرور کے ساتھ منہ موڑتا ہے تو مونڈھے جھٹک کر اپنا پہلو بدلتا اور وہاں سے چل دیتا ہے۔ اِسی حالت کو یہاں 'نَاٰ بِجَانِبِهٖ' سے تعبیر فرمایا ہے۔"

(تدبر قرآن ۷/ ۱۲۷)

۶۷۔ اوپر جس کردار کی تفصیل فرمائی ہے، یہ مخاطبین کو تنبیہ و تہدید کے بعد آخر میں اُس کا خلاصہ کر دیا ہے۔

۶۸۔ یہ قرآن پر پوری سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ غور کرنے اور اُس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی دعوت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَاۤ

(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر، اور یہ بھی متنبہ ہو جائیں)، اِنھیں ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اِن کے اندر بھی،[۶۹] یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔ اور (تمھاری تسلی کے لیے) کیا یہ بات

حٰم السجدہ ۴۱

''... اِس دعوت کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن اپنی تکذیب کرنے والوں کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ آگاہ کر رہا ہے، وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ سہل انگاری سے نظر انداز کر دی جائے یا ہنسی مسخری میں اڑا دی جائے، بلکہ بڑے ہی قوی دلائل کی شہادت کے ساتھ یہ بڑے ہی ہول ناک انجام کی خبر ہے۔ اِس وجہ سے جو لوگ ڈھٹائی سے اِس کو جھٹلا رہے ہیں، وہ کم از کم اِس کے دعوے کی صحت کے امکان کے پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر وہ اِس کی صحت کا امکان محسوس کرتے ہیں (اور کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم بھی اِس کے امکان سے انکار نہیں کر سکتا) تو دانش مندی کا تقاضا اور عاقبت بینی کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ اِس قرآن پر سو بار غور کریں اور جو فیصلہ بھی کریں، اُس کے نتائج پر دور تک سوچ کر کریں۔ اگر وہ اِس کو اختیار کریں گے تو کوئی چیز کھوئیں گے نہیں، بلکہ پائیں گے اور سب کچھ پائیں گے اور اگر محض ضد اور مخاصمت کے جنون میں مبتلا ہو کر اِس کا انکار کر دیں گے تو یہ مخاصمت اُن کو اتنی دور لے جا کر پھینکے گی، جہاں سے پھر لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا ـــــ مطلب یہ ہے کہ اِس معاملے پر اِس کی حقیقی اہمیت سامنے رکھ کے غور کرو۔ اگر ضد، انانیت، حسد اور مخاصمت کو اِس میں دخیل ہونے دیا گیا تو یہ کشمکش نہایت تباہ کن انجام پر منتہی ہو گی۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۲۸)

۶۹؎ یعنی مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں، قریش کے اندر بھی، جہاں سے اچھے لوگ نکل کر پیغمبر کے ساتھی بن جائیں گے اور غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کے ایسے شواہد سامنے آئیں گے کہ قرآن کی حقانیت اِن میں سے ہر شخص پر واضح ہو جائے گی۔

اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿۵۴﴾

سورة الشوریٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار ہر چیز کا گواہ ہے؟[۷۰] سنو، یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیشی کی طرف ہی سے شک میں ہیں۔[۷۱] سنو، وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔[۷۲] ۵۳-۵۴

—— ۲ ——

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ عٓسٓقٓ' ہے۔[۷۳] اللہ، غالب اور حکیم[۷۴] اِسی طرح تمھاری طرف وحی کرتا ہے اور جو تم سے پہلے گزرے ہیں، اُن کی طرف بھی اِسی طرح وحی کرتا رہا ہے، (اِنھی

۷۰؎ یعنی غلبۂ حق کی جو بشارت تمھیں دی جا رہی ہے، اُس کے ظہور کے ایک ایک مرحلے سے واقف ہے۔ اِس وجہ سے مطمئن رہو، اُس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی۔

۷۱؎ یہ اُن کی اصل علت فساد سے پردہ اٹھایا ہے کہ اِنھیں آخرت کا یقین نہیں ہے، لہٰذا اِسی چیز نے اِن کے اندر وہ عاقبت نا اندیشی اور ہٹ دھرمی پیدا کر دی ہے جس کا مشاہدہ کر رہے ہو۔

۷۲؎ چنانچہ نہ کوئی چیز اُس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے اور نہ کوئی اُس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکتا اور اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل سکتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہے گا اور جب چاہے گا، کر ڈالے گا۔

۷۳؎ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱

الْاَرْضِ ؕ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝۴ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ

مطالب کے ساتھ اور اِسی طریقے سے)[5]۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اُسی کا ہے اور وہ برتر اور عظیم ہے[6]۔ قریب ہے کہ آسمان (اُس کی ہیبت

کے تحت بیان کر دیا ہے۔ پچھلی سورہ کا نام بھی 'حٰمٓ' ہے۔ یہاں اُس پر 'عٓسٓقٓ' کا اضافہ ہے۔ یہ اِس بات کا قرینہ ہے کہ سورۂ حٰمٓ السجدہ کے ساتھ اِس سورہ کا تعلق ایک تکملہ یا تتمہ کا ہے جس میں بعض خاص مطالب کی توضیح کی گئی ہے جو پچھلی سورہ میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔

۴ے یعنی جو زبردست ہے اور چاہے تو گردن کشوں کی گردن دبا سکتا ہے، لیکن وہ حکیم بھی ہے، اِس لیے اُنھیں مہلت دیتا اور اُن کی ہدایت کے لیے یہ اہتمام فرماتا ہے ـــــ مدعا یہ ہے کہ آپ بھی اپنے رب عزیز و حکیم پر بھروسا رکھیں۔ آپ کے مخاطبین کی مہلت ختم ہو جائے گی تو یہ بھی اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے۔

۵ے یعنی اُسی دین کی تعلیمات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کو وحی کے ذریعے سے دیا۔ چنانچہ اِس قرآن میں نہ کوئی نیا دین بیان ہوا ہے اور نہ اُس کے دینے کے لیے پچھلے پیغمبروں کے طریقے سے مختلف کوئی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن کے مخاطبین جن چیزوں پر اصرار کر رہے ہیں کہ خدا خود اپنے فرشتوں کے ساتھ بدلیوں میں نمودار ہو یا اُن میں سے ہر شخص سے براہ راست رابطہ کر کے اُس کو اپنا پیغام پہنچائے، اِن میں سے کوئی طریقہ بھی خدا نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اُس کا طریقہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ انسانوں میں سے اپنے کچھ خاص بندوں کو وہ نبوت کے لیے منتخب کرتا ہے، پھر اُن کو وحی کے ذریعے سے اپنا پیغام دیتا اور اُنھی کے ذریعے سے اُس کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

۶ے لہٰذا اُس کی بارگاہ میں اِس طرح کے مطالبات پیش کرنے کی جسارت کسی کو بھی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سامنے آئے اور لوگوں سے خود ہم کلام ہو۔

فَوۡقِهِنَّ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ۝٥ وَالَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيۡظٌ عَلَيۡهِمۡ ۖ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ ۝٦

کے مارے) اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے، وہ تو اپنے پروردگار (کی خشیت کے سبب سے اُس) کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح[7] اور زمین والوں کے لیے مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں[8]۔ سنو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اِس کے باوجود جن لوگوں نے اُس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں، اللہ اُن پر نگران ہے[9] اور، (اے پیغمبر)، تم اُن پر ذمہ دار نہیں بنائے گئے ہو[10]۔ ۱-۶

۷ے تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور حمد میں اثبات کا۔ استاذ امام کے الفاظ میں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو تمام خلاف شان باتوں سے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شرک ہے، پاک اور تمام اعلیٰ صفات سے، جن میں سب سے مقدم توحید ہے، متصف قرار دیتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ تمام قربت کے باوجود، جو فرشتوں کو خدا کی بارگاہ میں حاصل ہے، اُن کا حال یہ ہے کہ خدا کی خشیت سے لرزاں و ترساں ہیں اور یہ احمق اُنھیں معبود بنائے بیٹھے ہیں، جب کہ وہ اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کسی کو خدا کا شریک ٹھیرا دیں۔

۸ے یعنی زمین پر جو اہل ایمان ہیں، اُن کی مغفرت کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ یہی اُن کی شفاعت ہے۔ اِس سے آگے کوئی چیز اُن کے اختیار میں نہیں ہے۔

۹ے یہ نہایت سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نگران ہے تو اِن کے تمام کرتوتوں کو دیکھ بھی رہا ہے، لہٰذا مہلت پوری ہو جائے گی تو اِن کو اِن کے انجام تک پہنچا دے گا۔

۱۰ے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمھاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے۔ اِس لیے یہ نہیں مانتے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِن کی پرسش اِنھی سے ہونی

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ

اِسی طرح، (جیسے کہ بیان ہوا) ہم نے ایک عربی قرآن[81] تمھاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم مکہ والوں[82] کو اور اُس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کردو،[83] خاص کر اُس دن سے خبردار کردو جو سب لوگوں کے جمع ہونے کا دن ہے، جس کے آنے میں

ہے، تم سے نہیں ہونی ہے۔

۸۱۔ قرآن کے ساتھ 'عَرَبِیّ' کی صفت بطور امتنان اور اتمام حجت ہے کہ اِس کے بعد اہل عرب کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

۸۲۔ اصل میں لفظ 'اُمّ الْقُریٰ' استعمال ہوا ہے۔ یہ مرکزی بستی کو کہتے ہیں اور عرب میں مرکزی بستی کی حیثیت مکہ ہی کو حاصل تھی۔ یہ بھی، ظاہر ہے کہ اتمام حجت کے پہلو سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اگر ایک پیغام مرکزی بستی کے لوگوں تک پہنچا دیا گیا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُس ملک کے لوگوں کو اُن کے سر پر چڑھ کر پکار دیا گیا ہے۔ اگر 'اُمُّ الْقُریٰ' کے بجائے عرب کے کسی گوشے سے یہ دعوت اُٹھتی تو باتیں بنانے والے یہ بات بنا سکتے تھے کہ آخر ہمارے اکابر و سادات اور ہمارے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر قرآن نے سب سے پہلے عوام کے طبقے کو کیوں مخاطب کیا، اُس کے حق و باطل کے اصلی پرکھنے والے تو مکہ کے سادات ہو سکتے تھے!'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۴۳)

۸۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست اہل عرب کی طرف ہوئی تھی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی دوسری تمام قومیں بھی آپ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کی مکلّف ہیں، لیکن اُن تک پیغام پہنچانے کی ذمہ داری قرآن نے براہ راست آپ پر نہیں، بلکہ آپ کی قوم بنی اسمٰعیل پر ڈالی ہے جس میں تبعاً دوسرے مسلمان بھی شریک ہیں۔ اِس کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہوگئی ہے۔

وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ﴿٧﴾

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٨﴾ أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۖ فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٩﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى

کوئی شک نہیں ہے۔ اُس دن ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔ ۷
(اِس سے زیادہ تمھاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے)۔ اگر اللہ چاہتا تو اِن سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن (اُس نے لوگوں کو ارادہ و اختیار کی آزادی دی، لہٰذا اب) وہ جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)[۸۴] اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور رہے وہ لوگ جو اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے ہیں تو اُن کا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ کیا اِن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں؟ تو یاد رکھیں کہ اللہ ہی کارساز ہے، وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور (یہ اُس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں)، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ تم[۸۵] جن چیزوں میں بھی کوئی اختلاف

۸۴؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ اُس کی رحمت کے مستحق وہی ہوں گے جو شرک اور نافرمانی اختیار کر کے اپنی جان پر ظلم نہیں ڈھائیں گے، بلکہ خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور اُس کی ہدایت کی قدر کریں گے۔ قرآن میں یہ قانون متعدد جگہوں پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو کوئی بدل نہیں سکتا، لیکن اُس کی یہ مشیت اندھا دھند نہیں ہے، یہ اُس کے عدل اور اُس کی حکمت کے تحت ہے۔

۸۵؎ یہاں سے متکلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گئے ہیں۔ گویا اوپر جو فرمایا تھا کہ تمھاری

اللّٰهِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبِّیۡ عَلَیۡهِ تَوَکَّلۡتُ ۖۗ وَ اِلَیۡهِ اُنِیۡبُ ﴿۱۰﴾
فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا
وَّ مِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡهِ ؕ لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ۚ وَ هُوَ
السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱۱﴾ لَهٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ

رکھتے ہو، (خواہ وہ توحید ہے یا آخرت)، اُس کا فیصلہ اللہ ہی کے حوالے ہے۔ وہی اللہ میرا پروردگار ہے، اُسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ ۸-۱۰

وہی زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اُسی نے تمھاری جنس سے تمھارے لیے جوڑے بنائے اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے بنائے۔ وہ اِس مزرعہ میں تمھاری تخم ریزی کرتا ہے[۸۶]۔ اُس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے[۸۷] اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے[۸۸]۔ زمین اور آسمانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں[۸۹]۔ وہ جس کی روزی چاہتا ہے، کشادہ کرتا

ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ ہے، اِس کے بعد لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے تو آپ نے اُس کی تعمیل کر دی۔

۸۶؎ اصل الفاظ ہیں: 'یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡهِ'۔ اِن میں ضمیر مجرور کا مرجع اُس مفہوم کے اندر ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے، یعنی انسانوں اور جانوروں کے اندر پیدایش کا وہ نظام جو گویا ایک فارم یا مزرعہ ہے جس سے وہ اگتے رہتے ہیں۔ عربی زبان میں ضمیریں اِس طریقے سے آتی ہیں۔

۸۷؎ یہ پچھلی بات کا نتیجہ ہے کہ جس نے یہ عظیم چیزیں پیدا کیں اور تخلیق کا یہ حیرت انگیز نظام قائم کیا ہے، اُس کے مثل کوئی چیز آخر کیسے ہو سکتی ہے؟ یقیناً کوئی چیز بھی اُس کے مثل نہیں ہے۔

۸۸؎ یعنی حقیقی سننے والا اور دیکھنے والا وہی ہے، اِس لیے کہ ایک سمیع و بصیر خالق ہی ایسی وسیع کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے اور وہی اُسے قائم رکھ سکتا ہے۔

۸۹؎ یعنی جب وہ خالق ہے تو وہی مالک بھی ہے۔ اُس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا

الشوریٰ ۴۲

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۲﴾
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ
اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا

ہے اور جس کی چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۱۱-۱۲

اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا[۹۰] کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم

کرنے کے بعد اُن کے خزانوں کی کنجیاں کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دے دی ہیں۔ وہ اُسی کے پاس ہیں۔ اِس لیے عنایت و رحمت کی تمام امیدیں بھی اُسی سے رکھنی چاہییں۔ کسی دوسرے کے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ اُس سے کوئی امید رکھی جائے۔

۹۰ یہ اب اُسی مضمون کی تفصیل فرمائی ہے جو سورہ کی ابتدا میں بیان ہوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا دین لے کر نہیں آئے ہیں جو اہل عرب کے لیے انوکھا اور اجنبی ہو، بلکہ اُسی دین کی دعوت دے رہے ہیں جس کی دعوت اُن سے پہلے کے پیغمبر دیتے رہے ہیں۔ اُس کے عقائد وہی ہیں، اُس کی اساسات وہی ہیں، اُس کی اخلاقی تعلیمات وہی ہیں اور چند ترامیم اور اضافوں کے سوا اُس کی شریعت بھی بالکل وہی ہے۔ اِس کے لیے انبیا علیہم السلام کا حوالہ جس طریقے سے دیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... پہلے ابتدائی اور آخری کڑی، یعنی حضرت نوح اور حضرت خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر بیچ کے انبیا میں سے تین جلیل القدر نبیوں —— حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام —— کا نام، خاص طور پر لیا۔ اِس اہتمام خاص کے ساتھ اِن کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اِنھی تینوں نبیوں کی پیروی کے مدعی اُس وقت قرآن کے سامنے تھے۔ مشرکین عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ بالترتیب

الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ

رکھو[91] اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔[92] تم جس چیز کی طرف اِن مشرکوں کو بلا رہے ہو

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ اِس طرح گویا نبیوں کی پوری تاریخ کی طرف بھی اجمالی اشارہ ہو گیا اور قابل ذکر امتیں بھی سامنے آ گئیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۵۲)

۹۱ یعنی اِس کو برقرار رکھو اور اِس پر قائم رہو۔ اِس کا کوئی حکم اگر فرد سے متعلق ہے تو فرد اُس پر قائم رہے اور معاشرے سے متعلق ہے تو معاشرے کے ارباب حل و عقد اُس پر قائم رہیں اور اُس کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ اقامت دین کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ جن اہل علم نے اِسے دین کو دنیا میں جاری اور نافذ کرنے یا رکھنے کے معنی میں لیا ہے، اُن کی رائے عربیت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم نے ''تاویل کی غلطی'' کے زیرعنوان اپنی کتاب ''برہان'' میں اِس رائے کی غلطی واضح کر دی ہے۔ یہ بالکل اُسی طرح کی تعبیر ہے، جیسے اقامت صلوٰۃ ہے۔ جس طرح اُس کے معنی نماز کو دنیا میں جاری اور نافذ کرنے کے نہیں ہیں، اِسی طرح اقامت دین کے بھی نہیں ہیں۔ قرآن نے 'عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ' اور 'يُحَافِظُوْنَ'* کی تعبیرات سے بالکل واضح کر دیا ہے کہ وہ جب لوگوں کو نماز قائم کرنے کا حکم دیتا ہے تو اُس سے اُس کی مراد کیا ہوتی ہے۔ یعنی یہی کہ اُس کا اہتمام رکھو، اُس کی حفاظت کرو اور اُس پر قائم رہو۔ یہی بات یہاں دین کے بارے میں فرمائی ہے۔ چنانچہ اقامت دین، جیسا کہ بعض اہل علم نے سمجھا ہے، دین کے فرائض میں سے ایک فرض اور اُس کے احکام میں سے ایک حکم نہیں ہے کہ اُسے ''فریضۂ اقامت دین'' قرار دے کر فرائض دینی میں ایک فرض کا اضافہ کیا جائے، بلکہ پورے دین کے متعلق ایک اصولی ہدایت ہے، بالکل اُسی طرح جیسے 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا'** (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ میں نہ پڑو) ایک اصولی ہدایت ہے۔

۹۲ یعنی پورے کا پورا اختیار کرو، جس طرح کہ وہ ہے اور جس نظم و ترتیب کے ساتھ دیا گیا ہے۔

* المعارج ۷۰: ۲۳، ۳۴۔

** آل عمران ۳: ۱۰۳۔

اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ﴿۱۳﴾
وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ
وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۴﴾

(کہ یہ خدا کو ایک مانیں)، وہ اِن پر بہت شاق گزر رہی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے[۹۳]، لیکن اپنی طرف آنے کی راہ وہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ۱۳

(اور یہ جو اِن پیغمبروں کے ماننے والے ہیں)، یہ صحیح علم اپنے پاس آچکنے کے بعد محض آپس کے ضدم ضدا کی وجہ سے متفرق ہوگئے ہیں۔ اور تمھارے پروردگار کی طرف سے اگر ایک مقرر مدت تک مہلت کی بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو اِن کے درمیان اُسی وقت فیصلہ کر دیا جاتا۔ (پھر یہی نہیں)، اِن کے بعد جو (خدا کی طرف سے) اُس کی کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اُس کتاب کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جو سخت الجھن میں ڈال دینے والا ہے[۹۴]۔ ۱۴

ایسا نہ ہو کہ اُس میں اپنی طرف سے کمی بیشی کر دو یا اُس کی ترجیحات خود طے کر دو یا اپنی تاویلات سے اُس کو کچھ کا کچھ بنا دو۔ اِن میں سے جو کام بھی کرو گے، اُس کا لازمی نتیجہ تفرقہ ہوگا۔

۹۳ اصل میں 'یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اِلٰی' اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔

۹۴ یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو اپنا دین اِس ہدایت کے ساتھ دیا کہ اُس میں تفرقہ پیدا نہ کیا جائے تو اُن کی امتوں میں جو تفرقہ پیدا ہوا، یہاں تک کہ

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا

سو، (اے پیغمبر)، تم اُسی دین کی دعوت دو (جو سب پیغمبروں کا دین ہے) اور جس طرح تم کو حکم دیا گیا ہے، اُس پر مضبوطی سے جمے رہو اور اِن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو[95] اور اعلان کردو کہ اللہ نے جو کتاب بھی اتاری ہے، میں اُس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں (حق و باطل کے معاملے میں) تمھارے درمیان انصاف کا فیصلہ کردوں۔ (یاد رکھو)، اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے اور تمھارا بھی[96]۔ (تم نہیں مانتے تو) ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔

حاملین کتاب بھی اُس سے محفوظ نہیں رہے اور اب وہ اپنی کتاب ہی کے بارے میں نہایت اضطراب انگیز شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں تو اِس کی بنیاد علم واستدلال یا تحقیق واجتہاد پر نہیں تھی، یہ محض ضدم ضدا اور باہمی عناد کی وجہ سے پیدا ہوا۔ ورنہ صحیح علم آچکنے کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ کسی چیز کے سمجھنے میں کوئی جزوی اختلاف ہو جائے، مگر وہ اِس طرح کے تفرقے کی صورت کبھی اختیار نہیں کرتا کہ ایک دوسرے کی تکفیر کی جائے یا اُس کو ضال ومضل قرار دیا جائے اور ایک ہی دین کے ماننے والے ایک دوسرے کے جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائیں۔

۹۵ یعنی اُن بدعتوں کی، جو اُنھوں نے اپنی خواہشوں سے دین میں پیدا کر رکھی ہیں۔

۹۶ مطلب یہ ہے کہ وہی مولیٰ و مرجع ہے، لہٰذا اُسی کے سامنے ہماری بھی پیشی ہونی ہے اور تم بھی اُسی کے حضور میں پیش کیے جاؤ گے۔ وہاں کوئی اور مولیٰ و مرجع نہیں ہوگا کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی شخص اُس کی طرف رجوع کرے۔

وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵ۭ وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝۱۶ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝۱۷ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ

ہمارے اور تمھارے درمیان مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ (قیامت کے دن) ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے۔۱۵

جو لوگ اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہیں (کہ اُس کے شریک ثابت کریں)، اِس کے بعد کہ (اُن کی طرف سے[۹۷]) اُس کو مانا جا چکا ہے، اُن کی حجت اُن کے پروردگار کے آگے بالکل پسپا ہونے والی ہے اور اُن پر غضب اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔۱۶

اللہ ہی ہے جس نے اپنی یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے اور (اِس طرح حق و باطل کو الگ الگ کرنے کے لیے) اپنی میزان نازل کر دی ہے۔ (اِنھیں توفیق ہو تو اِس سے فائدہ اٹھالیں، ورنہ) تم کو کیا پتا کہ شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو! اُس کے لیے وہی جلدی مچا رہے ہیں جو اُس پر ایمان نہیں رکھتے[۹۸]۔ ایمان والے تو اُس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقیناً برحق ہے۔

۹۷ یعنی قریش مکہ اور یہود و نصاریٰ کی طرف سے، جن میں سے ہر ایک خدا کو مانتا تھا۔

۹۸ چنانچہ استہزا کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔

اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿١٨﴾
اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿١٩﴾
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ
حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿٢٠﴾
اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ

سنو، جو لوگ قیامت (جیسی حقیقت) کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں، اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بہت دور کی گم راہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۷-۱۸

(اِن کو یہ ڈھیل اِس لیے مل رہی ہے کہ) اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ (اُن کی نافرمانی کے باوجود)، وہ جس کو چاہتا ہے، رزق عطا فرماتا ہے اور (یہ اِس ڈھیل سے بے خوف نہ ہوں، اِس لیے کہ) وہ بڑی قوت والا ہے، بڑا ہی زبردست ہے[۹۹]۔ (لوگو، ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ) جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اُس کی کھیتی میں اُس کے لیے برکت عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی اُس کا حصہ اُسے دیتے ہیں[۱۰۰] اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، اُس کو ہم اُس میں سے (جتنا چاہتے ہیں)، دے دیتے ہیں، مگر (اِس کے بعد پھر) آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ۱۹-۲۰

(خدا کا دین تو وہی ہے جو اُس نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے دیا ہے، پھر) کیا اِن لوگوں نے خدا کے کچھ ایسے شریک بنا رکھے ہیں جنھوں نے اِن کے لیے

---

۹۹ لہٰذا اُس کو کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اِس ڈھیل کے نتیجے میں یہ اُس کی گرفت سے نکل جائیں گے۔

۱۰۰ یہ الفاظ اصل میں بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ یہ تقابل کے اصول پر ہے، اِس لیے

وَلَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِیَ بَیۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا كَسَبُوۡا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِیۡرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِیۡ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ وَمَنۡ یَّقۡتَرِفۡ

وہ دین ٹھیرایا ہے جس کا اذن خدا نے نہیں دیا ہے؟ (یہ ایسی جسارت ہے کہ) اگر فیصلے کی بات طے نہ کر دی گئی ہوتی تو اِن کے درمیان اِسی وقت فیصلہ کر دیا جاتا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جو اِس طرح کے ظالم ہیں، اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ تم اِن ظالموں کو (اُس دن) دیکھو گے کہ اپنی کمائی کے وبال سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اُن پر پڑ کے رہے گا۔ اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے، وہ بہشت کے باغیچوں میں ہوں گے۔[۱۰۱] اُن کے لیے، جو کچھ چاہیں گے، اُن کے پروردگار کے پاس موجود ہو گا۔ بڑا افضل درحقیقت یہی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بشارت اللہ اپنے اُن بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے۔ اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگ رہا، میں تو بس قرابت کی محبت ہے، جس کا حق

کہ دوسرے ٹکڑے میں 'نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا' کے الفاظ موجود ہیں۔

۱۰۱؎ اصل الفاظ ہیں: 'فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ'۔ اِس میں 'جَنّٰت' بھی جمع ہے اور 'رَوۡضٰت' بھی۔ یعنی اہل جنت کے لیے ایک جنت نہیں، کئی جنتیں اور ایک باغیچہ نہیں، کئی باغیچے ہوں گے۔

حَسَنَةً نَّزِدۡ لَهٗ فِيۡهَا حُسۡنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ شَكُوۡرٌ ﴿۲۳﴾
اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنۡ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخۡتِمۡ

ادا کر رہا ہوں[۱۰۲]۔ اور کہہ دو کہ جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو ہم اُس نیکی میں اُس کے لیے بھلائی کو بڑھا دیں گے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، بڑا قدر دان ہے[۱۰۳]۔ ۲۱-۲۳

کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے؟ (ہرگز نہیں، یہ سراسر ہماری

۱۰۲؎ اصل میں 'اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِي الۡقُرۡبٰى' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں استثنا ہمارے نزدیک منقطع اور 'قُرۡبٰى' مصدر کے مفہوم میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ قریش کے اِن برخود غلط لیڈروں کو آگاہ کر دو کہ تمھاری تمام ناقدریوں، بے زاریوں اور دل آزاریوں کے باوجود میں اِس طرح جو اپنے رات دن تمھارے پیچھے ایک کیے ہوئے ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ اِس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہے۔ جس کے لیے خدا کی طرف سے اُس فضل عظیم کی بشارت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا، وہ بھلا تم سے کسی صلہ و معاوضہ کا طالب کیا ہوگا! میری یہ ساری سرگرمیاں اور بے قراریاں اِس وجہ سے ہیں کہ میں اُس حق قرابت سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں جو تمھارے اور میرے مابین ہے۔ تم میرے خاندان اور میری قوم کے لوگ ہو، اِس وجہ سے مجھ پر یہ حق ہے کہ جو ہدایت اور آگاہی خدا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں، اُس سے سب سے پہلے تم کو آگاہ کروں اور جس رحمت کی منادی کر رہا ہوں، اُس میں سب سے پہلے تمھیں شریک کرنے کی کوشش کروں۔''

(تدبر قرآن ۷/ ۱۶۵)

۱۰۳؎ مطلب یہ ہے کہ میں جس نیکی کی دعوت دے رہا ہوں، اُس سے میرا یا خدا کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے، بلکہ سراسر تمھارا نفع ہے۔ اِس لیے نیکی اور خیر کی یہ دعوت قبول کرو۔ تمھارا پروردگار اپنے بندوں کی نیکیوں کی بڑی قدر کرنے والا ہے۔

عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ

عنایت ہے)۔ سو اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مہر لگا دے (اور چاہے تو اپنی یہ عنایت جاری رکھے)[104]، جب کہ اللہ تو اپنے اِن کلمات کے ذریعے سے باطل کو مٹا رہا اور حق کو ثابت کر رہا ہے[105]۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ دلوں کے بھید تک جانتا

۱۰۴۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۸۶-۸۷ میں اِس طرح بیان ہوئی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے، وہ چھین کر لے جائیں، پھر اِس کے لیے تم ہمارے مقابل میں کوئی مددگار نہ پاؤ۔ مگر یہ صرف تمھارے پروردگار کی رحمت ہے کہ تم اِس سے سرفراز ہوئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا فضل تمھارے اوپر بہت بڑا ہے۔

۱۰۵۔ یہ قرآن کی حقانیت پر استدلال ہے کہ افترا ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ احقاق حق اور ابطال باطل کرے۔ اُس کا کام تو اِس کے بالکل برعکس ہونا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ’’...ذرا مختلف الفاظ میں یہی بات سیدنا مسیح سے اُن لوگوں کے جواب میں منقول ہوئی ہے جو آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ بدروحوں کو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے نکالتے ہیں۔ آپ نے اِن معترضین کو یہ جواب دیا کہ اگر میں نے شیطانوں کو شیطان ہی کی مدد سے نکالا تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ شیطان خود ہی اپنا دشمن بن گیا۔ یہی بات یہاں ارشاد ہوئی کہ اگر یہ کلام افترا اور اِس کا پیش کرنے والا مفتری ہے تو اِس کا اثر احقاق حق اور ابطال باطل کی صورت میں نہیں، بلکہ اِس کے بالکل برعکس نکلنا تھا۔ دنیا میں کس مفتری نے اِس طرح کا فیض بخش اور ارواح و قلوب کو منور کرنے والا کلام پیش کیا ہے، جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے!‘‘ (تدبر قرآن ۷/ ۱۶۸)

عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾

ہے۔ (یہ اُس کی طرف بڑھیں کہ) وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور اُن کی برائیوں سے درگذر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو[۱۰۶]۔ ۲۴-۲۵

ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے تو (اُس کی دعوت کو) قبول کرتے ہیں اور (اِس کے صلے میں) وہ اُن پر اپنا مزید فضل فرمائے گا۔ رہے یہ منکرین تو اِن کے لیے سخت عذاب ہے۔ ۲۶

(خدا نے جو کچھ انھیں دیا ہے، وہی اِن کے لیے فتنہ بن گیا ہے)۔ اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کو بالکل ہی کھول دیتا تو وہ زمین میں اودھم مچا دیتے۔ مگر وہ ایک حساب کے ساتھ جو چاہتا ہے، اُن کے لیے اتارتا ہے، اِس لیے کہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، وہ اُن کا نگران حال ہے۔ بلکہ وہی ہے جو اُن کے مایوس ہو جانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو (ہر طرف) پھیلا دیتا ہے اور وہی (سب کا) کارساز اور ستودہ صفات ہے[۱۰۷]۔ ۲۷-۲۸

۱۰۶؎ یعنی جب جانتا ہے تو اُس سے ڈرو، تم اپنا کوئی جرم اُس سے چھپا نہیں سکو گے۔

۱۰۷؎ لہٰذا نہ کسی کو اپنی دولت و ثروت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھنا چاہیے اور نہ خدا کی عنایتوں کو اپنی قابلیتوں کا حاصل یا اپنے مزعومہ شرکا کی کرشمہ سازی خیال کرنا چاہیے۔ یہ

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾
وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا

(یہ اُس کی وعید کو مذاق نہ سمجھیں)۔ زمین اور آسمانوں کی پیدایش اُسی کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ جان دار بھی جو اُس نے اِن دونوں کے اندر[۱۰۸] پھیلا رکھے ہیں اور وہ اِنھیں اکٹھا کر لینے پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے، جب وہ اِنھیں اکٹھا کرنا چاہے گا۔[۱۰۹] ۲۹

(لوگو، جب خدا سے بغاوت کر دیتے ہو تو دنیا میں بھی) جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے، تمھارے

بارش جس پر تمام معیشت کا انحصار ہے، اِس کے لیے آسمان کے بند دریچوں کو وہی کھولتا ہے۔ یہ اُس کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی اُس کو روک کر وہ لوگوں کو اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

۱۰۸۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ جانور زمین میں چلتے اور پرندے فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی لفظ 'سَمَاء' دوسری بہت سی زبانوں کی طرح اِس معنی کے لیے آتا ہے۔

۱۰۹۔ آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: 'بَثَّ' اور 'جَمْع'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس آیت میں 'بَثَّ' اور 'جَمْع' کا تقابل بھی نہایت بلیغ اور قیامت کی ایک نہایت دل نشین دلیل ہے۔ 'بَثَّ' کے معنی چھٹنے، بکھیرنے اور پھیلانے کے ہیں اور 'جَمْع' کے معنی اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کے۔ اِس سے یہ اشارہ نکلا کہ جس نے زمین اور فضا میں یہ تمام جان دار پھیلائے ہیں، وہ اِن کو، جب چاہے گا، جمع کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب وہ اِن کو بکھیرنے پر قادر رہا تو اُن کو سمیٹنے سے کیوں قاصر رہے گا؟ جو کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے، وہ ضائع کرنے کے لیے تخم نہیں بکھیرتا، بلکہ وہ اُس کا حاصل ایک دن جمع بھی کرتا ہے اور اُس میں اُس کو کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۱)

عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾

کرتوتوں ہی کی بدولت پہنچتی ہے اور تمھاری بہت سی برائیوں سے وہ درگذر بھی فرماتا ہے۔ (یہ اِس لیے کہ تم اِس سے یاددہانی حاصل کرو)، ورنہ تم روے زمین پر کہیں اُس کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے ہو اور اللہ کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی کارساز ہوتا ہے، نہ مددگار[۱۱۰]۔ ۳۰-۳۱

اور سمندر میں چلنے والے پہاڑوں کی طرح (اونچے) جہاز بھی اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں[۱۱۱]۔ اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے، پھر وہ سمندر کی سطح ہی پر ٹھیرے رہ جائیں ــــ اِس میں، یقیناً ہر اُس شخص کے لیے نشانیاں ہیں جو صبر کرنے والا، شکر کرنے والا ہو[۱۱۲] ــــ یا اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کے جہازوں کو تباہ کر دے اور بہتوں سے درگذر

۱۱۰۔ یہ مخاطبین کی زندگی میں خدا کے قانون مجازات کے ظہور سے استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجازات کو سمجھنا چاہو تو اپنی روزمرہ زندگی کے تجربات سے بھی سمجھ سکتے ہو۔ پھر یہ کس طرح خیال کرتے ہو کہ اُس نے کامل جزا و سزا کے لیے کوئی دن مقرر نہیں کیا ہے اور تم کو بنا کر تمھارے خیر و شر سے بے نیاز کہیں اطمینان سے کسی گوشے میں بیٹھ گیا ہے؟

۱۱۱۔ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ زندگی کی کشتی خدا کے حکم ہی سے چلتی اور اُسی کے حکم سے، جہاں وہ چاہتا ہے، ٹھیر جاتی ہے اور بارہا اپنے مسافروں کے کرتوتوں کی وجہ سے ڈوب بھی جاتی ہے۔

۱۱۲۔ یعنی اِس حکمت سے بہرہ مند ہو کہ مصیبتیں آجائیں تو آدمی کو اپنے رب کے بھروسے پر صبر

وَّ يَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ يُجَادِلُوۡنَ فِيۡۤ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِيۡصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنۡ شَيۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّ اَبۡقٰى لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿ۚ۳۶﴾

فرمائے۔[113] اِس لیے تباہ کر دے کہ اُن سے انتقام لے اور اِس لیے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کٹ حجتی کر رہے ہیں، وہ جان لیں[114] کہ اُن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۳۲-۳۵

سو جو کچھ تمھیں ملا ہے، (لوگو)، وہ اِس دنیا کی زندگی کی متاع حقیر ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ کہیں بہتر اور پایدار ہے، اُن کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔[115] ۳۶

کرنا چاہیے اور نعمتیں ملیں تو اُن پر اترانے کے بجاے اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِس لیے کہ بندے کو جو کچھ بھی ملتا ہے، خدا ہی کے دیے ملتا ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے، اُسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ جو لوگ اِس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں، اُن کو نعمت مغرور اور مصیبت مایوس بناتی ہے۔ وہ کبھی ایمان کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوتے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۳)

۱۱۳؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ دنیا میں ضروری نہیں ہے کہ خدا سے سرکشی اختیار کرنے والوں کی ہر غلطی اور گناہ پر اُنھیں لازماً سزا مل جائے۔ یہ دنیا اصلاً جزا و سزا کے لیے نہیں، بلکہ امتحان کے لیے بنائی گئی ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ یہاں بہتوں سے درگذر ہی فرماتے ہیں۔ آیت میں جس چیز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ چشم بصیرت وا ہو تو لوگ مکافات عمل کے نمونے اِس دنیا میں بھی دیکھ سکتے اور اُن سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۱۴؎ اصل میں 'يَعۡلَمَ' ہے اور یہ حالت نصب میں ہے۔ اِس وجہ سے اِس کا معطوف علیہ عربیت کی رو سے محذوف ماننا جائے گا۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

وَالَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا

اور وہ کہ جو بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے بچتے ہیں [۱۱۶] اور جب کبھی غصہ

۱۱۵۔ یہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ آخرت کی ابدی بادشاہی کے طالب ہوں، اُن کے لیے اِس راہ میں اصلی زادِ راہ توکل ہے۔ جب تک کسی کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو کہ اِس دنیا کی جو چیزیں خدا کی راہ میں مزاحم ہوں، اُن کو خدا کے بھروسے اور آخرت کے صلے کے اعتماد پر طلاق دے سکے، اُس وقت تک کوئی شخص یہ ابدی بادشاہی حاصل نہیں کر سکتا۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۵)

۱۱۶۔ اصل میں 'اِثْم' اور 'فَوَاحِش' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'اِثْم' سے مراد وہ برائیاں ہیں جو حق تلفی اور ناانصافی کی نوعیت کی ہوں اور 'فَوَاحِش' کا لفظ اُن برائیوں کے لیے آتا ہے جو شہوت سے پیدا ہوتی ہیں، یعنی زنا، اغلام اور اِن کے متعلقات۔ یہاں اِن برائیوں کے صرف کبائر سے بچتے رہنے کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ انسان کی کم زوری کا لحاظ کر کے اُس نے یہ مطالبہ اُس سے نہیں کیا کہ وہ بالکل معصوم ہو کر زندگی گزارے۔ چنانچہ دوسرے مقامات میں بشارت دی ہے کہ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچتا رہے گا تو اُس کی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں سے اللہ تعالیٰ درگذر فرمائے گا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... چھوٹی برائیوں سے بچنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی بڑی برائیوں سے اجتناب کرے۔ جو شخص بڑی بڑی امانتیں ادا کرتا ہے، اُس کا ضمیر اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی چھوٹی سی امانت میں خیانت کر کے خائن کہلانے کا ننگ گوارا کرے۔ اِسی طرح اللہ کا جو بندہ بڑی برائیوں سے اپنے کو بچاتا ہے، وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اجر کو برباد کرے۔ جو شخص اشرفیوں کی چوری سے اجتناب کرے گا، وہ دھیلے اور پیسے کی چوری کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر اِس طرح کی کوئی حرکت

هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾

آجائے تو ایسے لوگ ہیں کہ درگذر کر جاتے ہیں[117]۔ اور وہ کہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی ہے اور نماز کا اہتمام رکھا ہے[118] اور اُن کا نظام اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہے[119] اور ہم نے جو رزق اُنھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں[120]۔ ۳۷ - ۳۸

اُس سے صادر ہو گی بھی تو سہواً ہی ہو گی، عمداً نہیں ہو گی۔ البتہ جو لوگ مچھر کو چھانتے ہیں، اُن کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اونٹ کو نگل جانے والے ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۷)

۱۱۷ غصہ اپنی ذات میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزت نفس کا ایک فطری تقاضا ہے۔ تاہم اِسے حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں اِس کے بارے میں جو ہدایت فرمائی ہے، اُس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مخالفین اُس زمانے میں جو اشتعال انگیز حرکتیں کر رہے تھے، اُن میں مسلمان کہیں عفو و درگذر کا رویہ نہ چھوڑ دیں۔ چنانچہ آیت میں 'هُمْ' کی ضمیر کا اظہار بھی اِسی مقصد سے اور یہ زور پیدا کرنے کے لیے ہوا ہے کہ اگرچہ یہ کام نہایت کٹھن ہے، مگر استاذ امام کے الفاظ میں، آفرین کے مستحق ہیں وہ لوگ جو یہ کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں۔

۱۱۸ ایمان کی دعوت قبول کرنے کے بعد یہ اُس کے اولین مظہر کا ذکر ہے جو اگر سامنے نہیں آیا تو گویا ایمان کی دعوت ہی قبول نہیں کی گئی۔ اِس کے اہتمام سے مراد یہ ہے کہ اِسے برقرار رکھا جائے، اِسے پورے آداب کے ساتھ ادا کیا جائے اور اپنے شب و روز میں اِس کی مداومت کی جائے۔ یہی نماز ہے جو ایمان والوں کو منکرات و فواحش سے روکتی اور اجتماعی زندگی میں نظم و اطاعت کے ساتھ رہنے کی تربیت دیتی ہے۔

۱۱۹ ہجرت و براءت کے مرحلے میں یہ گویا لطیف اسلوب میں اِس بات کی بشارت ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب سیاسی اور اجتماعی ہیئت کی صورت میں منظم ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ یہ ذکر نماز کے بعد کیا گیا ہے اور اِس بات کا اشارہ ہے کہ وہ خدا کے سامنے بھی

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا

اور وہ کہ جو بدلہ اُس وقت لیتے ہیں[۱۲۱]، جب اُن پر زیادتی کی جائے۔ اِس لیے کہ

سرافگندہ رہنے والے ہیں، کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے اور اجتماعی زندگی میں بھی ایک دوسرے پر استبداد کو روا نہیں رکھتے۔ اُن کے ہاں اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ نسب، خاندان، مذہبی حیثیت یا اپنے جتھے کی طاقت کے بل پر کوئی شخص اُن پر مسلط ہونے کی کوشش کرے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا گیا کہ معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا نظام مشورے پر مبنی ہے۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'اَمر' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ کئی معنوں میں آتا ہے۔ یہاں قرینہ بتا رہا ہے کہ یہ نظم اجتماعی کے مفہوم میں ہے۔ شوریٰ 'فُعلٰی' کے وزن پر مصدر ہے اور خبر واقع ہوا ہے۔ جملے کی یہ تالیف پیش نظر رہے تو اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ نظم اجتماعی کے لیے اگر کسی سربراہ کے تقرر کا وقت آگیا ہے تو اُس کی امارت مشورے سے منعقد ہو۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں۔ جو کچھ مشورے سے بنے، وہ مشورے سے توڑا بھی جا سکے۔ جس چیز کو وجود میں لانے کے لیے مشورہ لیا جائے، ہر شخص کی رائے بالواسطہ یا بلاواسطہ اُس کے وجود کا جزو بنے۔ اجماع و اتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو فصل نزاعات کے لیے اکثریت کی رائے قبول کر لی جائے۔

۱۲۰؎ نماز کے بعد یہ خدا کی بندگی کا دوسرا ستون ہے۔ نماز بندے کا تعلق اُس کے خالق سے جوڑتی ہے اور یہ خلق سے، اور اِنھی دو ستونوں پر دین کی پوری عمارت قائم ہے۔

ایمان والوں کی یہ تمام صفات جس اسلوب میں اور جس موقع پر گنوائی گئی ہیں، اس میں مخالفین پر جو تعریض ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ اہل ذوق اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔

۱۲۱؎ اوپر فرمایا ہے کہ جب غصہ آجائے تو وہ درگذر کر جاتے ہیں۔ یہ اُسی پر استدراک ہے کہ اول تو وہ مخالفین کی تمام تر اشتعال انگیزیوں کے باوجود درگذر کرتے ہیں اور اگر کبھی جواب میں کچھ کہتے یا کرتے بھی ہیں تو اُسی وقت جب اُن پر کوئی صریح زیادتی کی جاتی ہے۔

سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿ؕ۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے[۱۲۲]۔ پھر جس نے معاف کیا اور معاملے کی اصلاح کر لی تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بے شک، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۱۲۳]۔ اور ہاں جن پر ظلم ہوا اور اُس کے بعد اُنھوں نے بدلہ لیا تو یہی ہیں جن پر کوئی الزام نہیں ہے۔ الزام تو اُنھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۳۹-۴۲

البتہ جو صبر کریں اور معاف کر دیں تو بے شک، یہی کام ہیں جن کی تاکید کی گئی ہے[۱۲۴]۔ ۴۳

۱۲۲؎ برائی کے جواب میں جو کچھ کیا جائے، وہ برائی نہیں، بلکہ قصاص ہے، لیکن یہاں اُس کو برائی کے لفظ سے مجانست کے اسلوب پر تعبیر کیا ہے۔ یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے، جیسے 'دناهم کما دانوا'۔

۱۲۳؎ یعنی کوئی شخص ظلم کرے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اور اُس کے جواب میں اگر ظلم کا جواب اُس سے بڑھ کر ظلم و عدوان سے دیا جائے تو اُس کو بھی اللہ سخت ناپسند کرتا ہے۔

۱۲۴؎ اِس میں، ظاہر ہے کہ انتقام اور بدلے کے حق کو مان کر عفو و درگذر کی ترغیب دی گئی ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی اولیٰ ہے۔ لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر صبر کی خصلت پیدا کرے۔

وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ وَّلِيٍّ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيۡنَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ يَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ۚ﴿۴۴﴾ وَتَرٰٮهُمۡ يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا خٰشِعِيۡنَ مِنَ الذُّلِّ يَنۡظُرُوۡنَ مِنۡ طَرۡفٍ خَفِىٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ الۡخٰسِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا

(یہ ظالم تو اب گم راہی میں پڑ چکے، اے پیغمبر)، اور جنھیں اللہ (اپنے قانون کے مطابق[125]) گم راہی میں ڈال دے تو اُس کے بعد پھر اُن کا کوئی کارساز نہیں ہو سکتا۔ تم اِن ظالموں کو دیکھو گے کہ جب عذاب سے دوچار ہوں گے تو (حسرت سے) کہیں گے کہ کیا (دنیا میں) واپس جانے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اور تم اِن کو دیکھو گے کہ اِس طرح دوزخ کے روبرو لائے جائیں گے[126] کہ ذلت سے جھکے ہوئے، کن انکھیوں سے دیکھتے ہوں گے۔[127] اُس وقت اہل ایمان کہیں گے کہ حقیقت میں خسارے والے تو وہ ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں

۱۲۵؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ جو لوگ جانتے بوجھتے گم راہی پر اصرار کریں، اُنھیں پھر اللہ اُسی گم راہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور وہ اُس کی توفیق سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔

۱۲۶؎ اصل میں 'يُعۡرَضُوۡنَ عَلَيۡهَا' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں ضمیر مونث کا مرجع دوزخ یا نار جہنم ہے جو پیچھے 'عَذَاب' کے لفظ سے مفہوم ہو رہا ہے۔ عربی زبان میں ضمیر اِس طرح لانے کا یہ اسلوب معروف ہے۔

۱۲۷؎ یعنی بالکل اُسی طرح، جیسے کسی مجرم کو مقتل کی طرف لے جایا جائے تو وہ اپنے جلاد یا مقتل کو دیکھتا ہے۔

اَنۡفُسَهُمۡ وَاَهۡلِیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابٍ مُّقِیۡمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمۡ مِّنۡ اَوۡلِیَآءَ یَنۡصُرُوۡنَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ سَبِیۡلٍ ﴿ؕ۴۶﴾

اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِرَبِّكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمۡ مِّنۡ مَّلۡجَاٍ یَّوۡمَئِذٍ وَّمَا لَكُمۡ مِّنۡ نَّكِیۡرٍ ﴿۴۷﴾

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا ؕ اِنۡ عَلَیۡكَ

کو خسارے میں ڈال دیا۔ سنو، یہ ظالم یقیناً ایک دائمی عذاب میں پڑیں گے[۱۲۸] اور وہاں اِن کے کوئی سرپرست نہ ہوں گے جو خدا کے مقابل میں اِن کی مدد کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کو اللہ گم راہ کر دے تو پھر اُس کے لیے (نجات کی) کوئی راہ نہیں ہے۔۴۴-۴۶

(لوگو، اب بھی وقت ہے)، تم اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہو، اِس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آجائے جو ٹلنے والا نہیں ہے۔ اُس دن تمھارے لیے نہ کوئی پناہ ہوگی اور نہ تم کسی چیز کو رد کرسکو گے۔[۱۲۹] ۴۷

اِس پر بھی اگر اعراض کریں تو ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو اِن پر کوئی داروغہ نہیں مقرر کیا ہے۔ تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ انسان کا حال تو

۱۲۸؎ یہ وضاحت فرما دی ہے کہ کیوں اصل خسارہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے۔ فرمایا، اِس لیے کہ اُس کا عذاب دائمی ہے۔

۱۲۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ نَّكِیۡرٍ'۔ لفظ 'نَكِیۡر' کا صحیح مفہوم کسی ناگوار چیز کو احساس غیرت کے ساتھ رد یا دفع کرنا ہے۔ ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

إِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ إِنَّآ إِذَآ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنْسَانَ كَفُورٌ ﴿۴۸﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ إِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُورَ ﴿۴۹﴾ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّإِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيمًا ؕ إِنَّهٗ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿۵۰﴾ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآئِ

الشوریٰ
۴۲

یہی ہے کہ اُس کو جب ہم اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں تو اُس پر اترانے لگتا ہے اور اگر لوگوں کے اعمال کی پاداش میں اُن کو کوئی افتاد پیش آجائے جو اُنھوں نے آگے بھیجے ہیں تو اُس وقت انسان بڑا ہی ناشکرا بن جاتا ہے[۱۳۰]۔ ۴۸

(یہ جو چاہیں، کہیں، حقیقت یہی ہے کہ) زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے۔ جن کو چاہتا ہے، بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جن کو چاہتا ہے، بیٹے عطا فرماتا ہے۔ یا اُن کو بیٹے اور بیٹیاں ملا کر بخشتا ہے اور جن کو چاہتا ہے، بے اولاد رکھتا ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۴۹-۵۰

(اِنھیں اصرار ہے کہ خدا اِن سے براہ راست کیوں کلام نہیں کرتا؟ اِن سے کہو)، کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے[۱۳۱] کہ اللہ اُس سے روبرو بات کرے، الّا یہ کہ وہ وحی

---

۱۳۰ مطلب یہ ہے کہ جو ایسے تنگ ظرف اور ناشکرے ہیں، اُن سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ یہ کبھی صحیح راہ اختیار نہیں کریں گے۔ اِس لیے اِن کا معاملہ اب اللہ کے حوالے کرو۔

۱۳۱ یعنی کسی انسان کا درجہ اور مقام نہیں ہے اور نہ وہ اِس کی تاب لا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اُسی کا ضعف ہے، جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اُس سے کبھی رو در رو کلام نہیں کیا ہے۔

حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ

کے ذریعے سے ہو[132] یا پردے کے پیچھے سے[133] یا پھر کوئی فرشتہ بھیجے کہ وہ اُس کے اذن سے اور جو وہ چاہے، وحی کر دے[134]۔ یقیناً وہ بڑا ہی عالی مقام ہے، بڑی حکمت والا ہے[135]۔ ہم نے تمھاری طرف بھی، (اے پیغمبر)، اِسی طرح اپنے حکم کی روح[136] وحی کی ہے۔

۱۳۲؎ اِس سے دل میں بات ڈال دینا مراد ہے اور انبیا علیہم السلام کے دل میں یہ بات جیسا کہ آیت میں 'اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ' کے الفاظ سے واضح ہے، محض فکروخیال کی صورت میں نہیں، بلکہ کلام کی صورت میں ڈالی جاتی ہے، جس کو وہ سنتے، سمجھتے اور محفوظ کر لیتے ہیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے موقعوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِسی طریقے سے کلام کیا گیا۔

۱۳۳؎ یہ طریقہ صرف موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ اُن کے سوا یہ شرف کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔

۱۳۴؎ اِس صورت میں بھی فرشتہ بعینہٖ کلام الٰہی کو وحی کرتا ہے۔ قرآن میں تصریح ہے کہ خود اُس کا نزول اِسی طریقے سے ہوا ہے۔ اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ باقی کتابیں بھی اِسی طرح نازل کی گئی ہوں گی۔

اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بشری صورت میں بھیج کر اور بعض اوقات رؤیا کے ذریعے سے بھی اپنے خاص بندوں کو اپنے بعض ارادوں سے آگاہ فرماتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اِس کی متعدد مثالیں مذکور ہیں۔ مگر یہ کلام کرنا نہیں ہے اور یہاں کلام زیر بحث ہے، اِس وجہ سے اِن طریقوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۱۳۵؎ یہ آخر میں قرآن کے عام اسلوب کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات کا حوالہ دیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... اِن دونوں (صفات) کو جمع کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی

تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ وَلٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا نَّہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ

تم نہیں جانتے تھے کہ شریعت کیا ہے[137] اور نہ یہ کہ ایمان کس کو کہتے ہیں[138]، مگر ہم نے

بلند و بالا ہے کہ نہ اُس کو کسی سے کلام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی یہ درجہ و مرتبہ رکھتا ہے کہ اُس سے ہم کلام ہو سکے۔ لیکن اِس عظمت و رفعت کے ساتھ وہ حکیم، عادل اور رحیم بھی ہے، اِس وجہ سے وہ خلق کی رہنمائی اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے اُن کو اپنے خطاب و کلام سے بھی نوازتا ہے اور اِس کے لیے اُس نے وہ طریقے اختیار فرمائے جو اوپر مذکور ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سے آگے بڑھ کر جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ خدا اُن میں سے ہر ایک سے رو در رو ہو کر بات کرے تو اِس قسم کے لوگ نہ خدا کی عظمت سے آگاہ ہیں، نہ اپنی بے حقیقتی سے۔ ایسے احمق لوگ اپنی اِس رعونت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوں گے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۱۹۳)

۱۳۶؎ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں براہ راست صادر ہوتی ہیں، اُن کی حقیقت قرآن میں اِسی لفظ 'رُوۡح' سے بیان کی گئی ہے۔ یہ گویا امر الٰہی ہے جو کبھی لفظ اور کبھی نفس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۸۵ میں 'اَلرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ' اور یہاں 'مِنۡ اَمۡرِنَا' کے الفاظ اِسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اِن سے مخاطبین کو یہ تنبیہ کرنا بھی مقصود ہے کہ یہ 'رُوۡح' امور غیب میں سے ہے، لہٰذا اِس کی حقیقت و ماہیت اِس دنیا میں کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا اور کسی شخص کو اِسے سمجھنے کے درپے بھی نہیں ہونا چاہیے۔

۱۳۷؎ اصل میں لفظ 'اَلۡکِتٰب' استعمال ہوا ہے۔ قرآن کی زبان میں یہ قانون و شریعت کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی مفہوم میں ہے۔

۱۳۸؎ دوسرے مقامات میں 'اَلۡکِتٰب' کے ساتھ لفظ 'اَلۡحِکۡمَۃ' آیا ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کی اصطلاح میں 'اَلۡحِکۡمَۃ' سے مراد ایمان و اخلاق کی تعلیمات ہیں جو انبیا علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔ یہاں 'اَلۡکِتٰب' کے ساتھ لفظ 'اَلۡاِیۡمَان' ہے اور سورۂ بنی اسرائیل میں اخلاقی تعلیمات کو بیان کرنے کے بعد 'ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ'*

* ۱۷: ۳۹۔

البیان

الشوریٰ ۴۲

نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی

اُس کو روشنی بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں[۱۳۹] راہ دکھاتے ہیں۔ یقیناً (اِسی روح کا فیضان ہے کہ) تم ایک سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو[۱۴۰]۔ اُس خدا کے راستے کی طرف کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے،

کے الفاظ سے قرآن نے گویا اپنی تعبیر کی خود تفسیر کر دی ہے کہ 'اُلْحِکْمَة' سے اُس کی کیا مراد ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیت میں اِن دونوں سے آشنائی کی جو نفی کی گئی ہے، وہ اِن کی تفصیلات اور مقتضیات کے اعتبار سے ہے اور نفی کا یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی معروف ہے۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ نبوت سے پہلے آپ خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا دین ابراہیمی کے احکام سے فی الجملہ بھی واقف نہیں تھے۔

۱۳۹؎ یعنی جن کے اندر اِس روشنی سے اکتساب کی صلاحیت پاتے ہیں، اُن کو راہ دکھاتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جس طرح منصب نبوت کا اہل ہر شخص نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اُنھی کو منتخب فرماتا ہے جو اُس کے اہل ہوتے ہیں، اُسی طرح اِس نور کے حامل بھی وہی ہوتے ہیں جن کے اندر اِس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ گویا اِس میں اُن لوگوں کا جواب بھی ہے جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اِنھی کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) ہمارے اندر سے نبوت اور اپنے کلام و خطاب کے لیے کیوں منتخب فرمایا، ہمارے اوپر اُس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی ہے کہ تم جو روشنی دکھا رہے ہو، اُس سے ہر شخص بہرہ یاب نہیں ہو سکتا، اُس سے بہرہ یاب وہی ہوں گے جو اُس کے اہل ٹھیریں گے۔ جو اُس کے اہل نہیں ہیں، اُن کو یہ روشنی راہ دکھانے کے بجائے خیرہ کر کے چھوڑ دے گی۔" (تدبر قرآن ۷/ ۱۹۵)

اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵۳﴾

اُسی کا ہے۔ سنو، تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں[۱۴۱]۔ ۵۱-۵۳

۱۴۰؎ چنانچہ لوگوں کو اگر صلاح و فلاح مطلوب ہے تو چاہیے کہ وہ تمھاری رہنمائی کی قدر کریں۔

۱۴۱؎ یہ آخر میں تنبیہ فرمادی ہے کہ خدا کے آگے پیشی اور جواب دہی کے لیے تیار رہو۔

کوالالمپور

۱۰/ اگست ۲۰۱۴ء

الزخرف - الدخان

۴۳ ـــــ ۴۴

الزخرف ۔ الدخان

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع توحید کے منکرین کو انذار ہے۔ پہلی سورہ میں، البتہ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کا پہلو نمایاں ہے اور دوسری میں انذار کا جس میں اُن لوگوں کے لیے سخت تہدید اور اِس تہدید کے دلائل و قرائن کی وضاحت ہے جو توحید کی اِس دعوت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا افترا قرار دے رہے تھے اور اِس طرح قرآن کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ یہ اِنھی کا گھڑا ہوا ہے جسے خدا کی کتاب کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن کی عظمت و شان اور اُس کے اہتمام نزول کا مضمون اِسی رعایت سے بیان ہوا ہے۔ دونوں سورتوں کو ایک ہی آیت سے شروع کر کے قرآن نے اِن کے اِس تعلق کی طرف خود اشارہ کر دیا ہے۔

اِن سورتوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورۃ الزخرف

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حٰمٓ ① وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ② اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ③ وَاِنَّهٗ فِىۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَيۡنَا لَعَلِىٌّ حَكِيۡمٌ ④

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ' ہے[۱]۔ یہ واضح کتاب (آپ ہی اپنی) گواہی ہے[۲]۔ ہم نے اِس کو عربی قرآن بنا کر اتارا ہے، اِس لیے کہ تم سمجھو[۳]۔ اور بے شک، یہ اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے[۴]، نہایت بلند اور حکمت سے لبریز[۵]۔ ۱-۴

۱؎ پہلی سورتوں کی طرح اِس سورہ کا نام بھی 'حٰمٓ' ہے۔ یہ اشتراک مطالب پر دلیل ہے اور اِسے قرآن کا ہر طالب علم تمام حوامیم میں بالکل نمایاں دیکھ سکتا ہے۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

۲؎ اصل میں 'وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'وَ' قسم کے لیے ہے۔ اِس قسم کا مقسم علیہ محذوف ہے اور لفظ 'مُبِيۡن' اِس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

۳؎ یہ امتنان و احسان بھی ہے اور اتمام حجت بھی۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ وہ یہ عذر پیش نہیں کر سکتے تھے کہ مخاطب عربی اور کلام عجمی!

۴؎ یعنی لوح محفوظ میں، جو تمام علم کا سرچشمہ ہے، لہٰذا کوئی شخص اِسے شیاطین کا القا اور کاہنوں کی کہانت یا محض شاعری اور خطابت گمان کر کے اِس کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ ۝٥ وَكَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِيٍّ فِى الۡاَوَّلِيۡنَ ۝٦ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝٧ فَاَهۡلَكۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝٨

پھر کیا تمھاری تذکیر سے ہم صرف اِس لیے صرف نظر کر لیں[6] کہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو؟ (ہرگز نہیں، ہم اپنی حجت پوری کریں گے)۔ ہم نے اگلوں میں بھی کتنے ہی نبی رسول بنا کر بھیجے۔ تاہم جو نبی بھی اُن کے پاس آتا، وہ اُس کا مذاق ہی اڑاتے تھے۔ پھر ہم نے اُن کو کہ تمھارے اِن منکروں سے کہیں زیادہ زور والے تھے، ہلاک کر ڈالا اور اگلوں کی مثالیں گزر چکی ہیں[7]۔ ۵-۸

کرے۔

[5] اِس لیے کہ جس کا یہ کلام ہے، وہ بھی نہایت بلند مقام اور سراسر حکمت ہے اور ہر کلام اپنے متکلم ہی کی صفات کا آئینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ پچھلی سورہ میں بعینہٖ یہی الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی آئے ہیں۔

[6] آیت میں 'صَفۡحًا' ہمارے نزدیک مفعول لہٗ کے مفہوم میں ہے اور اِس کے معنی چشم پوشی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا نے تمھارے اندر اپنی دینونت کو ظاہر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اِس باب میں خدا کی سنت اب پوری ہو کے رہے گی۔ اِسے محض اِس بنا پر ادھورا نہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ تم لوگ سرکشی کر رہے ہو۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ جب کسی قوم کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کو لازماً اُس کے انجام تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔

[7] یہ اشارہ عاد و ثمود اور اُن قوموں کی طرف ہے جن پر عذاب کی تفصیلات پیچھے جگہ جگہ بیان ہو چکی ہیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ﴿۹﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۚ﴿۱۰﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ

اور اگر تم اِن سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو لازماً یہی جواب دیں گے کہ اِن کو خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔۹
(وہی[۸]) جس نے زمین کو تمھارے لیے گہوارہ بنایا اور اُس میں تمھارے لیے راستے نکالے[۹] کہ تم راہ پاؤ[۱۰] اور جس نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ[۱۱] پانی

۸۔ یہاں سے آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تضمین ہے، یہ مشرکین کے جواب کا حصہ نہیں ہے اور اِس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہو، اُس کے تضمنات یہ بھی ہیں، اگر تم غور کرو۔

۹۔ یہی راستے ہیں جن کی وجہ سے انسان فلک بوس پہاڑوں کے اندر محبوس اور لق و دق صحراؤں میں بے منزل کا مسافر ہو کر نہیں رہ گیا ہے۔

۱۰۔ یعنی راستہ معلوم کرو اور جہاں پہنچنا چاہتے ہو، پہنچ جاؤ۔ نیز خدا کی اِن بے پایاں عنایتوں پر غور کرو اور وہ راستہ بھی پا لو جس کی دعوت یہ قرآن تمھیں دے رہا ہے۔

۱۱۔ یعنی اتنا ہی جس کا تحمل یہ زمین کر سکتی ہے اور جتنا اُس پر زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اِس سے یہ بات نکلی کہ یہ ایک عزیز و علیم کے قائم کردہ نظم کے تحت اترتا ہے اور اِس کو تنہا وہی اتارتا ہے، ورنہ اِس کا یہ نظم اور زمین میں زندگی پیدا کرنے اور اُس کو برقرار رکھنے کے ساتھ اِس کی یہ موافقت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ⑪ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ⑫ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ⑬

الزخرف ۴۳

برسایا، پھر اُس کے ذریعے سے ہم نے مردہ بستی کو حیات تازہ بخش دی۔[۱۲] اِسی طرح تم بھی (ایک دن) قبروں سے نکالے جاؤ گے۔ اور جس نے یہ سب قسم قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں[۱۳] اور تمھارے لیے کشتیاں اور چوپایے بنائے ہیں جن پر تم سوار ہوتے ہو[۱۴] کہ اِن کی پیٹھ[۱۵] پر اطمینان سے بیٹھو، پھر جب اِن پر اطمینان سے بیٹھ جاؤ تو اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو[۱۶] اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اِن کو ہماری

۱۲؎ آیت میں متکلم کا صیغہ اہتمام خاص پر دلیل ہے اور یہ اہتمام خاص اِس لیے ہے کہ اِس سے کائنات کی ایک بڑی حقیقت کو آشکارا کرنا مقصود ہے جو آگے بیان ہوئی ہے۔

۱۳؎ انسان کی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے چند چیزیں کافی تھیں، مگر یہ جس تنوع اور گوناگونی کے ساتھ پیدا کی گئی ہیں، اُس سے ظاہر ہے کہ اِس کائنات کے خالق کی قدرت و حکمت اور اُس کی رحمت و ربوبیت کی یاددہانی مقصود ہے۔

۱۴؎ یہ عام کے بعد دو خاص چیزوں کا ذکر ہے۔ اُس زمانے میں خشکی اور تری کی یہی دو سواریاں معروف تھیں۔ اب اِن میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے، اُس کو بھی اِنھی کے تحت سمجھنا چاہیے۔

۱۵؎ 'پیٹھ' کا لفظ اگرچہ کشتیوں کے لیے موزوں نہیں ہے، لیکن یہ یہاں علیٰ سبیل التغلیب استعمال ہوا ہے اور اِس طرح کا استعمال عربی زبان میں معروف ہے۔

۱۶؎ یعنی اِن پر بیٹھ کر غرور سے اکڑنے کے بجائے اُس کا شکر ادا کرو کہ اُس نے بغیر کسی استحقاق کے یہ نعمتیں تم کو عطا فرمائی ہیں۔

وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾

خدمت میں لگا دیا۔ ہم ایسے نہیں تھے کہ اِن کو اپنے قابو میں کر لیتے[۱۷]۔ یقیناً ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں[۱۸]۔ ۱۰-۱۴

۱۷؎ یعنی اِن کی پیٹھ پر بیٹھ کر اِس حقیقت کا اعتراف کرو کہ خدا کی ذات ہر شرک اور ہر عیب سے پاک ہے اور یہ اُسی کی شان اور اُسی کا فضل و کرم ہے کہ یہ چیزیں مطیع و فرماں بردار ہو کر تمھاری خدمت کر رہی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ اعتراف ایک حقیقت نفس الامری کا اعتراف ہے۔ اِس دنیا میں جو چیزیں بھی ہماری خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر ہی سے لگی ہوئی ہیں۔ یہ تسخیر نہ ہو تو مجرد ہماری تدبیر کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی کمند نہیں ڈال سکتی۔ اونٹ جیسے بڑے جانور کی ناک میں آپ نکیل ڈال دیتے ہیں اور گھوڑے کے منہ میں لگام لگا دیتے ہیں۔ یہی کام اگر آپ جنگل کے درندوں کے ساتھ کرنا چاہیں تو ہزار خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد بھی آپ شیر پر سواری نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی ہے کہ اُس نے ہماری خدمت کے لیے مختلف قسم کے جانور پیدا کیے اور ہمیں یہ صلاحیت بخشی کہ ہم اُن کو مسخر کر کے اپنے مختلف مقاصد میں استعمال کرتے ہیں۔ اِس زمانے میں بھاپ، بجلی اور ایٹم پر انسان کو جو تصرف حاصل ہوا ہے، وہ بھی خدا ہی کی تسخیر سے حاصل ہوا ہے۔ اِن فتوحات نے انسان کو بہت مغرور بنا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اب کون و مکان کا مالک سمجھنے لگا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے، اُن کو انسان کی قید سے آزاد کر کے رحمت کے بجائے عذاب بنا دے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۲۱۳)

۱۸؎ یہ ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف گریز کی نہایت خوب صورت مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِن پر بیٹھ کر سفر کے لیے نکلتے وقت یہ بات بھی یاد کرو کہ ایک دن وہ سفر بھی پیش آنے والا ہے جو تم کو سیدھا تمھارے پروردگار کے حضور پہنچا دے گا اور وہاں تنہا وہی ہو گا جس کے آگے اِن نعمتوں کے بارے میں جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے کہ اِن کو تم نے کس طرح استعمال کیا اور استعمال کرتے وقت اِن کے دینے والے کو کتنا یاد رکھا۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾

(یہ[19] سب جانتے اور مانتے ہوئے بھی) اِنھوں نے خدا کے بندوں میں سے بعض کو اُس کا جز بنا ڈالا ہے۔[20] حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا ہوا ناشکرا ہے۔ کیا اپنی مخلوقات میں سے اُس نے اپنے لیے بیٹیاں پسند کیں اور تم کو بیٹے دے کر نوازا ہے؟ اور اِن کا اپنا حال یہ ہے کہ جب اِن میں سے کسی کو اُس چیز کی خوش خبری دی جاتی ہے، جس کی تہمت خداے رحمٰن پر رکھتا ہے تو اُس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگتا ہے، اور (سوچتا ہے کہ) کیا وہ پیدا ہوئی ہے جو زیوروں میں پلتی اور مخاصمت کے موقعوں[21] پر گویا بے زبان ہوتی ہے۔[22] ۱۵-۱۸

۱۹؎ یہ اب اُن کے تضاد فکر کو واضح کرنے کے لیے تضمین کی آیتوں کے بعد کلام کو اُسی مضمون سے مربوط کر دیا ہے جو اوپر آیت ۹ میں بیان ہوا ہے۔

۲۰؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور اولاد اپنے والدین کا جز ہی ہوتی ہے۔ یہی غلطی سیدنا مسیح علیہ السلام کے ماننے والوں نے اُن کو خدا کا بیٹا اور وحدت الوجود کے ماننے والوں نے پوری کائنات کو خدا کا جسدی ظہور قرار دے کر کی ہے۔

۲۱؎ یعنی مبارزت اور مفاخرت کے موقعوں پر۔ اہل عرب کی زندگی میں یہ دونوں ہی چیزیں بڑی غیر معمولی اہمیت کی حامل تھیں۔

۲۲؎ عورت پر یہ تبصرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے، بلکہ اُن اہل عرب کی طرف سے

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ﴿١٩﴾
وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ق

(اِن پر افسوس)، اِنھوں نے فرشتوں کو، جو خداے رحمٰن کے بندے ہیں، بیٹیاں بنا دیا! کیا یہ اُن کی پیدایش کے وقت موجود تھے؟ اِن کی یہ گواہی اب لکھ لی جائے گی اور اِنھیں اِس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ ۱۹

کہتے ہیں کہ اگر خداے رحمٰن چاہتا تو ہم اِن کی پرستش نہ کرتے۔[۲۳] اِن کو اِس

ہے جن کے احمقانہ عقائد یہاں زیر بحث ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد بھی تجویز کرتے ہو تو ایسی جس کو اپنے لیے ننگ و عار اور زندگی کے معرکوں میں بالکل بے کار سمجھتے ہو۔ خود غور کرو کہ اِس سے بڑھ کر بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے؟

۲۳؎ یعنی وہ اپنی مشیت کے زور سے اِس کو روک دیتا، لیکن جب اُس نے نہیں روکا اور ہم اور ہمارے باپ دادا صدیوں سے اِن کی عبادت کر رہے ہیں تو یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ خدا اِسے پسند کرتا ہے۔ اِس کے جواب میں فرمایا ہے کہ اِنھیں خدا اور اُس کے سنن کا کوئی علم نہیں ہے، یہ نری اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...خدا کی پسند یا ناپسند کے جاننے کا یہ ذریعہ نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو کسی برائی کے کرنے کی ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر چور، ہر زانی، ہر بدمعاش اپنی چوری اور بدمعاشی کے جواز، بلکہ استحسان کی تائید میں پیش کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ بات خدا کی مرضی کے خلاف ہوتی تو وہ اپنی مشیت کے زور سے اِس کو روک دیتا، لیکن جب اُس نے اِس کو نہیں روکا تو اِس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم نے جو کچھ کیا، اُس کی مرضی سے کیا اور ہمارا یہ فعل اُس کو پسند ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۲۱۷)

اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ﴿٢٠﴾ اَمۡ اٰتَيۡنٰهُمۡ كِتٰبًا مِّنۡ قَبۡلِهٖ فَهُمۡ بِهٖ مُسۡتَمۡسِكُوۡنَ ﴿٢١﴾ بَلۡ قَالُوۡۤا اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِىۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡهَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ ﴿٢٣﴾ قٰلَ اَوَلَوۡ جِئۡتُكُمۡ بِاَهۡدٰى مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ

معاملے کا کوئی علم نہیں ہے، یہ محض تیر تکے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اِس سے پہلے کوئی کتاب اِنھیں دی تھی کہ (اپنی اِس حماقت کے لیے) یہ اُس کی دلیل پکڑے ہوئے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک برتر طریقے پر[۲۴] پایا ہے اور ہم اُنھی کے قدم بہ قدم ٹھیک راستے پر چل رہے ہیں[۲۵]۔ اِسی طرح، (اے پیغمبر)، ہم نے تم سے پہلے جس بستی میں بھی کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہے، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک برتر طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنھی کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ اُن کے خبردار کرنے والے نے کہا: کیا اِس کے باوجود بھی کہ اگر میں اُس سے کہیں سیدھے راستے

۲۴؎ اصل میں لفظ 'اُمَّة' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر یہاں اِس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۲۵؎ یہ ایسی دلیل ہے کہ اِس سے عوام کے جذبات کو بھڑکا کر علم وعقل کے تمام مقدمات اور تحقیق واستدلال کے تمام نتائج بے اثر کیے جاسکتے ہیں۔ اِس وجہ سے ہر دور کے جہلا نے اِسی ہتھیار سے مصلحین اور محققین کی مساعی کو ناکام کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن نے آگے اِس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے۔

عَلَيۡهِ اٰبَآءَكُمۡ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۵﴾
وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖۤ اِنَّنِىۡ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِىۡ فَطَرَنِىۡ فَاِنَّهٗ سَيَهۡدِيۡنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً

کی ہدایت تمھارے پاس لے کر آیا ہوں، جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: تم لوگ جو کچھ بھی دے کر بھیجے گئے ہو، ہم اُس کو ماننے والے نہیں ہیں[۲۶]۔ سو (نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو) ہم نے اُن سے (اُن کی اِس سرکشی کا) انتقام لیا۔ پھر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔ ۲۰-۲۵

یہ (باپ دادا کا حوالہ دیتے ہیں تو) یاد کریں جب (اِن کے ابوالآبا) ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا کہ جنھیں تم پوجتے ہو، میں اُن سے بالکل بری ہوں[۲۷]۔ میں صرف اُسی کو پوجتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ سو کچھ شک نہیں کہ (تم سے براءت کے بعد) اب وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔

۲۶؎ اِس جواب سے واضح ہے کہ مخاطبین اپنے استدلال کی کم زوری دیکھ کر کس طرح جھلا اٹھے ہیں اور کس ڈھٹائی کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ مسئلہ صحیح اور غلط کا نہیں ہے، بلکہ ہم تمھاری کوئی بات سرے سے سننے اور ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

۲۷؎ اصل میں 'بَرَآء' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ مصدر ہے اور مصدر جب صفت کے مفہوم میں استعمال کیا جائے تو اُس کے اندر مبالغہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس میں قریش کے لیے تنبیہ ہے کہ تمھارے جدامجد کی روایت تو یہ ہے کہ اُن کے باپ نے جب شرک پر اصرار کیا تو اُنھوں نے اُس سے بھی بے تعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر تم کن جاہلوں کو اپنا بزرگ قرار دے کر اُن کی تقلید کر رہے ہو؟

فِیۡ عَقِبِہٖ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۲۸﴾
بَلۡ مَتَّعۡتُ ہٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَہُمۡ حَتّٰی جَآءَہُمُ الۡحَقُّ وَ رَسُوۡلٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲۹﴾ وَ لَمَّا جَآءَہُمُ الۡحَقُّ قَالُوۡا ہٰذَا سِحۡرٌ وَّ اِنَّا بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۰﴾

ابراہیم نے یہ بات ایک روایت کی حیثیت سے اپنے بعد والوں میں چھوڑی[۲۸] تاکہ وہ اِسی کی طرف رجوع کریں۔ ۲۶-۲۸

نہیں، (یہ اِس سے ناواقف نہیں تھے)[۲۹]، بلکہ ہوا یہ کہ میں نے اِن کو اور اِن کے باپ دادا کو دنیا سے بہرہ مند کیا، (پھر لمبی مدت گزری اور اِن کے دل سخت ہو گئے)[۳۰]، یہاں تک کہ اِن کے پاس حق[۳۱] آیا اور ایک پیغمبر بھی جو دین سے متعلق ہر چیز کو واضح کر دینے والا ہے۔ یہ حق جب اِن کے پاس آیا تو اِنھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو[۳۲] ہے اور ہم اِس کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں۔ ۲۹-۳۰

۲۸؎ یعنی اِس کو اپنی وصیت اور تعلیم و تذکیر سے ایسا مستحکم کر دیا کہ اُن کے اخلاف میں یہ ایک پایدار روایت بن گئی جسے اُن کے صالحین نسلاً بعد نسلٍ اِسی طرح مستحکم کرتے رہے۔

۲۹؎ یعنی ابتدا میں، جب اِن کے اسلاف نے اِس سرزمین میں توحید کا مرکز قائم کیا اور یہ اُس کے متولی بنائے گئے۔

۳۰؎ یہ اِن کے انکار کی اصل وجہ بتائی ہے کہ خدا نے جو رفاہیت ایک مدت سے اِنھیں عطا کر رکھی ہے، اُس نے اِن کے دلوں میں ایسی سختی پیدا کر دی ہے کہ اپنے مزعومات و مفادات کے خلاف یہ کسی بڑے سے بڑے حق کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۳۱؎ یعنی قرآن مجید۔

۳۲؎ یعنی زبان و بیان کی جادوگری ہے، اِس سے زیادہ کوئی اہمیت اِسے دینے کی ضرورت نہیں ہے اور محض اِس بنا پر کہ اِس کی بلاغت و جزالت دل و دماغ کو اپنی گرفت میں

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٣٢﴾

کہتے ہیں کہ یہ قرآن (مکہ اور طائف)[۳۳] دونوں شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ کیا تیرے پروردگار کی رحمت یہی تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اِن کی معیشت کا سامان تو اِن کے درمیان ہم نے تقسیم کیا ہے[۳۴] اور اِس طرح تقسیم کیا ہے کہ ایک کے درجے دوسرے پر بلند رکھے ہیں تاکہ یہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں[۳۵] اور تیرے پروردگار کی رحمت[۳۶] اُس سے بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ ۳۱-۳۲

لے لیتی ہے، اِسے آسمانی کلام نہیں سمجھ لینا چاہیے۔

۳۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی دو بستیاں عرب کے سادات و اشراف کا مرکز تھیں۔

۳۴۔ یہ اُس رعونت کا جواب ہے جو مخاطبین کے اعتراض سے ظاہر ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ جب اِن کے وسائل معیشت اِن کی خواہش کے مطابق تقسیم نہیں کیے گئے، بلکہ خدا ہی نے اپنی صواب دید اور حکمت کے مطابق جس کو چاہا، زیادہ دیا اور جس کو چاہا، کم دیا ہے تو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کسی فرد کا انتخاب کرتے وقت وہ اِن کے مشورے کا پابند کیوں ہوگا؟

۳۵۔ اللہ تعالیٰ نے ذہنی اور مادی، دونوں ہی اعتبارات سے انسانوں کے درمیان درجات و مراتب کا فرق کیوں رکھا ہے؟ یہ اُس کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے آزمایش کے لیے بنائی ہے، اِس وجہ سے اِس کا نظام اُس نے اِس طرح کا رکھا ہے کہ اِس میں ہر شخص دوسروں کا محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دوسروں کا محتاج ہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اِس میں محتاج الیہ ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی دوسروں سے مستغنی نہیں اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ معاشرے میں کسی نہ کسی پہلو سے اُس کی افادیت نہ ہو۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ خالق کائنات نے ہر شخص کو ایک ہی درجے کی صلاحیت، ایک ہی طرح کے ذوق، ایک ہی مرتبے کی ذہانت اور ایک ہی حیثیت کے وسائل و ذرائع کے ساتھ نہیں پیدا کیا، بلکہ اِن اعتبارات سے لوگوں کے درمیان بڑا تفاوت رکھا ہے۔ یہ تفاوت معاشرے کی تشکیل اِس طرح کرتا ہے کہ اِس میں ایک طرف تبحر عالم، نام ور مصنف، یکتاے روزگار محقق، شہرۂ آفاق مدبر اور طاقت ور حکمران بھی پیدا ہوتے ہیں، دوسری طرف کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، گٹھڑیاں ڈھونے والے قلی، حاضر خدمت رہنے والے خادم، گلیاں اور نالیاں صاف کرنے والے مہتر بھی اِس میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سارے طبقات معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری، بلکہ ناگزیر ہیں۔ اِن سب کی خدمت کی نوعیت الگ الگ ہے، مگر اِن میں سے کوئی عنصر بھی نہ حقیر ہے اور نہ اِن میں سے کسی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ معاشرے کی مشین جاری رکھنے کے لیے اِس مشین کے چھوٹے سے چھوٹے پرزے کی دیکھ بھال بھی اُس کی افادیت کی نسبت سے ضروری ہے۔''

(تدبر قرآن ۷/۲۲۶)

اِس میں اُن زعما اور مصلحین کے لیے بھی بڑی تنبیہ ہے جو بعض اوقات اِس خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ دنیا سے طبقات کے وجود کو مٹا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ دنیا کے لیے یہ اُس کا بنایا ہوا قانون ہے اور جو لوگ اِس کائنات میں کارفرما خدا کے قوانین کو بدلنے کی کوشش کریں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اُن کا انجام صرف تباہی ہے۔

۳۶؎ یعنی قرآن اور ہدایت، اگر یہ اِن کی قدر پہچانیں تو یہ اُس مال و دولت سے کہیں بڑی نعمت ہیں جس کو یہ دن رات سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ يَّكۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُيُوۡتِهِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيۡهَا يَظۡهَرُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوۡتِهِمۡ اَبۡوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيۡهَا يَتَّكِـُٔوۡنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخۡرُفًا ؕ وَاِنۡ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَالۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ رَبِّكَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۳۵﴾

(یہ اِس پر مغرور نہ ہوں)۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے (اور کوئی ایمان پر نہیں رہے گا) تو جو لوگ خداے رحمٰن کے منکر ہو رہے ہیں، اُن کے گھروں کی چھتیں ہم چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھتے اور اُن کے گھروں کے دروازے اور اُن کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے[۳۷]، بلکہ (چاندی ہی نہیں)، سونے کے بھی[۳۸]۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب چیزیں تو محض دنیا کی زندگی کا سامان ہیں[۳۹] اور آخرت، (اے پیغمبر)، تیرے پروردگار کے ہاں صرف اُن کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ ۳۳-۳۵

۳۷؎ یعنی جو منکر ہو جاتا، اُس پر اِس طریقے سے ہن برسنے لگتا تو لوگوں کی آزمایش بہت سخت ہو جاتی اور اُن میں سے بہت تھوڑے نکلتے جو یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ایمان پر قائم رہتے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ تاہم جتنا کچھ دیا ہے، اُس پر بھی اِن کا حال یہ ہے کہ اِس خبط میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ جب اِس دنیا میں یہ سب کچھ ہم کو دیا گیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا پیغمبری کے لیے ہمارے سوا کسی اور کا انتخاب کرے!

۳۸؎ اصل میں لفظ 'زُخۡرُفًا' آیا ہے۔ یہ 'مِنۡ فِضَّةٍ' کے محل پر عطف ہے، لہٰذا اِسی بنا پر منصوب ہے۔

۳۹؎ آیت میں 'لَمَّا' درحقیقت 'ل' ہے جو 'اِنۡ' مخففہ اور 'اِنۡ' نافیہ کے درمیان فرق کے لیے آتا ہے۔ یہ اشباع کے اصول پر محض آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے 'ل' سے 'لَمَّا' ہو گیا ہے۔ حروف میں اِس طرح کے اضافے کی متعدد مثالیں عربی زبان میں موجود ہیں۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ

(اِن پر افسوس، یہ رحمٰن سے غافل ہیں) اور جو رحمٰن کی یاد سے منہ موڑ لے، اُس پر ہم ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، پھر وہ اُس کا رفیق بن جاتا ہے[۴۰]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ ایسے لوگوں کو یہ شیاطین اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ ٹھیک جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اِس طرح کا ہر شخص جب ہمارے پاس آئے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا کہ کاش، میرے اور تمھارے درمیان

۴۰؎ یہ خدا کی یاد سے اعراض کی سزا ہے جس کو ہر شخص، اگر وہ اپنا احتساب کرے تو خود محسوس کر لیتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...انسان کے دل کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک خدا کی یاد سے آباد رہتا ہے، اُس وقت تک تو شیطان کو اُس میں راہ نہیں ملتی، لیکن جب انسان خدا سے غافل ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ شیطان اُس کے دل پر قبضہ جما لیتا ہے اور جب وہ قبضہ جما لیتا ہے تو پھر اُس کے چنگل سے نکلنا آسان نہیں رہ جاتا۔ بہتر سے بہتر تذکیر و موعظت بھی جو اُس کے سامنے آتی ہے، شیطان اُس کے خلاف شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اُس کو اُس سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے دل اپنے رب کی یاد سے آباد رکھتے ہیں، شیطان کو اُن کے اندر گھسنے کی راہ نہیں ملتی اور اگر کبھی کسی غفلت کے سبب سے اُس کو دراندازی کا کوئی موقع مل بھی جائے تو اُس کو وہاں ٹکنے کی جگہ نہیں ملتی، بلکہ بندے کے متنبہ ہوتے ہی شیطان کو وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۲۲۹)

اَنَّكُمۡ فِی الۡعَذَابِ مُشۡتَرِكُوۡنَ ﴿۳۹﴾
اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ اَوۡ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَمَنۡ كَانَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذۡهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنۡهُمۡ مُّنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۴۱﴾ اَوۡ نُرِیَنَّكَ الَّذِیۡ وَعَدۡنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَیۡهِمۡ مُّقۡتَدِرُوۡنَ ﴿۴۲﴾ فَاسۡتَمۡسِكۡ بِالَّذِیۡۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۴۳﴾

مشرق کے دونوں کناروں کی دوری ہوتی[41]! سو کیا ہی برا رفیق ہوگا! کہا جائے گا: (لوگو)، جب تم نے (دنیا میں) اپنی جان پر ظلم ڈھائے ہیں تو آج یہ بات تمھارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ اب تم لوگ[42] عذاب میں ایک دوسرے کے شریک ہو۔ ۳۶-۳۹

(یہ اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں، اے پیغمبر)۔ پھر کیا تم بہروں کو سناؤ گے یا اندھوں کو راہ دکھاؤ گے اور اُن کو جو کھلی گم راہی میں پڑے ہیں[43]؟ اب اگر ہم تمھیں اٹھا بھی لیں تو یہ چھوٹ نہیں جائیں گے، اِس لیے کہ ہم نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہم اِن سے لازماً بدلہ لیں گے، یا جس عذاب کا وعدہ ہم نے اِن سے کیا ہے، وہ (تمھارے اِس دنیا میں ہوتے ہوئے) تم کو لا دکھائیں تو اِس میں بھی کچھ مشکل نہیں، اِس لیے کہ ہم اِن پر پوری

۴۱؎ اصل میں 'بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربی زبان میں مثنیٰ بعض اوقات کسی چیز کے دونوں کناروں کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اِسی مفہوم میں ہے۔

۴۲؎ یعنی تم اور تمھارے شیاطین۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ جب دونوں عذاب میں شریک ہیں تو لڑنے جھگڑنے سے کیا حاصل!

۴۳؎ یعنی ایسی گم راہی میں، جس کا گم راہی ہونا خود اُن پر بھی واضح ہے۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ اُنھیں ہدایت دینا کسی کے امکان میں نہیں ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّىْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا

الزخرف ۴۳

قدرت رکھتے ہیں۔ سو (اِنھیں چھوڑو اور) اُس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھو جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے۔ یقیناً تم ایک سیدھی راہ پر ہو[۴۴]۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تمھارے اور تمھاری قوم کے لیے ایک یاددہانی ہے اور آگے تم سب کو اِس کی جواب دہی کرنی ہے[۴۵]۔ تم سے پہلے ہم نے اپنے جو رسول بھی بھیجے ہیں، اُن سے پوچھ دیکھو[۴۶]، کیا ہم نے خداے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی ٹھیرائے ہیں کہ اُن کی پرستش کی جائے؟ ۴۰-۴۵

ہم نے موسیٰ کو بھی اِسی طرح اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُس کے اعیان کی طرف بھیجا تھا تو اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میں پروردگار عالم کا رسول ہوں[۴۷]۔

۴۴؎ اِس سے توحید کی راہ مراد ہے جس کی دعوت اِس سورہ میں دی جا رہی ہے۔

۴۵؎ یعنی پیغمبروں کو بھی جواب دہی کرنی ہے کہ کیا اُنھوں نے اِس وحی کو ٹھیک ٹھیک لوگوں تک پہنچا دیا اور لوگوں کو بھی کہ خدا کی یہ عظیم نعمت جب اُنھیں دی گئی تو اُنھوں نے اُس کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اِس میں، ظاہر ہے کہ رسول اور اُس کے ساتھیوں کے لیے تسلی اور اُن کے مخالفین کے لیے سخت تہدید ہے۔

۴۶؎ یعنی اُن کے صحیفوں اور اُن کی تعلیمات کے جاننے والوں سے۔ یہ ایک بلیغ اسلوب کلام ہے اور پچھلے صحیفوں میں اکثر استعمال ہوا ہے۔

۴۷؎ چنانچہ رسول کی حیثیت سے موسیٰ علیہ السلام نے اُنھیں انذار بھی کیا اور اُن سے یہ

يَضۡحَكُوۡنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرِيۡهِمۡ مِّنۡ اٰيَةٍ اِلَّا هِىَ اَكۡبَرُ مِنۡ اُخۡتِهَا ۫ وَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡعَذَابِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۴۸﴾
وَقَالُوۡا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الۡعَذَابَ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ ﴿۵۰﴾

پھر جب وہ ہماری نشانیوں کے ساتھ اُن کے پاس آیا تو وہ اُن کی ہنسی اڑانے لگے۔ اور ہم ایک پر ایک جو نشانی بھی اُنھیں دکھاتے تھے، وہ دوسری سے بڑھ کر ہی ہوتی تھی اور ہم نے اُن کو عذاب میں بھی پکڑا[۴۸]، اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔ ۴۶-۴۸

ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے تھے کہ اے ساحر، اپنے پروردگار سے اُس عہد کی بنا پر جو اُس نے تم سے کر رکھا ہے[۴۹]، ہمارے لیے دعا کرو۔ اب ہم ضرور راہ پر آجائیں گے۔ پھر جب وہ عذاب ہم اُن سے ٹال دیتے تو اُسی وقت وہ عہد توڑ دیتے تھے[۵۰]۔ ۴۹-۵۰

مطالبہ بھی کہ وہ بنی اسرائیل کو اُن کے ساتھ جانے دیں۔ یہ مطالبہ اِس لیے کیا گیا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اب وہ خدا کی جماعت بن کر پورے عالم کے لیے ارض فلسطین میں توحید کا مرکز قائم کریں گے۔ تاہم موسیٰ علیہ السلام نے اِس کی وضاحت نہیں کی، بلکہ صرف اتنی بات کہی کہ ہمیں عبادت کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں جانے دیا جائے۔

۴۸؎ یعنی تنبیہی عذاب میں، جو فیصلہ کن عذاب سے پہلے اُس کی نشانی کے طور پر آتا ہے۔ اِس طرح کے جو عذاب قوم فرعون پر آئے، اُن کی تفصیل سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔

۴۹؎ یعنی یہ عہد کہ وہ تمھاری دعائیں ہر حال میں قبول فرمائے گا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہ اگرچہ خدا کا پیغمبر نہیں مانتے تھے، لیکن ایک مستجاب الدعوات اور خدا رسیدہ ماہر علم وفن ضرور سمجھتے تھے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اُس وقت کے معاشروں میں ساحروں کو وہی مقام حاصل تھا جو کسی بھی علم وفن کے ماہرین کو کسی معاشرے میں حاصل ہوتا ہے۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ۬ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا

البیان

الزخرف ۴۳

(اِس سے جب لوگوں میں بے چینی پیدا ہونے لگی تو) فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی، اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور یہ نہریں بھی کہ میرے نیچے بہ رہی ہیں؟ پھر کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ بہتر ہے یا میں اِس شخص سے بہتر ہوں جو ایک بے وقعت آدمی ہے[۵۱] اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا۔[۵۲] (اگر یہ پیغمبر ہے) تو ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اِس کے لیے اوپر سے سونے کے کنگن اترے ہوتے یا اِس کے ساتھ پرے باندھے ہوئے فرشتے آتے؟ سو اُس نے اپنی قوم کی عقل کھو دی اور وہ اُس کے کہے میں آ گئے۔ بے شک، وہ نافرمان لوگ تھے۔[۵۳] چنانچہ (اپنی نافرمانیوں سے) جب اُنھوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا

---

۵۰ 'لَمَّا' اِس آیت میں 'کُلَّمَا' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اِس کے بعد 'اِذَا' کا استعمال جو مفاجات کے لیے آتا ہے، بالکل موزوں ہے۔

۵۱ فرعون نے یہ بات اِس لیے کہی کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو اُس نے غلام بنا رکھا تھا اور غلاموں کو اُن کے آقا حقیر و ذلیل ہی سمجھتے تھے۔

۵۲ یعنی کوئی زبان آور خطیب بھی نہیں ہے کہ اِس کے بارے میں یہ خیال کیا جائے کہ غالباً اِسی بنا پر خدا نے اِسے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ

تو ہم نے اُن سے انتقام لیا اور اُن سب کو غرق کر دیا[۵۴] اور اُن کو ایک قصۂ ماضی اور بعد والوں کے لیے نمونۂ عبرت بنا دیا۔ ۵۱-۵۶

اور جب (اِنھی حقائق کی یاددہانی کے لیے) ابن مریم کی مثال دی جاتی ہے تو تمھاری قوم کے لوگ اُس پر چیخنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اُس کے پیرو بھی تو اُسے اپنا معبود سمجھتے ہیں، پھر) ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ[۵۵]؟ وہ تمھارے سامنے یہ بات

۵۳؎ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بالکل بے وزن ہو کر رہ گئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس طرح کے لوگ بڑی آسانی سے شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور شیاطین اِن کی ناکوں میں نکیل ڈال کر جدھر چاہتے ہیں، لیے پھرتے ہیں۔ انسان کے اندر وزن اللہ تعالیٰ کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ پاسنگ اُس کے پلڑے میں نہ ہو تو اُس کی حیثیت خس و خاشاک کی ہے۔ ہوا کا معمولی جھونکا بھی اُس کو اڑا لے جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/۲۳۸)

۵۴؎ یعنی فرعون کو بھی غرق کر دیا اور اُس کے تمام اعیان و اکابر کو بھی جو اُس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے کے لیے نکلے تھے۔

۵۵؎ یعنی اگر کسی معبود ہی کی مثال دینی ہے تو پھر ہمارے معبودوں میں کیا خرابی ہے، جن کی یہ صبح و شام ہجو کرتے ہیں؟ اِس کے معنی تو یہ ہیں کہ یہ کوئی سازش ہے جو ہمارے معبودوں کے خلاف کی جا رہی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے آبائی دیوتاؤں کی عقیدت ہمارے ذہنوں سے ختم کر کے اُن کی جگہ دوسری قوموں کے ایک معبود کو ہمارا معبود بنا دیا جائے۔

خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ

محض کج بحثی کے لیے اٹھاتے ہیں، بلکہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ[۵۶]۔ وہ ایک بندہ ہی تھا جس پر ہم نے اپنا فضل فرمایا[۵۷] اور بنی اسرائیل کے لیے اُس کو (اپنی قدرت کی) ایک مثال بنایا اور (تمھیں کیا خبر کہ ہماری قدرت کس قدر بے پایاں ہے)؟ اگر ہم چاہتے تو تمھارے اندر سے فرشتے پیدا کر دیتے جو زمین میں تمھاری جگہ آجاتے[۵۸]۔ ۵۷-۶۰

(اِن سے کہو، اے پیغمبر کہ) یقیناً وہ قیامت کی ایک بڑی دلیل ہے[۵۹] تو اُس کے

الزخرف
۴۳

۵۶ مطلب یہ ہے کہ فتنہ پردازی اِن کے مزاج کی خصوصیت بن چکی ہے، اِس لیے محض کج بحثی کے لیے اِس طرح کی باتیں اٹھاتے ہیں کہ خام ذہن کے لوگ اِسے قومی تفاخر کا مسئلہ خیال کر کے بھڑک اُٹھیں، ورنہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مسیح علیہ السلام کا ذکر کسی معبود کی حیثیت سے نہیں کرتا، بلکہ اُن کے بارے میں مسیحیوں کے عقیدے کی پوری صراحت کے ساتھ تردید کرتا ہے۔

۵۷ یہ اُن خصوصیات کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ ہوا ہے، یعنی بن باپ کے پیدا ہونا، گھوارے ہی میں اپنی نبوت کی گواہی دینا اور خدا کے اذن اور روح القدس کی تائید سے حیرت انگیز معجزے دکھانا وغیرہ۔

۵۸ مطلب یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کا بے باپ پیدا ہونا اور فرشتوں جیسی عظیم مخلوق کا وجود میں آنا خدا کی قدرت کا محض ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اِس سے یہ استدلال کہ یہ خدا کی خدائی میں شریک ہو گئے ہیں، نری سفاہت ہے۔ لہٰذا عبادت کا مستحق وہی ہے جو مسیح کا بھی خالق ہے اور فرشتوں کا بھی، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾
وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ
لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾

برپا ہونے میں شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے اور شیطان تم کو (اِس راہ سے) روکنے نہ پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۶۱-۶۲

اور (یاد رکھو کہ) جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تھا تو اُس نے یہ دعوت دی تھی کہ (لوگو)، میں تمھارے پاس حکمت[۶۰] لے کر آ گیا ہوں، اِس لیے کہ تم کو دین کی حقیقت سمجھا دوں اور اِس لیے کہ میں تم پر بعض اُن باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ سو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اِس میں کچھ

۵۹ مسیح علیہ السلام بے باپ پیدا ہوئے اور اُن کو یہ حیرت انگیز معجزہ دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے اور مٹی سے پرندے کی مورت بنا کر اُس میں روح پھونک دیتے تھے۔ پھر وہی ہیں کہ جن کے ذریعے سے یہود کے لیے قیامت کے دن تک خدائی دینونت کا ظہور ہوا ہے۔ قرآن نے یہ اِسی بنا پر اُنھیں قیامت کی ایک بڑی دلیل قرار دیا ہے۔

۶۰ یعنی ایمان و اخلاق کے حقائق کا بیان جس سے تم فقہی موشگافیوں میں الجھ کر محروم ہو چکے ہو۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"یہ امر یہاں واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نئی شریعت کے داعی نہیں تھے، بلکہ وہ تورات ہی کے مصدق تھے، البتہ اُنھوں نے حکمت، یعنی روح دین اور مغز دین سے بنی اسرائیل کو آشنا کرنا چاہا، لیکن اُنھوں نے اِس کی کوئی قدر نہیں کی، بلکہ اپنی اُسی ظاہر پرستی میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل دین تو اُن کے اندر سے غائب ہو گیا، البتہ کچھ رسوم رہ گئے جن کو ادا کر کے وہ مطمئن ہو جاتے کہ اللہ اور اُس کے دین کے تمام حقوق سے وہ سبک دوش ہو گئے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۲۴۵)

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦٤﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٦٥﴾

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٦﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ ؕ

شک نہیں کہ اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور وہی تمھارا بھی پروردگار ہے[٦١] تو اُسی کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ مگر (اتنی واضح ہدایت کے باوجود) اُس کے پیرووں کے اندر سے بہت سے گروہوں نے فرقے پیدا کر لیے۔ سو تباہی ہے اُن کے لیے ایک دردناک دن کے عذاب کی جنھوں نے (خدا کے شریک ٹھیرا کر) اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔۶۳-۶۵

(اِنھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو، اے پیغمبر)۔ یہ تو قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ یکایک اِن پر آجائے اور اِن کو خبر بھی نہ ہو۔ (اِنھیں بتاؤ کہ اپنے شریکوں کے بھروسے پر نہ رہیں)، اُس دن خدا سے ڈرنے والوں کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے[٦٢]۔ ٦٦-٦٧

٦١۔ انجیل میں اللہ تعالیٰ کے لیے 'میرا باپ' اور 'تمھارا باپ' کی جو تعبیر جگہ جگہ آئی ہے، یہ قرآن نے اُس کی تصحیح کر دی ہے کہ سیدنا مسیح نے جو بات فرمائی تھی، وہ درحقیقت یہ تھی۔ لیکن عبرانی زبان میں 'أب' اور 'إبن' کے الفاظ چونکہ باپ اور بیٹے اور رب اور بندے کے معنی میں مشترک تھے، اِس لیے نصاریٰ نے سیدنا مسیح کی الوہیت کا عقیدہ ایجاد کیا تو اِس اشتراک سے فائدہ اٹھا کر اُنھیں یہ صورت دے دی۔

٦٢۔ یہ دشمنی کس طرح ظاہر ہو گی؟ پیچھے آیات ۳۶-۳۹ میں قرآن نے اِسے نہایت عمدہ

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾

میرے بندو، آج نہ تمھیں کوئی اندیشہ ہے اور نہ تم آزردہ خاطر ہو گے[٦٣] ــــ یہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور فرماں بردار رہے[٦٤]۔ تم اور تمھارے ہم مشرب[٦٥]، سب جنت میں داخل ہو جاؤ، تمھیں خوش کر دیا جائے گا۔ اُن کے آگے سونے کی رکابیاں اور سونے کے پیالے گردش میں ہوں گے اور اُس میں وہ سب چیزیں ہوں گی جو دل کو بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی ہوں[٦٦] گی اور (اُن کو مژدہ سنایا جائے

اسلوب سے بیان کر دیا ہے۔

٦٣؎ یہ جنت کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ یعنی وہ ایسی جگہ ہے جہاں نہ ماضی کے پچھتاوے ہوں گے اور نہ مستقبل کے اندیشے۔ دنیا کی زندگی اِنھی پچھتاووں اور اِنھی اندیشوں سے عبارت ہے اور وہاں اِن دونوں سے نجات ہو جائے گی۔

٦٤؎ یہ قرآن نے کلام کو بالکل مطابق حال کر دیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اِس طرح خطاب فرمائے گا۔

٦٥؎ اصل میں لفظ 'اَزْوَاج' استعمال ہوا ہے۔ یہ بیویوں کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، لیکن اوپر جس دوستی اور دشمنی کا ذکر ہوا ہے، اُس کا تقابل ملحوظ رہے تو وہی معنی مرجح ہوں گے جو ہم نے ترجمے میں اختیار کیے ہیں۔

٦٦؎ یعنی دل پسند بھی اور باصرہ نواز بھی۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٣﴾

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿٧٤﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٦﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿٧٧﴾

گا کہ) تم اِس میں ہمیشہ رہو گے۔[۶۷] یہ وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ہو۔[۶۸] اور تمھارے لیے اُس میں کثرت سے میوے ہوں گے جن میں سے تم کھاؤ گے۔[۶۹] ۶۸-۷۳

یہ مجرمین، البتہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں رہیں گے۔ وہ اِن سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور یہ اُس میں مایوس پڑے رہیں گے۔[۷۰] اِن پر ہم نے ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ اور یہ (جہنم کے داروغے کو) پکاریں گے کہ

۶۷۔ اوپر کی بات غائب کے اسلوب میں تھی۔ یہ اب التفات خاص کے اظہار کے لیے حاضر کا اسلوب اختیار فرمایا اور بشارت دی ہے کہ یہ کوئی وقتی اور عارضی چیز نہیں ہوگی، تم اِس میں ہمیشہ رہو گے اور اِس کی نعمتوں سے تمھیں کبھی محروم نہیں کیا جائے گا۔

۶۸۔ یہ انسانی فطرت کے اِس پہلو کا لحاظ فرمایا ہے کہ انسان کو سچی خوشی اُسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب کوئی چیز اُس کی محنتوں کا ثمرہ اور اُس کا حق سمجھ کر اُسے دی جائے۔

۶۹۔ یعنی اتنی مقدار میں اور ایسی بے شمار قسموں کے کہ جس سے چاہو گے اور جس قدر چاہو گے، لطف اٹھاؤ گے۔

۷۰۔ یعنی ایسے ناامید اور دل شکستہ ہو کر پڑے رہیں گے کہ کوئی موہوم امید بھی سہارا نہ بنے گی کہ شاید کبھی اِس عذاب سے رہائی حاصل ہو جائے۔

لَقَدۡ جِئۡنٰکُمۡ بِالۡحَقِّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَکُمۡ لِلۡحَقِّ کٰرِہُوۡنَ ﴿۷۸﴾ اَمۡ اَبۡرَمُوۡۤا اَمۡرًا فَاِنَّا مُبۡرِمُوۡنَ ﴿۷۹﴾ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّہُمۡ وَ نَجۡوٰىہُمۡ ؕ بَلٰی وَ رُسُلُنَا لَدَیۡہِمۡ یَکۡتُبُوۡنَ ﴿۸۰﴾

اے مالک[1]، کوئی ایسی صورت ہو کہ تیرا پروردگار ہمارا کام ہی تمام کر دے۔ وہ جواب دے گا کہ (ہرگز نہیں)، اب تم کو اِسی حال میں رہنا ہے[2]۔ ۷۴-۷۷

(قریش کے لوگو)، ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے ہیں، لیکن تم میں اکثر کا حال یہ ہے کہ حق سے بے زار ہیں۔ کیا اِنھوں نے کوئی بات ٹھان لی ہے[3] تو یقیناً ہم بھی ٹھان لیں گے[4]۔ کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ (پیغمبر کے خلاف) ہم اِن کے رازوں اور اِن کی سرگوشیوں کو سن نہیں رہے ہیں[5]؟ کیوں نہیں، اور ہمارے فرستادے اِن کے پاس لکھ بھی رہے ہیں۔ ۷۸-۸۰

۱ے یہ جہنم کے داروغے کا لقب ہے۔

۲ے اِس طرح کی صورت حال میں آخری سہارا موت ہی ہوتا ہے، لیکن یہ اُس سے بھی محروم کر دیے جائیں گے۔

۳ے یعنی فیصلہ کر لیا ہے کہ رسول کو نہیں مانیں گے، بلکہ اُس کے خلاف کوئی بڑا اقدام بھی کر گزریں گے۔ اِس جملے میں اچانک حاضر سے غائب کا اسلوب دھمکی میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہے، گویا وہ خطاب والتفات کے لائق نہیں رہے۔

۴ے یعنی ہم بھی فیصلہ کر لیں گے کہ اب اِن پر وہ سنت پوری کر دی جائے جو رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر ہے۔ اِس سنت الٰہی کی وضاحت ہم پیچھے جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ رسول کی قوم جب اُس کے خلاف آخری اقدام کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اُس کی مہلت بھی اُس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اُس قوم کو ہلاک کر دیتا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿٨١﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٨٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اگر خداے رحمٰن کی کوئی اولاد ہو تو سب سے پہلا اُس کی عبادت کرنے والا میں ہوں گا۔[۶] زمین اور آسمانوں کا پروردگار، عرش بریں کا مالک اُن سب باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ سو اِن کو چھوڑو، یہ بوالفضولی اور ہنسی مسخری کر لیں، یہاں تک کہ اپنے اُس دن سے دوچار ہو جائیں جس کی اِنھیں وعید سنائی جا رہی ہے۔ ۸۱-۸۳

وہی اکیلا آسمان میں بھی اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے اور وہی حکیم و علیم ہے۔[۷] بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے اختیار میں زمین اور آسمانوں اور اُن کے

۵ے اللہ تعالیٰ یوں تو لوگوں کے ہر راز اور ہر سرگوشی کو جانتا ہے، لیکن یہاں کلام کا سیاق و سباق دلیل ہے کہ اشارہ غالباً اُن سرگوشیوں کی طرف ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں قریش کے لیڈر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا اخراج سے متعلق دارالندوہ میں کر رہے تھے۔ اِس کی تفصیلات روایتوں میں بیان ہوئی ہیں۔

۶ے یہ آخر میں فرشتوں کی الوہیت کے ابطال میں ایک فیصلہ کن بات فرما دی ہے۔ چنانچہ سورہ اثبات توحید کے اُسی مضمون پر ختم ہو رہی ہے جس سے شروع ہوئی تھی اور جو اُس کا مرکزی مضمون ہے۔

۷ے مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان، دونوں ایک ہی حکیم و علیم کی مشیت کے تحت کام کر

وَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾ وَلَا يَمۡلِكُ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾ وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۸۷﴾ وَقِيۡلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ فَاصۡفَحۡ عَنۡهُمۡ وَقُلۡ سَلٰمٌ ؕ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

درمیان ہر چیز کی بادشاہی ہے۔[۷۸] اُسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اُس کے علاوہ یہ جنھیں پکارتے ہیں، وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ ہاں، جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ اُس کو جانتے بھی ہوں گے[۷۹]۔—— اگر تم اِن سے پوچھو کہ اِنھیں کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں بھٹک جاتے ہیں؟ اور وہ اپنی اِس بات سے گواہی دیں گے[۸۰] کہ اے رب، یہ لوگ ہیں کہ ایمان لانے والے نہ ہوئے۔ سو اِن کو نظر انداز کرو اور کہہ دو کہ میرا

رہے ہیں جو نہ دنیا کو اُس کے کسی واقعی انجام تک پہنچائے بغیر چھوڑے گا اور نہ اُس انجام کے موقع پر کسی کو اُس کے علم میں اضافے کی ضرورت ہوگی کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور نیکوکاروں کو اُن کا صلہ دینے کے لیے وہ اُن کی مدد کا محتاج ہو جائے۔

۷۸؎ لہٰذا ہر عاقل کو اُسی سے ڈرنا چاہیے اور اُسی سے امیدیں رکھنی چاہییں۔

۷۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ'۔ اِن میں استثنا ہمارے نزدیک منقطع ہے۔ چنانچہ ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ آیت میں جس گواہی کا ذکر ہے، وہ قرآن میں انبیا علیہم السلام کے حوالے سے بھی بیان ہوئی ہے اور فرشتوں کے حوالے سے بھی۔

۸۰؎ اصل میں 'وَقِيۡلِهٖ' کا لفظ ہے۔ اِس کا عطف ہمارے نزدیک اوپر والی آیت میں 'بِالۡحَقِّ' پر ہے۔ یعنی وہ صرف حق بات کہیں گے اور وہ بات یہ ہوگی جو آگے بیان ہوئی ہے۔

سورة الدخان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ۚ ﴿۱﴾ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا

سلام ہے۔[۸۱] پھر یہ عنقریب جان لیں گے۔[۸۲] ۸۴-۸۹

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ' ہے۔[۸۳] یہ واضح کتاب (آپ ہی اپنی) گواہی ہے۔[۸۴] اِس میں کچھ شک نہیں کہ ہم نے اِسے ایک خیر و برکت والی رات[۸۵] میں اتارا ہے،[۸۶] اِس لیے کہ ہم

۸۱؎ 'سَلٰم' یہاں 'وداع' کے مفہوم میں ہے، یعنی بات ختم ہو گئی، اب مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

۸۲؎ یعنی اپنا انجام جس کے لیے یہ جلدی مچائے ہوئے ہیں۔

۸۳؎ پہلی سورتوں کی طرح اِس سورہ کا نام بھی 'حٰمٓ' ہے۔ یہ اشتراک مطالب پر دلیل ہے اور قرآن کا ہر طالب علم اِسے تمام حوامیم میں بالکل نمایاں دیکھ سکتا ہے۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

۸۴؎ اصل میں 'وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'وَ' قسم کے لیے ہے۔ اِس قسم کا مقسم علیہ محذوف ہے اور لفظ 'مُبِیۡن' اِس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ واضح کتاب اپنے دعووں کی صداقت پر خود حجت قاطع ہے۔ اُن کے دلائل ڈھونڈنے کے لیے اِس سے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے، اُنھیں مبرہن کرنے کے لیے یہ خود کافی ہے۔

۸۵؎ یعنی لیلۃ القدر۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱۸۵ میں قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ اُس کا نزول رمضان کے مہینے میں ہوا، لہٰذا یہ رمضان ہی کی کوئی رات تھی۔ آگے وضاحت

كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ③ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ④ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ

لوگوں کو خبردار کرنے والے تھے۔[87] اِس رات میں تمام حکمت والے معاملات خاص

ہے کہ یہ فیصلوں کی رات ہے۔ یہ فیصلے رحمت و نقمت، دونوں قسم کے امور سے متعلق ہو سکتے ہیں، لیکن چونکہ اُس ذات کی طرف سے ہوتے ہیں جس کا ہر فیصلہ رحمت و حکمت پر مبنی اور سراسر عدالت ہے، اِس وجہ سے باعتبار نتیجہ یہ مبارک ہی ہوتے ہیں۔ اِس کو خیر و برکت والی رات اِسی بنا پر کہا گیا ہے۔ اِس میں مخاطبین کے لیے یہ تنبیہ ہے کہ وہ اِسے کہانت یا نجوم یا شاعری کی قسم کی کوئی چیز سمجھ کر اپنے آپ کو اِس کی برکتوں سے محروم نہ کریں۔ یہ اُن کے لیے خدا کی عظیم رحمت ہے۔ جس کی قدر اگر اُنھوں نے نہیں پہچانی تو اِس کے نتائج اُن کے لیے نہایت ہول ناک ہوں گے۔

۸۶ اِس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ پورا قرآن ایک ہی رات میں نازل ہوا ہو، بلکہ اِس کے نزول کا فیصلہ اگر اِس رات میں کر دیا گیا اور پہلی وحی نازل ہوگئی تو 'اَنْزَلْنٰهُ' کا جو لفظ اصل میں آیا ہے، وہ اِس صورت حال کی تعبیر کے لیے بالکل موزوں ہوگا۔

۸۷ خدا خود لوگوں کو خبردار کرنے کا فیصلہ کرے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ چنانچہ اِس کے لیے وہ مبارک رات منتخب کی گئی جس کے بارے میں آگے فرمایا ہے کہ اُس میں مہمات امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ اِس سے یہ بات بھی ضمناً معلوم ہوئی کہ جس طرح مادی عالم میں خاص چیزوں کے لیے موسم اور مہینے مقرر ہیں، اِسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے دن اور مہینے مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِن کے ساتھ متعلق کر دیا جائے تو اُس کی تمام برکتیں اُسی دن اور مہینے کی پابندی سے حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر اِس رات کی جستجو میں رہے یا لوگوں کو اِس کی ترغیب دی تو اِس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ پروردگار کی طرف سے یہ جان لینے کے بعد کہ یہ بڑی رحمت و برکت کی رات ہے، ایک بندۂ مومن کا ردعمل یہی ہو سکتا تھا۔ مسلمان آپ ہی کی اتباع میں ہر سال رمضان کے مہینے میں اِس کی جستجو کرتے اور اِس کے لیے عبادت و ریاضت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶﴾

ہمارے حکم سے تقسیم کیے جاتے ہیں[88]۔ اور اِس لیے کہ خاص تیرے پروردگار کی رحمت سے ہم (اِن لوگوں کی طرف) رسول بھیجنے والے تھے[89]۔ یقیناً وہی سمیع و علیم ہے[90]۔

۸۸۔ یہ درحقیقت اُس فیصلے کی عظمت کا اظہار ہے جو اِس رات میں کیا گیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس کا حوالہ دینے سے مقصود اِس حقیقت کا اظہار ہے کہ اِس قرآن کا نزول نہ کوئی اتفاقی واقعہ ہے، نہ یہ کوئی بے وقت کی راگنی ہے، نہ یہ بے موسم کا کوئی خودرو پودا ہے، نہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے، بلکہ یہ اُس اسکیم کا ظہور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلق کی اصلاح و ہدایت کے لیے پسند فرمائی ہے۔ چنانچہ اِس مبارک رات میں اِس کو اُس نے اتارا ہے جو تمام امور حکمت کی تقسیم کے لیے خاص ہے۔ پس جن لوگوں کے لیے یہ اتاری گئی ہے، اُن کا فرض ہے کہ وہ اِس کے شایان شان اِس کی قدر کریں، ورنہ یاد رکھیں کہ جو چیز اللہ نے اِس شان و اہتمام کے ساتھ اتاری ہے، اُس کی ناقدری وہ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ کوئی ہوائی چیز نہیں ہے کہ یہ اِس کو مذاق میں اڑا دیں اور یہ اڑ جائے۔ اِس کی تصدیق یا تکذیب، دونوں ہی چیزیں نہایت اہم نتائج کی حامل ہیں اور یہ نتائج لازماً سامنے آ کے رہیں گے۔'' (تدبر قرآن ۷/۲۶۹)

۸۹۔ یعنی لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے محض ایک نبی نہیں، بلکہ رسول بھیجنے والے تھے۔ رسولوں کے بارے میں ہم کئی جگہ واضح کر چکے ہیں کہ وہ زمین پر خدا کی عدالت بن کر آتے اور اپنی قوموں کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو اُن پیشین گوئیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہم السلام سے بنی اسمٰعیل کے اندر آخری رسول کی بعثت سے متعلق منقول ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ اُن کے لیے ہماری اِس عظیم رحمت کا ظہور ایک ایسی رات میں ہوا جو اِس طرح کے امور مہمہ کے ظہور کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ آیت میں 'رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ' کے الفاظ اِس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ وہ اگر تمھاری

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٧ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝٩ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ

اُس پروردگار کی رحمت سے جو زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی سب چیزوں کا پروردگار ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے، تمھارا پروردگار اور تمھارے باپ دادوں کا پروردگار جو پہلے گزر چکے ہیں۔ ۱-۸

نہیں، (یہ ماننے والے نہیں ہیں)، بلکہ یہ شک میں پڑے ہوئے کھیل رہے ہیں۔[۹۱]

تصدیق نہیں کریں گے تو تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے، اپنے ہی کو خدا کی سب سے بڑی رحمت سے محروم کریں گے۔

۹۰ یعنی سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... اِن صفات کے حوالے میں ایک پہلو یہ ملحوظ ہے کہ اِس کائنات کا رب ایک دانا و بینا ہستی ہے، وہ اپنی خلق کو شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ اُس کے دانا و بینا ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ خلق کے حالات پر پوری نظر رکھے۔ لوگوں کو اپنے احکام و اوامر سے آگاہ کرے۔ اگر وہ اُن کی تعمیل کریں تو دنیا و آخرت، دونوں میں اُس کا انعام دے اور اگر سرکشی کریں تو اُس کی سزا دے۔ دوسرا یہ کہ اِس وقت اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کے ساتھ قریش کے لیڈر جو کچھ کر رہے ہیں، خدائے سمیع و علیم اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ہر بات اُس کے علم میں ہے اور جب ہر بات اُس کے علم میں ہے اور کوئی چیز بھی اُس کی قدرت سے باہر نہیں ہے تو نبی اور اہل ایمان اطمینان رکھیں کہ جو کچھ اُس کی حکمت کا تقاضا ہوگا، وہ لازماً ظہور میں آئے گا۔ کوئی چیز بھی اُس کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکے گی۔" (تدبر قرآن ۷/ ۲۷۱)

۹۱ یعنی ایک انتہائی سنجیدہ معاملے میں ایسا رویہ اختیار کر رہے ہیں جو کوئی بر خود غلط اور

بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۰﴾ یَّغْشَی النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰی لَهُمُ الذِّكْرٰی وَقَدْ

سو اُس دن کا انتظار کرو، (اے پیغمبر)، جب آسمان صریح دھوئیں کے ساتھ نمودار ہوگا[۹۲] اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے۔ (وہ پکار اٹھیں گے کہ) ہمارے رب، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔ اب[۹۳] اِن کے لیے

لاابالی شخص ہی اختیار کرسکتا ہے۔

۹۲ یہ ساف و حاصب کے طوفان کی تعبیر ہے جس سے رسولوں کی قومیں بالعموم ہلاک کی گئیں۔ اِسے 'دُخَانٍ مُّبِیْن' یا صریح دھواں اِس لیے کہا گیا کہ اِس طرح کا طوفان اپنے ابتدائی مرحلے میں اٹھتے ہوئے ابر یا دھوئیں ہی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ سیاہ غبار کا ایک ستون سا آسمان کی طرف اٹھتا نظر آتا ہے۔ اِس غبار میں جب تک سورج بالکل چھپ نہیں جاتا، اُس کی شعاعیں بھی اُس کے اندر مخلوط ہوتی ہیں جس سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے جس کا دھواں آسمان تک اٹھ رہا ہے۔ پھر جب ہوا کا زور بڑھتا ہے اور یہ طوفان کسی طرف کا رخ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابر سیاہ چھا رہا ہے جو بس برسنے ہی والا ہے۔ پھر یہ ایک ہول ناک شکل اختیار کر لیتا ہے اور بستیوں کی بستیوں کو ریت اور کنکر پتھر کی بارش سے ڈھانک دیتا ہے۔'' (تدبرقرآن ۷/ ۲۷۵)

۹۳ یہاں سے آگے وہ جواب ہے جو اِن لوگوں کو اُس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ قرآن نے اِس کے لیے غائب کا اسلوب اختیار فرمایا ہے۔

''اسلوب میں یہ تبدیلیاں بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہیں اور اہل ذوق اُنھیں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہے کہ خطاب کے اسلوب میں بالعموم شدت اور غائب کے اسلوب میں اعراض کا مضمون نمایاں ہوتا ہے۔'' (تدبرقرآن ۷/ ۲۷۷)

جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوۡا عَنۡهُ وَقَالُوۡا مُعَلَّمٌ مَّجۡنُوۡنٌ ﴿۱۴﴾
اِنَّا كَاشِفُوا الۡعَذَابِ قَلِيۡلًا اِنَّكُمۡ عَآئِدُوۡنَ ﴿۱۵﴾ يَوۡمَ نَبۡطِشُ
الۡبَطۡشَةَ الۡكُبۡرٰى ۚ اِنَّا مُنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۱۶﴾
وَلَقَدۡ فَتَنَّا قَبۡلَهُمۡ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ وَجَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ كَرِيۡمٌ ﴿۱۷﴾

نصیحت کہاں! اِن کے پاس تو (ہر چیز کو) کھول کر بیان کر دینے والا رسول آ گیا تھا۔ اِس پر بھی اِنھوں نے اُس سے منہ موڑا اور کہہ دیا کہ یہ تو ایک سکھایا پڑھایا[۹۴] باؤلا[۹۵] ہے۔ ہم کچھ دیر کے لیے یہ عذاب (تم سے) ہٹائے دیتے ہیں، مگر تم لوٹ کر وہی کرو گے جو تم کرتے رہے تھے۔ یاد رکھو، جس دن ہم بڑی پکڑ[۹۶] پکڑیں گے، وہ دن ہو گا کہ ہم پورا بدلہ لے کے رہیں گے۔ ۹-۱۶

اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو بھی ہم نے آزمایا اور اُن کے پاس (اِسی مقصد

---

۹۴ یہ الزام بعض دوسرے مقامات میں بھی مذکور ہے۔ اِس سے وہ اُن لوگوں کو جو قرآن کے اندر حیرت انگیز علم و حکمت اور اُس کے بیان کی غیر معمولی تاثیر سے متاثر ہو رہے تھے، یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ کچھ عجمی غلاموں یا کچھ اہل کتاب کے پڑھے لکھے لوگوں کی سازش ہے جس کے تحت وہ در پردہ یہ کلام ایجاد کرتے اور پھر اِن کی زبان سے پیش کر دیتے ہیں۔

۹۵ یعنی ایسا شخص ہے جسے عذاب کا سودا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اِس کو زمین و آسمان سے وہی آتا دکھائی دیتا ہے اور صبح و شام یہ اُسی کی رٹ لگائے رہتا ہے، اِس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ بات وہ دعوت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انہاک اور اپنی بات پر آپ کے یقین و اذعان کو دیکھ کر کہتے تھے۔

۹۶ یعنی آخرت کی پکڑ، اِس لیے کہ وہ دائمی اور ابدی ہو گی۔

اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۸﴾ وَّ اَنۡ لَّا تَعۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ ۚ اِنِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۹﴾ وَ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ

سے) ایک معزز رسول آیا تھا۔ اِس پیغام کے ساتھ کہ اِن اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو[۹۷]۔ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۹۸] اور یہ کہ تم اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو[۹۹]۔ میں تمھارے سامنے ایک واضح حجت پیش کرتا ہوں[۱۰۰]۔ اور (متنبہ ہو جاؤ کہ) میں اپنے اور تمھارے پروردگار کی پناہ لے چکا ہوں، اِس سے

۹۷ یعنی بنی اسرائیل کو، جنھیں خدا نے اپنے لیے خاص کر کے یہ حکم دیا تھا کہ وہ پورے عالم پر اتمام حجت کے لیے توحید کا ایک مرکز ارض فلسطین میں قائم کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ مطالبہ اِسی حکم کے تحت کیا تھا۔ تاہم اُس وقت اُنھوں نے اِس کی وضاحت نہیں کی، بلکہ جیسا کہ بائیبل میں ہے، صرف اتنی بات کہی کہ ہم بیابان میں تین دن کی راہ عبادت کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ آیت میں 'عِبَادَ اللّٰہِ' کے الفاظ اپنے اندر تنبیہ کا یہ پہلو بھی رکھتے ہیں کہ یہ خدا کے بندے ہیں جنھیں فرعون نے اپنے بندے بنا رکھا ہے۔

۹۸ یعنی اپنی طرف سے کوئی مطالبہ پیش نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے یہ امانت خدا نے سپرد کی ہے اور حکم دیا ہے کہ اِسے بے کم و کاست تم لوگوں تک پہنچا دوں۔

۹۹ مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات خدا کے سفیر اور پیغام بر کی حیثیت سے کہی جا رہی ہے تو سوچ لو کہ نہیں مانو گے تو یہ میرے مقابلے میں نہیں، بلکہ خدا کے مقابل میں سرکشی ہو گی۔ لہٰذا اِس سے بچو۔

۱۰۰ یہ عصا اور ید بیضا وغیرہ اُن غیر معمولی معجزات کی طرف اشارہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش اور جبار بادشاہ کی طرف بھیجتے ہوئے دیے گئے اور جو در حقیقت اُن کے خدا کا سفیر ہونے کی ایک واضح سند تھے۔

وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿٢٠﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿٢١﴾
فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿٢٢﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا
اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٤﴾

کہ تم مجھے سنگ سار کرو[101]۔ اور اگر تم میری تصدیق نہیں کرتے تو (بنی اسرائیل کو جہاں میں لے جانا چاہتا ہوں، اُس کے لیے) میری راہ چھوڑ دو[102]۔ ۱۷-۲۱

(اُن پر اِس کا کچھ اثر نہیں ہوا) تو بالآخر اُس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔ حکم ہوا[103]: اچھا تو میرے بندوں کو رات ہی رات میں لے کر نکل جاؤ اور آگاہ رہو کہ تمھارا پیچھا کیا جائے گا[104]۔ اور ہاں، دریا (سے گزرنے کے بعد اُس) کو پرسکون چھوڑ دینا[105]۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ لوگ اب غرق ہونے والا لشکر ہیں۔ ۲۲-۲۴

۱۰۱۔ یہ بات، ظاہر ہے کہ اُنھوں نے اُس وقت کہی ہوگی، جب قریش مکہ کی طرح فرعون اور اُس کے اعیان و اکابر نے بھی اُن کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔

۱۰۲۔ یعنی ایمان لاتے تو دنیا اور آخرت، دونوں کی سعادتوں سے بہرہ مند ہوتے، لیکن یہ منظور نہیں ہے تو کم سے کم اِس سرزمین سے ہماری ہجرت کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش نہ کرو۔

۱۰۳۔ یہ الفاظ اصل میں اِس لیے حذف کر دیے ہیں کہ دعا کی قبولیت کی مبادرت ظاہر ہو۔

۱۰۴۔ یعنی اِس کے باوجود کہ فرعون نے اجازت دے دی ہے، مگر وہ اپنی بات پر قائم نہیں رہے گا اور اپنے لشکروں کے ساتھ لازماً تمھارا پیچھا کرے گا۔

۱۰۵۔ قرآن اور بائیبل، دونوں میں تصریح ہے کہ دریا کا پانی موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے گزرنے کے لیے تند ہواؤں کے ذریعے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ حکم اِسی بنا پر دیا گیا اور اِس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے گزرتے ہی وہ ہٹا ہوا پانی واپس آکر فرعون اور اُس کی فوجوں پر چھا گیا جو اُس وقت بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے دریا کے بیچ میں پہنچ چکی

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

الدخان
۴۴

یہ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور عمدہ مکانات اور عیش کے سروسامان اپنے پیچھے چھوڑ گئے، جن میں یہ مزے کرتے تھے۔[106] اِس طرح کے مجرموں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ اور ہم نے اِن سب چیزوں کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا۔ پھر نہ آسمان اِن پر رویا اور نہ زمین، اور نہ اِن کو مہلت دی گئی۔ ۲۵-۲۹

بنی اسرائیل کو ہم نے (اِس طرح) ذلیل کر دینے والے عذاب سے نجات دی تھی۔ فرعون سے — یقیناً وہ بڑا ہی سرکش تھا، حد سے گزر جانے والا تھا۔ اور اُن کو دیکھ سمجھ کر دنیا والوں پر ترجیح دی تھی[107] اور اُن کو ایسی نشانیاں عطا فرمائی تھیں جن میں (اُن کے لیے) کھلا ہوا انعام تھا۔ ۳۰-۳۳

تھیں۔ اِس میں، اگر غور کیجیے تو حکم کا اسلوب ایسا ہے کہ گویا دریا اُس وقت پیغمبر کے اختیار میں دے دیا گیا تھا، جسے اگر پر سکون ہونا تھا تو اُسی کی اجازت سے ہونا تھا۔

۱۰۶؎ یہی چیزیں ہیں جو زمین پر لوگوں کی سرکشی کا باعث بنتی ہیں، لیکن جب نتیجہ سامنے آتا ہے تو کچھ بھی کام نہیں آتیں اور لوگ اِنھیں دوسروں کے لیے چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

۱۰۷؎ بنی اسرائیل دنیا والوں پر دین حق کی شہادت کے لیے اُسی طرح منتخب کیے گئے تھے، جس طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کے اندر سے انبیا علیہم السلام کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ اِسی انتخاب

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِىَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾
اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾
وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ

یہ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ بس یہی ہمارا پہلی دفعہ کا مرنا ہے اور ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔سو، (ایمان والو)، اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو اٹھا لاؤ۔[۱۰۸] ۳۴-۳۶

(یہ کس بل بوتے پر ہٹ دھرمی دکھا رہے ہیں، اِن سے پوچھو)، یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم کے لوگ اور جو اُن سے پہلے گزرے ہیں؟ ہم نے اُن کو ہلاک کر مارا، اِس لیے کہ وہ بھی (اِسی طرح کے) مجرم لوگ تھے۔ ۳۷

زمین اور آسمانوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم نے اِن کو ایک غایت کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے،

کے لیے دنیا کی قوموں پر اُن کی ترجیح کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کے پہلے باب کی سورتوں میں جگہ جگہ اِس کی تصریح ہے۔ یہ انتخاب الل ٹپ نہیں ہوتا، بلکہ اُن صلاحیتوں اور خصوصیات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو کسی فرد یا قوم میں پائی جاتی ہیں۔ آیت میں 'عَلٰی عِلْمٍ' کے الفاظ اِسی حقیقت کی وضاحت کے لیے آئے ہیں۔

۱۰۸؎ قرآن نے اُن کے اِس مطالبے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کی لغویت اِس قدر واضح ہے کہ اِس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى
شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِىْ

الدخان ۴۴

مگر اِن کے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۱۰۹]۔ یقیناً فیصلے کا دن اِن سب کا مقرر وقت ہے[۱۱۰]۔ جس دن کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کے کچھ بھی کام نہیں آئے گا اور نہ اِن کی کوئی مدد کی جائے گی[۱۱۱]۔ ہاں، مگر وہ جن پر اللہ رحم فرمائے۔ یقیناً وہی زبردست ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۱۱۲]۔ ۳۸-۴۲

اِس میں کچھ شک نہیں کہ زقوم[۱۱۳] کا درخت (اُس دن) گناہ گاروں کا کھانا ہوگا، تیل

۱۰۹؎ یعنی اِس حقیقت کو نہیں جانتے کہ اگر اِس دنیا کی کوئی غایت نہ مانی جائے اور یہ خیال کرلیا جائے کہ یہ اِسی طرح چلتی رہے گی یا ایک دن یوں ہی تمام ہوجائے گی تو ماننا پڑے گا کہ اِس کا خالق کوئی کھلنڈرا ہے جو آسمانوں پر بیٹھا ہوا لوگوں پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کا تماشا کررہا ہے۔ یہ، ظاہر ہے کہ ایسا سوءِ ظن ہے جس کا کسی علیم و حکیم اور غفور و رحیم خالق کے بارے میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔

۱۱۰؎ آیت میں لفظ 'اَجْمَعِيْنَ' قابل توجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس دن چھوٹے بڑے، امیر و مامور، شاہ و گدا اور عامی و عارف، سب کے ساتھ انصاف کیا جائے گا جس میں نہ کوئی حقیقت چھپی رہے گی اور نہ کوئی اپنے اثر و رسوخ اور مرتبہ و مقام کی بنا پر انصاف میں مزاحم ہو سکے گا۔

۱۱۱؎ یعنی اُن کے کسی مزعومہ شریک یا شفیع کی طرف سے۔

۱۱۲؎ لہٰذا بندوں کو اُسی سے ڈرنا اور اُسی سے امیدیں رکھنی چاہییں۔

۱۱۳؎ تھوہر کے درخت کو کہتے ہیں، لیکن یہ جہنم کا تھوہر ہے جس کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔

فِی الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ ﴿۵۱﴾ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۵۲﴾ یَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ

کی تلچھٹ کی طرح وہ پیٹ میں کھولے گا، جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔[۱۱۴] حکم دیا جائے گا: اِس کو پکڑو اور رگیدتے ہوئے جہنم کے بیچ تک لے جاؤ۔ پھر اِس کے سر پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب انڈیل دو ــــ اِسے چکھو، تمھی ہو کہ بڑے زور والے، بڑے عزت دار بنے رہے۔ یہ وہی چیز ہے جس میں تم لوگ شک کیا کرتے تھے۔[۱۱۵] ۴۳-۵۰

خدا سے ڈرنے والے، البتہ امن کی حالت میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، سندس اور استبرق[۱۱۶] کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔[۱۱۷] اُن کی شان یہی

۱۱۴؎ یہاں تشبیہ میں کھولنے کی دو صورتیں جمع کر دی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”یعنی اِس کا کھولنا حدت، شدت، جلن اور تلخی میں تو نہایت مکروہ اور کڑوے تیل کے تلچھٹ کے مانند ہوگا اور جوش کے اعتبار سے پانی کے کھولنے کے مانند۔ تیل پکتا ہے تو اُس میں حدت تو نہایت شدید ہوتی ہے، لیکن جوش نہیں ہوتا۔ پانی پکتا ہے تو اُس میں جوش بھی ہوتا ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۲۹۱)

۱۱۵؎ یہ بات عذاب دینے والوں کی زبان سے بھی ہو سکتی ہے اور عذاب کی زبان حال سے بھی۔

۱۱۶؎ یہ ریشمی کپڑوں کے نام ہیں۔

۱۱۷؎ آیت میں لفظ 'مُتَقٰبِلِیْنَ' آیا ہے۔ اِس کا فعل محذوف ہے، یعنی 'یَجْلِسُوْنَ' یا 'یَتَّكِئُوْنَ مُتَقٰبِلِیْنَ'۔

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾
فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾

الدخان
۴۴

ہو گی۔ اور ہم اُن سے غزال چشم گوریاں بیاہ دیں گے۔ وہاں نہایت اطمینان کے ساتھ وہ ہر طرح کے میوے منگا رہے ہوں گے۔ پہلی موت کے بعد (جو دنیا میں آ چکی)، وہ اب اِس میں کبھی موت کا مزہ نہ چکھیں گے۔ اِن کو اللہ نے جہنم کے عذاب سے بچا لیا۔ یہ خاص تیرے پروردگار کے فضل سے ہو گا۔ یہی درحقیقت بڑی کامیابی ہے۔ ۵۱-۵۷

سو (اِنھیں اِسی قرآن سے یاددہانی کرتے رہو، اے پیغمبر، اِس لیے کہ) ہم نے تو اِس کو تمھاری زبان میں[118] نہایت موزوں بنایا ہے[119]، اِسی لیے کہ یہ یاددہانی حاصل

۱۱۸ یعنی وہ زبان جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بولتے تھے۔ یہ قریش کی عربی معلیٰ تھی۔ یہاں اِس کا حوالہ اتمام حجت کے پہلو سے ہے، لیکن ضمناً یہ بات بھی اِس سے واضح ہوتی ہے کہ قرآن کے طالب علموں کو اُس کے مطالب تک رسائی کے لیے اِسی زبان کو سیکھنا اور اِسی کا ذوق اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔

۱۱۹ اصل میں لفظ 'تَیْسِیْر' استعمال ہوا ہے۔ اِس کے اصل معنی کسی شے کو پیش نظر مقصد کے لیے تمام ضروری لوازم سے آراستہ کر کے موزوں اور سازگار بنا دینے کے ہیں۔ ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

کریں۔ (پھر بھی نہیں مانتے) تو تم بھی خدا کے فیصلے کا انتظار کرو، یہ بھی انتظار کر رہے ہیں[۱۲۰]۔ ۵۸-۵۹

۱۲۰؎ اوپر کے جملے میں جو تنبیہ مضمر ہے، وہ اِس جملے میں بالکل نمایاں ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن سے یاددہانی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور مصر ہیں کہ عذاب کو دیکھ کر ہی مانیں گے تو خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ جس چیز کے منتظر ہیں، اُس کے ظہور میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔

کوالالمپور

۳؍ ستمبر ۲۰۱۴ء

الجاثیه ـ الاحقاف

۴۵ ـــــ ۴۶

الجاثیہ ۔ الاحقاف

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع وہی انذار و بشارت ہے جو پچھلی سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔ اِس کا جو پہلو، البتہ دونوں سورتوں میں نمایاں ہے، وہ مخاطبین کے اعتراضات وشبہات کی تردید اور اُن کے اُس رویے پر تہدید ہے جو وہ قرآن اور اُس کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔ دونوں سورتوں کو ایک ہی آیت سے شروع کر کے قرآن نے اِن کے اِس تعلق کی طرف خود اشارہ کر دیا ہے۔

اِن سورتوں میں خطاب قریش سے ہے اور اِن کے مضامین سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں نازل ہوئی ہیں۔

سورة الجاثیه

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾ وَ فِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَ مَا

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ' ہے[۱]۔ اِس کتاب کی تنزیل اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے[۲]، بڑی حکمت والا ہے[۳]۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بہت سی نشانیاں ہیں،

۱۔ پچھلی سورتوں کی طرح اِس سورہ کا نام بھی 'حٰمٓ' ہے۔ یہ اشتراک مطالب پر دلیل ہے اور قرآن کا ہر طالب علم اِسے تمام حوامیم میں بالکل نمایاں دیکھ سکتا ہے۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔

۲۔ یہ تہدید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے یہ کلام اتارا ہے، وہ کوئی ضعیف و ناتواں ہستی نہیں ہے، بلکہ اِس کائنات کا بادشاہ ہے اور اِس کا تمام اختیار و اقتدار اُسی کے قبضے میں ہے۔ یہ اُس کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اِس لیے جو لوگ اِس کی ناقدری کریں گے، وہ سوچ لیں کہ اپنے لیے کس انجام کو دعوت دے رہے ہیں۔

۳۔ یہ تسلی ہے کہ اگر ناقدری کرنے والوں کو مہلت مل رہی ہے تو اِس سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ صرف زبردست ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ بڑی حکمت والا بھی ہے۔ چنانچہ اِسی بنا پر منکرین اور مکذبین کو بھی مہلت پر مہلت دیے چلا جاتا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ جن کے اندر اصلاح کی کچھ صلاحیت ہے، وہ اِس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر لیں اور جو ہٹ دھرم ہیں، اُن پر اُس کی حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے تاکہ قیامت کے دن وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔

يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ

اُن کے لیے جو ایمان لانے والے ہوں۔[4] اور خود تمھاری خلقت میں[5] اور اُن حیوانات میں بھی جو اُس نے (تمھارے لیے) پھیلا رکھے ہیں،[6] اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں

[4] مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر حقیقت کی جستجو اور منزل کی سچی طلب ہو تو خالق کائنات نے زمین و آسمان میں ہر جگہ ایسے معالم رکھ دیے ہیں کہ اُن کو دیکھ کر وہ سیدھا وہاں پہنچ سکتا ہے، جہاں یہ قرآن پہنچنے کی دعوت دے رہا ہے۔

[5] یعنی انسان اگر اِسی بات پر غور کرے کہ کس طرح پانی کی ایک بوند اُس کے جسم کے کارخانے میں اُنھی بے جان چیزوں سے پیدا ہو جاتی ہے جو وہ شب و روز کھاتا اور پیتا ہے، اور پھر اُسی بوند سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آتی ہے جو اعلیٰ سائنس کا بے نظیر شاہ کار ہے تو اُسے نہ خدا کی معرفت کے معاملے میں کوئی شبہ پیش آ سکتا ہے اور نہ اُس کے حضور میں جواب دہی کے معاملے میں کوئی تردد لاحق ہو سکتا ہے۔

[6] یہ اُس سامان ربوبیت کی طرف اشارہ ہے جو زمین پر انسان کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اگر انسان غور کرے تو اِس امر میں ذرا شبہے کی گنجایش نہیں ہے کہ انسان چوپایوں سے جو گوناگوں فوائد حاصل کر رہا ہے، یہ اِس کو محض اتفاقی واقعے کے طور پر نہیں حاصل ہو رہے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اِنھی فوائد کے لیے اِن چیزوں کو وجود بخشا اور ہر اعتبار سے اِن کو اِن کے فوائد کے لیے موزوں بنایا ہے۔ انسان کو سواری اور بار برداری کا محتاج بنایا تو سواری اور بار برداری کے لیے نہایت موزوں جانور پیدا کیے، اُس کو دودھ اور گوشت اور کھال اور اون کا ضرورت مند بنایا تو اِن تمام ضروریات کے لیے الگ الگ نہایت مناسب چوپایے عطا کیے۔ یہ چیز اِس بات کی صاف دلیل ہے کہ اِس کائنات کا خالق نہایت مہربان ہے اور اُس کی شکر گزاری واجب ہے۔ پھر اِس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جب اُس نے انسان کو اِس اہتمام کے ساتھ اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو لازم ہے کہ ایک ایسا دن بھی آئے جس دن وہ اِن نعمتوں کے متعلق لوگوں سے سوال کرے، جنھوں

وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵

ہیں جو یقین کرنا چاہیں۔ اور شب و روز کے بدل کر آنے میں[7] اور اُس روزی[8] میں جو اللہ نے (پانی کی صورت میں) آسمان سے اتاری، پھر اُس سے زمین کو اُس کے مر جانے کے بعد زندہ کر دیا[9] اور ہواؤں کے پھیرنے میں[10] بھی اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں[11]۔ ۱-۵

الجاثیہ ۴۵

نے اِن کا حق پہچانا ہو، اُن کو انعام دے اور جو اِن کو پا کر خدا کو بھول بیٹھے ہوں، اُن کو اِس کفران نعمت کی سزا دے۔'' (تدبر قرآن ۷/۳۰۳)

۷۔ یہ بھی خدا کی قدرت و حکمت کی ایک بڑی نشانی ہے۔ ہماری زمین پر زندگی کی ساری لطافت اور سارا حسن رات اور دن کی باہمی سازگاری اور موافقت سے ہے۔ یہ اگرچہ ضدین ہیں، لیکن اپنی اِس سازگاری اور موافقت سے شہادت دے رہے ہیں کہ دونوں ایک ہی خدا کے بنائے ہوئے ہیں جس نے اِنھیں ہماری خدمت میں لگا دیا ہے اور یہ پوری پابندی اوقات کے ساتھ اُس کے حکم سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۸۔ اصل میں 'رِزْق' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہاں پانی ہے جو ذریعۂ رزق بنتا ہے۔ یہ سبب کے لیے مسبب کا استعمال ہے جو دنیا کی ہر زبان میں معروف ہے۔

۹۔ توحید اور قیامت پر استدلال کے لیے قرآن نے جگہ جگہ اِس نشانی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بارش اگرچہ آسمان سے ہوتی ہے، لیکن وہ رزق کے خزانے زمین والوں کے لیے لے کر آتی ہے۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ زمین اور آسمان، دونوں میں ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔ پھر یہی نہیں، خشک اور بے آب و گیاہ زمین کو وہ جس طرح زندہ کر دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا ہر گوشہ سبزے سے لہلہا اٹھتا ہے، اُس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اُس کا برسانے والا اگر یہ کہتا ہے کہ ایک دن وہ پورے عالم پر بھی اِسی طرح اپنی رحمت

کی بارش برسائے گا اور زمین میں مدفون ہمارے سب آبا و اجداد کو اپنے سامنے اٹھا کھڑا کرے گا تو اِس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اُس کے لیے یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

۱۰۔ یعنی جس طرح وہ گردش کرتی، کبھی رکتی، کبھی چلتی اور کبھی صرصر اور کبھی صبا بن جاتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...(اِس سے) صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مصرف کے ہاتھ میں اِن کی باگ ہے اور وہی اپنی حکمتوں کے تحت اِن کو استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ اِن کو روک دے تو چشم زدن میں ساری دنیا تباہ ہو جائے۔ وہ چاہے تو ایک قوم کے لیے اِس کو رحمت بنا دے اور دوسری قوم کے لیے نقمت۔ اِسی ہوا کی گردش سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم کو نجات بخشی اور اِسی کی گردش سے فرعون اور اُس کی قوم کو ہلاک کیا۔ آئے دن یہ بات مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ کسان اپنی فصل کے مستقبل سے نہایت مطمئن ہوتے ہیں، لیکن دفعتاً کوئی ایسی ہوا چل جاتی ہے کہ مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ ملاح اپنی کشتیوں کے بادبان کھولے ہوئے اور کسان اپنی گندم صاف کرنے کے آلات لیے ہوئے سازگار ہوا کے انتظار میں چشم براہ ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں کہ سازگار ہوا چلا دے۔ اِس زمانے میں سائنس کی بدولت اگرچہ انسان کے اندر یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اُس نے ابر و ہوا کو بہت بڑی حد تک اپنے قابو میں کر لیا ہے، لیکن قدرت ذرا سا جھنجھوڑ دیتی ہے تو اِس ادعا کا سارا بھرم کھل جاتا ہے۔ یہ باتیں اِس بات کی صاف شہادت ہیں کہ ایک ہی ذات ہے جو اِس کائنات کے تمام عناصر پر حکمران ہے۔ اُس کے اذن کے بغیر ایک پتا بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۳۰۵)

۱۱۔ اِس سے پہلے فرمایا کہ جو ایمان لانے والے ہوں، جو یقین کرنا چاہیں۔ مدعا یہ ہے کہ قرآن جن حقائق پر ایمان کی دعوت دے رہا ہے، اُن کی نشانیاں تو قدم قدم پر موجود ہیں، مگر یہ نظر اُنھی کو آتی ہیں جن کے اندر اِن کو دیکھنے اور قبول کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو، جو ماننے کے لیے تیار ہوں، بے یقینی کے مرض میں مبتلا نہ ہو گئے ہوں اور جو عقل سے کام لیں۔ جن کے اندر یہ صفات نہ ہوں، اُنھیں کوئی بڑی سے بڑی نشانی بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿٧﴾ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ

یہ اللہ کی آیتیں[۱۲] ہیں جنھیں ہم حق کے ساتھ[۱۳] تمھیں سنا رہے ہیں تو اللہ اور اُس کی آیتوں کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے![۱۴] تباہی ہے ہر اُس جھوٹے[۱۵] بدا عمال[۱۶] کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے، وہ اُس کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں[۱۷]، پھر بھی تکبر کے ساتھ اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے، گویا اُس نے وہ سنی ہی نہیں ہیں۔

الجاثیہ ۴۵

۱۲؎ یعنی وہ آیتیں جن میں پیچھے انفس و آفاق کے اندر خدا کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

۱۳؎ یعنی اُن واقعی نتائج ولوازم کے ساتھ جو اِن نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں اور جن کی وضاحت اوپر ہوئی ہے۔

۱۴؎ مطلب یہ ہے کہ انفس و آفاق کے یہی دلائل اور عقل و فطرت کے یہی بینات ہیں جو کسی عاقل کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اگر اِن کو نہیں مانتے اور اللہ کے اور اُس کی توحید کے منکر ہو رہے ہیں جو اِس کائنات کی سب سے زیادہ بدیہی حقیقت، بلکہ ابدہ البدیہیات ہے، اور اُس کی آیتوں کا انکار کر رہے ہیں جن سے اتمام حجت کی حد تک حق واضح ہو چکا ہے تو اِن سے پھر کوئی بات بھی نہیں منوائی جا سکتی۔

۱۵؎ یعنی دین کے معاملے میں جھوٹے، جو اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں جس چیز کو چاہتے ہیں کچھ سے کچھ بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔

۱۶؎ اصل میں لفظ 'اَثِیْم' استعمال ہوا ہے جس کے معنی حق تلفی کرنے والے کے ہیں۔ اِس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اِن کی تمام تحریفات کے پیچھے اصلی محرک اِن کی اخلاقی پستی اور نابکاری پر اِن کا اصرار ہے کہ نہ خدا کے حقوق ادا کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ بندوں کے۔

بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۸﴾ وَاِذَا عَلِمَ مِنۡ اٰيٰتِنَا شَيۡـئَا اۨتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۹﴾ؕ مِنۡ وَّرَآئِهِمۡ جَهَنَّمُ‌ ۚ وَلَا يُغۡنِىۡ عَنۡهُمۡ مَّا كَسَبُوۡا شَيۡـئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَوۡلِيَآءَ ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰﴾ؕ هٰذَا هُدًى‌ ۚ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ

(یہ اُس کا رویہ ہے)، سو اُسے ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اور ہماری آیتوں میں سے (اِسی طرح) اُسے جب کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اُس کو مذاق بنا لیتا ہے[۱۸]۔ یہی ہیں جن کے لیے ذلت کا عذاب[۱۹] ہے۔ اِن کے آگے جہنم ہے اور جو کچھ بھی اِنھوں نے (دنیا میں) کمایا ہے[۲۰]، وہ اِن کے ذرا بھی کام آنے والا نہیں ہے اور نہ وہ جن کو اِنھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا رکھا ہے، اِن کے کچھ کام آئیں گے اور اِن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ قرآن اصل ہدایت ہے اور جو

۱۷۔ یہ جرم کی سنگینی کا اظہار ہے کہ خدا کی آیتیں پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں اور اِنھیں کوئی اور نہیں، خدا کا رسول پڑھ کر سنا رہا ہے، اِس کے باوجود اپنی نابکاریوں پر اصرار کیے چلے جا رہے ہیں۔

۱۸۔ اوپر اُس رویے کا ذکر تھا جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اختیار کرتے تھے، جب آپ بذاتِ خود اُن کو قرآن سنانے کی کوشش فرماتے تھے۔ اب وہ رویہ بیان ہو رہا ہے جو اُس وقت سامنے آتا تھا، جب کوئی شخص آپ کی مجلس سے قرآن کی کوئی بات سن کر اُن تک پہنچاتا تھا اور وہ اِس اندیشے سے کہ اُن کا کوئی آدمی اِس سے متاثر نہ ہو جائے، اُس کا ٹھٹا اڑانے لگتے تھے۔

۱۹۔ یہ سب سے زیادہ سخت عذاب ہے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مستکبرین کے لیے خاص ہے۔

۲۰۔ یعنی مال و دولت جو اِس وقت اِن کے استکبار کا باعث بن رہا ہے۔

رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ
مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

الجاثیہ ۴۵

اپنے پروردگار کی آیتوں کے منکر ہیں، اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے، ایسا کہ کپکپی پیدا کر دے۔ ۶-۱۱

(لوگو)، اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمھارے لیے سازگار بنا دیا کہ اُس کے حکم[۲۱] سے کشتیاں اُس میں چلیں، اِس لیے کہ تم ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرو[۲۲] اور اِس لیے کہ تم اُس کا فضل تلاش کرو اور اِس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار رہو[۲۳]۔ اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، سب اُسی نے اپنی طرف سے تمھاری خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اِس کے اندر بھی بہت سی نشانیاں ہیں[۲۴]، اُن لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ ۱۲-۱۳

۲۱؎ یہ اُس قانون کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کے تحت سوئی تو سمندر میں ڈوب جاتی ہے، مگر پہاڑوں جیسے بڑے جہاز اُس کے سینے پر اِس طرح تیرتے ہیں، گویا کسی ہموار سڑک پر دوڑ رہے ہوں۔

۲۲؎ یہ 'وَلِتَبْتَغُوْا' کا معطوف علیہ ہے جو اصل میں حذف کر دیا ہے اور حرف عطف اِس حذف کی دلیل ہے۔

۲۳؎ اِسی شکر گزاری کا نتیجہ وہ بندگی ہے جس کا قرآن تقاضا کرتا ہے۔

۲۴؎ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ یہ سب چیزیں جب ہماری خدمت میں لگی ہوئی ہیں تو

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

تم اہل ایمان سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ اِن سے درگزر کریں جو خدا کے دنوں کا[25] اندیشہ نہیں رکھتے ہیں کہ (وہ اپنا پیمانہ بھرلیں اور) اللہ ایک گروہ کو[26] اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) جو نیک عمل کرے گا، اُس کا نفع اُسی کے لیے ہے اور جو برائی کرے گا تو اُس کا وبال بھی اُسی پر ہے۔ پھر (اِسی بدلے کے لیے) تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۴-۱۵

اِن میں سے کسی چیز کے بارے میں بھی یہ تصور کس طرح کیا جاسکتا ہے کہ وہ معبود ہے اور اُس کی پرستش ہونی چاہیے؟ نیز اِس بات کی نشانیاں کہ اپنے اندر تضادات کے باوجود اگر یہ ایسی موافقت کے ساتھ کام کر رہی ہیں تو یہ خیال کس طرح کیا جائے کہ اِن کے اندر کوئی دوسرا ارادہ بھی کارفرما ہوسکتا ہے؟ پھر اِس سے یہ نتیجہ بھی نکل آتا ہے کہ یہ حیرت انگیز کارخانہ ہرگز عبث نہیں ہوسکتا۔ اِس کی لازماً ایک غایت ہے اور وہ یہی ہوسکتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں اِس کے تمام تقاضوں کا جواب دیا جائے جو اِس کے وجود سے ظاہر ہیں۔

۲۵ یعنی اُن دنوں کا جب رسولوں کے مکذبین کے لیے اُس کے فیصلے صادر ہوئے اور وہ دنیا سے مٹا دیے گئے۔ یہ دن جن قوموں پر آئے، اُن کی سرگذشتیں قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں۔

۲۶ یعنی جو رسول کا منکر ہو۔ یہاں اِس سے اشارہ قریش کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے اور لفظ 'قَوْمًا' کی تنکیر نفرت و بے زاری کے اظہار کے لیے ہے، جس طرح 'اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا' میں لفظ 'قُلُوْب' کی تنکیر ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ

(یہ کن لوگوں کے بھروسے پر تمھاری مخالفت کر رہے ہیں)؟ ہم نے یقیناً بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور پیغمبری عطا فرمائی تھی[27] اور اُنھیں پاکیزہ رزق دیا تھا[28] اور (اپنے دین کی خدمت کے لیے خاص کر کے) اُنھیں دنیا والوں پر فضیلت بخشی تھی[29]

٢٧۔ بنی اسرائیل کے بارے میں ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں کہ اُنھیں اللہ تعالیٰ نے ارض فلسطین میں توحید کا مرکز قائم کر کے دنیا کی قوموں پر اتمام حجت کے لیے منتخب کیا تھا۔ اِس کا لازمی نتیجہ اِس سرزمین کی حکومت تھی اور حکومت کے لیے ضروری تھا کہ اُنھیں شریعت دی جائے۔ چنانچہ تورات کی صورت میں جو کتاب اُنھیں دی گئی، وہ قرآن کی طرح پیغمبر کی سرگذشت انذار نہیں ہے، بلکہ اجتماعی زندگی کے لیے احکام و قوانین کا مجموعہ ہے۔ اِس کے ساتھ اُن کے اندر نبوت کا سلسلہ بھی جاری کر دیا گیا جو مسیح علیہ السلام تک بغیر کسی انقطاع کے جاری رہا۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ اُن کی یہ حکومت ایک حکومت الٰہیہ کی حیثیت سے دنیا والوں پر خدا کی گواہی دے۔

٢٨۔ یہ اُس نعمت و رفاہیت کی طرف اشارہ ہے جس کا آغاز ارض فلسطین پر اُن کے قبضے سے ہوا اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں یہ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

٢٩۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اِسی انتخاب کا نتیجہ تھا۔ قرآن میں تصریح ہے کہ یہ انتخاب بالکل اُسی طریقے سے اور اُسی مشن کے لیے ہوا جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے نبیوں کا انتخاب کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ نبوت بھی اِس کے بعد کم و بیش دو ہزار سال تک اِنھی کے اندر رہی، یہاں تک کہ مسیح علیہ السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ذریت ابراہیم ہی کی ایک دوسری شاخ، بنی اسمٰعیل کو اِس منصب کے لیے منتخب کر لیا جو صدیوں پہلے اِسی مقصد سے عرب کی وادی غیر ذی زرع میں خدا کی زمین پر اُس کے اولین معبد کے گرد اُس کے متولیوں کی حیثیت سے آباد کیے گئے تھے۔

بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ

اور ہم نے اپنی شریعت کے واضح احکام اُن کو دیے تھے۔ پھر جو اختلاف اُنھوں نے کیا تو (ہماری طرف سے) اُن کے پاس علم آجانے کے بعد محض آپس کی ضد سے کیا۔ یقیناً تیرا پروردگار قیامت کے دن اُن کے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں[۳۰]۔ اِس کے بعد، (اے پیغمبر)، اب ہم نے تم کو اپنے دین کی ایک واضح شریعت پر قائم کیا ہے، سو تم اُسی کی پیروی کرو اور اُن لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے[۳۱] نہ چلو جن کے پاس علم نہیں ہے[۳۲]۔ یہ خدا کے آگے تمھارے کچھ کام آنے

۳۰؎ یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ اِن کے بجائے نبوت و رسالت بنی اسمٰعیل کو دینے کا فیصلہ کیوں کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اِنھوں نے ضد، ہٹ دھرمی اور آپس کے عناد کے باعث دین و شریعت میں ایسے اختلافات پیدا کر دیے ہیں کہ اُن کا فیصلہ اب قیامت ہی میں ہو سکتا ہے۔ اِن کے علما اور اکابر اگرچہ اب بھی مشیخت پناہی سے باز نہیں آتے اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ دین و شریعت کے اصلی حاملین وہی ہیں، مگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ اِن سے بالکل محروم ہو چکے ہیں۔

۳۱؎ یعنی اُن خواہشوں کے پیچھے جو دین و شریعت میں بدعات کو جنم دیتی اور اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں۔

۳۲؎ اِن میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین، سب شامل ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اِس تاکید کی ضرورت اِس وجہ سے نہیں پیدا ہوئی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

بَعۡضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹﴾
هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًی وَّرَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾
اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ
مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ

الجاثیہ
۴۵

والے نہ بنیں گے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور اللہ اُن کا مددگار ہے جو اُس سے ڈرنے والے ہیں۔۱۶-۱۹

یہ قرآن لوگوں کے لیے بصیرت کی آیتوں کی کتاب ہے[۳۳] اور جو لوگ یقین لائیں، اُن کے لیے (دنیا میں) ہدایت اور (آگے) رحمت ہے۔ کیا یہ برائیوں کا ارتکاب کرنے والے سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم اِنھیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ اِن کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا؟ بہت برا حکم ہے جو یہ لگا رہے ہیں[۳۴]۔ اللہ نے تو زمین اور آسمانوں کو غایت کے

خدانخواستہ یہ اندیشہ تھا کہ آپ اِن کی بدعات کی طرف مائل ہو جائیں گے، بلکہ لوگوں کی بدعات سے یہ بالواسطہ اظہار نفرت کا ایک طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن لوگوں کو مخاطب کرنا پسند نہیں فرمایا، اِس وجہ سے اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے اِن بدعات سے احتراز کی تاکید فرما دی۔ یہ اسلوب کلام قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۳۱۸)

۳۳؎ مطلب یہ ہے کہ مذاق اڑانے والے مذاق اڑاتے رہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ قرآن بصیرت ہی بصیرت ہے اور اِس کا فیض سورج کی طرح ہر شخص کے لیے عام ہے، اگر وہ اِس سے روشنی حاصل کرنے کے لیے اپنی آنکھیں کھولے۔

وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾
اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ
وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ

ساتھ پیدا کیا ہے کہ لوگوں کا فیصلہ کرے[35] اور اِس لیے کیا ہے کہ ہر شخص کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ (لہٰذا یہی ہوگا) اور لوگوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی جائے گی[36]۔ ۲۰-۲۲

الجاثیہ
۴۵

پھر کیا اُن لوگوں کو دیکھا بھی ہے جنھوں نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا اور اللہ نے اِسی بنا پر جن کو گم راہ کر دیا، اِس کے باوجود کہ (خدا کے دین کا) علم رکھتے تھے[37] اور اُن کے دل پر اور کانوں پر مہر لگا دی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے[38]؟

۳۴؎ اِس لیے کہ اِس کے بعد تو یہ ماننا پڑے گا کہ اِس کائنات کا خالق محض ایک کھلنڈرا اور تماشائی ہے اور ہمارے اندر عدل کا جو شعور اُس نے رکھا ہے، وہ صرف اذیت کے لیے ہے اور وہ اِس کا بھی تماشا دیکھ رہا ہے۔

۳۵؎ یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جو اصل میں محذوف ہے۔

۳۶؎ یعنی نہ کسی کا زور واثر کام آئے گا اور نہ اِن کے شرکا وشفعا جن پر یہ بھروسا کیے بیٹھے ہیں، بلکہ بالکل بے لاگ انصاف کے ساتھ تمام معاملات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

۳۷؎ پیچھے یہی بات 'مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ' کے الفاظ سے فرمائی ہے۔

۳۸؎ یہ اُس قانون کے مطابق ہوا جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور جس کی رو سے جب کوئی شخص حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا اور جانتے بوجھتے اُسے ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُسے مہلت دی جاتی ہے۔ پھر اِس مہلت سے وہ اگر فائدہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اُس کے دل ودماغ پر مہر کر دی جاتی ہے اور اِس طرح وہ اِسی

يَهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾
وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ
اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

تو اِس طرح کے لوگوں کو اب کون ہدایت دے سکتا ہے، اِس کے بعد کہ اللہ نے اُنھیں گم راہ کر دیا ہے[۳۹]! (ایمان والو)، پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے ہو[۴۰]! ۲۳

(اِن میں سے جن لوگوں کو قیامت کا یقین نہیں ہے)، وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو یہی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم یہیں مرتے اور یہیں جیتے ہیں اور (کوئی فرد ہو یا قوم)، یہی زمانے کی گردش ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتی ہے[۴۱]۔ حقیقت یہ ہے

الجاثیه
۴۵

دنیا میں خدا کے عذاب کی زد میں آ جاتا ہے۔ اِس مہر کے نتیجے میں آدمی کا مذاق طبیعت اِس قدر بگڑ جاتا ہے اور اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اِس قدر ماؤف ہو جاتی ہے کہ صرف وہی باتیں اُسے اچھی لگتی ہیں جن سے اُس کے بگڑے ہوئے مذاق کو غذا ملے۔ اُس کی ساری دل چسپی صرف بدی کے کاموں سے رہ جاتی ہے۔ نیکی کی بات معقول سے معقول اسلوب میں بھی کہی جائے تو اُس سے اُس کو وحشت ہوتی ہے۔ وہ کبھی دل کی آمادگی اور اُس کے حضور کے ساتھ اُسے سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

۳۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ'۔ یہ درحقیقت 'مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَضَلَّهُ اللّٰهُ' ہے، مگر عربیت کے قاعدے سے 'اَنْ اَضَلَّهٗ' کے الفاظ حذف کر دیے ہیں۔

۴۰؎ مطلب یہ ہے کہ اِن کی یہ حالت دیکھتے نہیں ہو کہ قرآن اور پیغمبر کے ساتھ اِن کی دشمنی اور مشرکین کے ساتھ دوستی پر تعجب کر رہے ہو؟

۴۱؎ یعنی جس طرح فرد جوانی اور بڑھاپے سے گزر کر لازماً مر جاتا ہے، اُسی طرح قومیں

وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا کَانَ حُجَّتَھُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یَجۡمَعُکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

کہ اِس معاملے میں اِن کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض اٹکل دوڑا رہے ہیں۔ اِنھیں جب ہماری کھلی کھلی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اِن کے پاس کوئی حجت[۴۲] اِس کے سوا نہیں ہوتی کہ تم سے کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو (زندہ کر کے) لے آؤ۔ اِنھیں بتا دو کہ اللہ ہی تمھیں زندہ کرتا ہے، پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی قیامت کے دن تک[۴۳]، جس

بھی پیدا ہوتی، فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑتی، تہذیب و تمدن کی بنا ڈالتی، بڑے بڑے معرکے سرانجام دیتی اور بالآخر اپنی سب قوتیں اور صلاحیتیں نچوڑ کر دنیا کے اسٹیج سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ روز جزا پر ایمان کی دعوت کے جواب میں اُن کے بعض لوگ یہ کہتے تھے۔ لیکن اِس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ زمانۂ رسالت کے مشرکین یا یہود و نصاریٰ میں کوئی گروہ دہریوں کا بھی تھا جو خدا اور قیامت کا قطعی منکر تھا۔ اُن کے سب لوگ منکر نہیں، بلکہ مشرک تھے۔ تاہم ایک طرح کی بے یقینی میں ضرور مبتلا تھے۔ چنانچہ قرآن نے جب اُنھیں انذار کیا اور اِس کے لیے عاد و ثمود اور اِس طرح کی دوسری قوموں کی تباہی کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کیا تو اُس کی ضد میں اُنھوں نے انکار کی یہ باتیں بھی کہنا شروع کر دیں۔ اِس طرح کے لوگ ہمارے زمانے کے مسلمانوں میں بھی موجود ہیں جو مسلمان ہی کہلاتے ہیں، مگر اُن سے بحث کیجیے تو بغیر کسی تردد کے یہی کچھ کہہ دیں گے۔

۴۲؎ قرآن نے یہ حجت کا لفظ بطور طنز استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِن کے پاس سرے سے کوئی حجت ہوتی ہی نہیں۔ تاہم کسی چیز کو حجت کہنا ہی ہے تو وہ یہ ہوتی ہے۔

۴۳؎ اصل میں 'اِلٰی' ہے۔ 'یَجۡمَعُکُمۡ' کے بعد یہ اتصال اور تسلسل کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی یہ کام ہو رہا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، تم کو جمع کرے گا۔[۴۴] مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں[۴۵]۔ ۲۴-۲۶

(یہ اپنے شریکوں پر بھروسا کیے بیٹھے ہیں تو یہ اِن کا خیال خام ہے)۔ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اُس دن یہ اہل باطل بڑے خسارے میں پڑیں گے۔ اُس وقت تم دیکھو گے کہ ہر گروہ اپنا فیصلہ سننے کے لیے دوزانو بیٹھا ہوا ہے۔ ہر گروہ کو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے کے لیے پکارا جائے

۴۴؎ یہ قرآن نے اُن کے جواب میں اصل دعوے کی یاددہانی کرائی ہے اور ایسے اسلوب میں کرائی ہے کہ اُس کی دلیل بھی واضح ہوگئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”یعنی جب زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے انکار کی کوئی گنجایش نہیں ہے تو یہ سوال تو خارج از بحث ہوا کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ آخر جس نے زندہ کیا ہے، وہ دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟ اور جب اپنے پیدا کیے ہوئے کو موت بھی اُسی نے دی ہے، کسی اور نے نہیں دی ہے تو وہ اگر اُس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہے تو اُس کے اِس ارادے میں کس کی طاقت ہے کہ مزاحم ہو سکے؟ مزاحمت تو جب ہو سکتی کہ زندگی پر کسی کا اختیار ہوتا اور موت پر کسی اور کا۔ لیکن ناقابل تردید دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ اِس قسم کی ثنویت سے یہ کارخانۂ کائنات بالکل پاک ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اِس کے اوپر ایک ہی ارادہ کارفرما ہے۔“ (تدبر قرآن ۷/۳۲۹)

۴۵؎ یعنی اِس بات کو نہیں جانتے کہ اِس واضح حقیقت کا انکار اُن کے لیے کیا نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۟ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾

گا۔ اُن سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو، آج تمھیں اُس کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہمارا دفتر ہے جو تمھارے اوپر ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا، اِس لیے کہ جو کچھ تم کرتے تھے، اُسے ہم لکھواتے رہے ہیں۔ ۲۷-۲۹

پھر جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے تھے، اُن کو اُن کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔[۴۶] یہی درحقیقت کھلی کامیابی ہے۔ رہے وہ جنھوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اُن سے کہا جائے گا: اچھا تو میری آیتیں کیا تمھیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟[۴۷] (یقیناً سنائی جاتی تھیں)، مگر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔ تم سے جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے، قیامت کیا ہے۔ ہاں، کچھ گمان سا ضرور رکھتے ہیں، لیکن اُس کا یقین ہم کو نہیں ہے۔[۴۸] ۳۰-۳۲

۴۶؎ یعنی صرف اعمال ہی کا بدلہ نہیں ملے گا، بلکہ اِس کے ساتھ اُن کے پروردگار کی بے پایاں رحمت اور بے نہایت فضل بھی ہو گا جس کا کوئی تصور یہاں نہیں کیا جا سکتا۔

۴۷؎ یہ سوال، ظاہر ہے کہ جواب حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ رسوائی اور ملامت کے لیے ہو گا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ

اُس وقت اِن کے اعمال کی برائیاں اِن پر کھل جائیں گی اور جس کی ہنسی اڑاتے تھے، وہی چیز اِن کو گھیر لے گی۔ اِن سے کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو بھلا دیں گے[۴۹]، جس طرح تم نے اپنے اِس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔ تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور اب تمھاری کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے[۵۰]۔ یہ اِس لیے ہوا کہ تم نے

الجاثیہ
۴۵

۴۸۔ مطلب یہ ہے کہ محض گمان کی بنا پر ہم قیامت جیسی چیز کو نہیں مان سکتے۔ اِس کے لیے یقینی علم چاہیے اور یہ اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہمارے جو باپ دادا رخصت ہو چکے ہیں، اُن میں سے کسی کو زندہ کر کے پیش کیا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...ظاہر ہے کہ یہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ تھا۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان صرف اُسی چیز کو مانے جو اُس نے آنکھوں سے دیکھی ہو۔ اِس کے علاوہ کسی بات پر بھی یقین نہ کرے، خواہ اُس کے حق میں کتنے ہی واضح عقلی و اخلاقی دلائل موجود ہوں۔ اگر انسان اِس حد تک سفاہت پر اتر آئے تو پھر عقل ایک بالکل فالتو چیز بن کے رہ جاتی ہے۔ بلکہ آدمی اور بیل میں پھر شکل و صورت کے سوا کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ اِس کے معنی تو یہ ہوئے کہ انسان اپنے اندر عقل کے وجود کو بھی تسلیم نہ کرے، اِس لیے کہ عقل کو بھی نہ اُس نے دیکھا ہے، نہ چھوا ہے۔ انسان کے پاس علوم کا جو سرمایہ ہے، اُس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اُس کا بہت بڑا حصہ عقلی اور اخلاقی اصولوں ہی پر مبنی ہے۔ اگر محسوس پرستی کا وہ نظریہ مان لیا جائے جو اِن مستکبرین کے سامنے تھا تو دوسرے الفاظ میں اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ سارے علوم دفن کر دیے جائیں جو انسان نے اب تک پیدا کیے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۳۳۱)

۴۹۔ یعنی نظر انداز کر دیں گے اور تم کتنا ہی چیختے چلاتے رہو، تمھاری کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔

اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

سورة الاحقاف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾

اللہ کی آیتوں کو مذاق بنا لیا اور دنیا کی زندگی نے تمھیں دھوکے میں ڈالے رکھا۔ لہٰذا[۵۱] آج نہ یہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ اِن کو موقع دیا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کر لیں۔ سو شکر اللہ ہی کے لیے ہے، آسمانوں کے پروردگار اور زمین کے پروردگار، تمام عالم کے پروردگار کے لیے۔ زمین اور آسمانوں میں اُسی کی بڑائی ہے اور وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۵۲]۔ ۳۳-۳۷

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

یہ سورۂ 'حٰمٓ' ہے[۵۳]۔ اِس کتاب کی تنزیل اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے،

۵۰ یعنی نہ تمھارے مزعومہ شرکا، نہ شفعا جن پر تم بھروسا کیے بیٹھے رہے۔

۵۱ یہاں سے آگے اسلوب دفعتاً غائب کا ہو گیا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ اعراض پر دلیل ہوتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، گویا نظر انداز کیے جانے کی جو دھمکی اُنھیں دی گئی تھی، اُس کا عمل شروع ہو گیا، یہاں تک کہ وہ اس قابل بھی نہیں رہے کہ اُن کو خطاب کر کے کوئی بات کہی جائے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳﴾

بڑی حکمت والا ہے۔ ۱-۲

زمین اور آسمانوں کو اور جو اُن کے درمیان ہیں، ہم نے غایت کے ساتھ اور ایک مقرر مدت ہی کے لیے پیدا کیا ہے[۵۴] اور یہ منکرین اُس حقیقت سے اعراض کیے

۵۲۔ سورہ کی ابتدا سے یہاں تک جو کچھ فرمایا ہے، یہ اُس ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے اور دیکھیے کہ کس شان کے ساتھ سامنے رکھا ہے۔

۵۳۔ پچھلی سورتوں کی طرح اِس سورہ کا نام بھی 'حٰمٓ' ہے۔ یہ اشتراک مطالب پر دلیل ہے اور قرآن کا ہر طالب علم اِسے تمام حوامیم میں بالکل نمایاں دیکھ سکتا ہے۔ اِس نام کے معنی کیا ہیں؟ اِس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۱ کے تحت بیان کر دیا ہے۔ اِس کے بعد تمہید کی آیت ہے جس کی وضاحت پچھلی سورہ الجاثیہ (۴۵) کی تفسیر میں اِسی جگہ ہو چکی ہے۔

۵۴۔ چنانچہ اِس کا بدیہی تقاضا ہے کہ یہ لازماً اپنے انجام کو پہنچے اور اُس عدلِ کامل کا ظہور ہو جس کی احتیاج ہر انسان ہوا اور پانی سے بھی بڑھ کر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہ بات تو معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کی جزا یا سزا پائے، لیکن اِس کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ یہ پوری دنیا ایک معین مدت کے بعد ختم ہو جائے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ برابر قائم بھی رہے اور جو مرتے جائیں، اُن کی عدالت بھی ہوتی رہے؟ یہ سوال یوں تو ذہن میں متعدد غلط فہمیوں کے موجود ہونے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے جن پر یہاں بحث کے لیے گنجایش نہیں ہے، لیکن ایک چیز کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے، وہ یہ کہ انسان کا ہر عمل، خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا، اپنے اندر متعدی ہونے کی خصوصیات رکھتا ہے۔ ایک شخص ایک نیکی کا تخم بوتا ہے جس کی برکتوں سے صدیوں اور قرنوں تک اولادِ آدم مستفید ہوتی ہے، اِسی طرح ایک شخص ایک غلط اور گم راہ کن فلسفہ ایجاد کرتا ہے جس کی ضلالت ایک خلق کثیر کو اپنی لپیٹ میں لے

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ

ہوئے ہیں، جس سے اِنھیں خبردار کیا گیا ہے۔[55] ۳

(یہ کس بھروسے پر اعراض کر رہے ہیں)؟ اِن سے کہو، کبھی تم نے غور بھی کیا ہے کہ خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو، ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ اُنھوں نے زمین میں کیا بنایا ہے یا اُن کا آسمانوں میں کچھ ساجھا ہے (کہ اُنھیں معبود بنالیا جائے)؟ اِس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے سامنے پیش کرو یا کوئی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو، اگر

لیتی ہے اور پھر وہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اتنی مستحکم ہوتی جاتی ہے کہ اُس کو اکھاڑنا تو درکنار، قوموں کے بعد قومیں اٹھتی اور اپنی صلاحیتیں اُس کو پروان چڑھانے پر صرف کرتی ہیں۔ اِس صورت حال کے سبب سے کسی کی نیکی یا بدی کا صحیح اندازہ اُس کو کرانا ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اِن کے بعید سے بعید اثرات اُس کے سامنے لائے جائیں اور عناصر کائنات میں سے جو بھی اُس کی کسی نیکی یا بدی کے گواہ ہوں، اُن کو پیش کیا جائے۔ اِس کے بغیر کامل عدل ظہور میں نہیں آسکتا۔ اِس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ ایک دن اِس دنیا کی مدت پوری ہو اور اللہ تعالیٰ ایک ایسی عدالت میں لوگوں کا فیصلہ فرمائے جس میں سب حاضر ہوں۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین سے بھی اگر کسی معاملہ میں گواہی مطلوب ہو تو اُن کو بھی اِن کے سارے ریکارڈ کے ساتھ طلب کیا جائے۔ یہ چیز، ظاہر ہے کہ اُسی صورت میں ممکن ہے، جب سب کا روز انصاف ایک ہو۔'' (تدبر قرآن ۷/۳۴۵)

۵۵ یعنی قیامت سے، جس کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اِس کائنات کے 'بِالْحَقّ' ہونے کا بدیہی تقاضا ہے۔

الاحقاف ۴۶

يَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَنۡ لَّا يَسۡتَجِيۡبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ وَهُمۡ عَنۡ دُعَآئِهِمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۵﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوۡا لَهُمۡ اَعۡدَآءً وَّكَانُوۡا بِعِبَادَتِهِمۡ كٰفِرِيۡنَ ﴿۶﴾

وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلۡحَقِّ لَمَّا

تم سچے ہو[۵۶]۔ اُن سے بڑھ کر کون گم راہ ہوسکتا ہے جو اللہ کے سوا اُن کو پکارتے ہیں جو اُنھیں قیامت کے دن تک جواب دینے والے نہیں ہیں؟ اُن کو تو اِن لوگوں کی دعاؤں کی خبر بھی نہیں ہے[۵۷] اور اُس دن جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور اُن کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے۔ ۴-۶

اِنھیں جب ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ منکرین حق کے بارے

۵۶۔ شرک کے لیے کوئی عقلی دلیل نہ اِس سے پہلے پیش کی جاسکی ہے، نہ قیامت تک پیش کی جاسکتی ہے۔ اِس کے لیے صرف خدا ہی کی سند ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اِسی کا مطالبہ کیا ہے کہ اِس طرح کی سند یا خدا کی کسی کتاب سے پیش کی جاسکتی ہے یا انبیا علیہم السلام سے جو علم منتقل ہوا ہے، اُس کی کسی روایت سے۔ فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو اِن میں سے کوئی چیز پیش کرو۔ الہامی لٹریچر سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے کہ پیش کی جاسکے۔

۵۷۔ اِس لیے کہ کوئی نبی یا فرشتہ بھی ہو تو وہ بذات خود کسی کی دعا یا فریاد سے واقف نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ اُس کو قبول کرسکے۔ سورۂ مائدہ (۵) کے آخر میں مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو مکالمہ نقل ہوا ہے، اُس میں اُنھوں نے پوری صراحت کے ساتھ بتا دیا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے پیرووں نے جو کچھ کیا ہے، وہ اُس سے واقف نہیں ہیں۔

جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۷ؕ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۸

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۹

میں، جب کہ وہ اِن کے پاس آ گیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے[۵۸]۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اِسے خود گھڑ لیا ہے؟ اِن سے کہو کہ اگر میں نے اِس کو خود گھڑا ہے تو تم خدا کی پکڑ سے مجھے کچھ بھی بچا نہ سکو گے۔ تم جن باتوں میں لگے ہو، وہ اُن سے خوب واقف ہے۔ وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے اور (یہ مہلت جو تم کو ملی ہوئی ہے تو محض اِس لیے کہ) وہ بڑا درگذر کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۷-۸

اِن سے کہو، میں کوئی نیا رسول تو نہیں ہوں، (اِس سے پہلے بھی بشر ہی رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں)۔ اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمھارے ساتھ کیا، میں تو صرف اُس بات کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور میں تو صرف ایک کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ ۹

۵۸؎ یعنی زبان و بیان کی جادوگری ہے جو دلوں کو تسخیر کر لیتی ہے۔ یہ بات وہ اپنے لوگوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہتے تھے کہ وہ اِسے خدا کا کلام نہ سمجھیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اپنی بے مثل فصاحت و بلاغت اور وجد آفریں خطابت اور اپنے بلند مضامین اور دل و دماغ کو تسخیر کر لینے والے انداز بیان کے لحاظ سے یہ بڑے اونچے درجے کی چیز ہے، لیکن ہے اُسی نوعیت کی چیز جو اِس سے پہلے اُن کے شاعر اور خطیب پیش کرتے رہے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ

اِن سے پوچھو، کبھی سوچا بھی ہے کہ اُس وقت کیا ہوگا، اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہوا اور تم اِس کا انکار کر بیٹھے[۵۹] اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اِسی طرح کی ایک کتاب کے نازل ہونے کی گواہی بھی دے چکا ہے[۶۰]؟ سو اُس نے تو مان لیا اور

الاحقاف ۴۶

۵۹۔ اِس جملے میں جوابِ شرط محذوف ہے۔ الفاظ جب کسی شے کی عظمت یا ہول ناکی کے باعث اُس کی تعبیر سے قاصر ہوں تو اِسی طرح حذف کر دیتے ہیں۔

۶۰۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے جن کی بعثت کا مقصد ہی یہ تھا کہ آنے والے پیغمبر کی بشارت دیں۔ اُن پر جو کتاب نازل ہوئی، اُس کا نام اِسی بنا پر انجیل ہے جس کے معنی یونانی میں بشارت کے ہیں۔ اُنھوں نے یہ بشارت آپ کے نام کی تصریح کے ساتھ دی، جیسا کہ سورۂ صف میں بیان ہوا ہے اور آپ کی صفات اور آپ کی دعوت کے مدارج و مراحل کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں فرمایا۔ اِس کے شواہد انجیلوں میں جگہ جگہ دیکھ لیے جا سکتے ہیں۔ اُن کے سچے پیرووں نے، جو اصل نصرانیت پر قائم تھے، اِنھی شواہد کی بنا پر پورے جوش و خروش کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور آپ پر ایمان لائے۔ سیدنا مسیح نے فرمایا:

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے، یعنی روحِ حق۔'' (یوحنا ۱۴: ۱۶-۱۷)

''...لیکن مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمھیں یاد دلا دے گا۔'' (یوحنا ۱۴: ۲۶)

''اِس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں۔'' (یوحنا ۱۴: ۳۰)

اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾
وَ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَوۡ کَانَ خَیۡرًا مَّا سَبَقُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ ؕ وَ اِذۡ لَمۡ یَہۡتَدُوۡا بِہٖ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَاۤ اِفۡکٌ قَدِیۡمٌ ﴿۱۱﴾

تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۱۰

یہ منکرین[۶۱] ایمان والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر یہ قرآن کوئی اچھی چیز ہوتا تو (ادنیٰ درجے کے) یہ لوگ ہم سے پہلے اِس کی طرف نہ دوڑتے۔ اور مزید یہ کہ جب اِس قرآن سے اِنھوں نے ہدایت نہیں پائی تو اب کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے[۶۲]۔ ۱۱

''... لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی روحِ حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔'' (یوحنا ۱۵: ۲۶)

''... لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا۔'' (یوحنا ۱۶: ۷)

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ، یعنی روحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اِس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔''

(یوحنا ۱۶: ۱۲-۱۳)

۶۱؎ یعنی قریش کے اغنیا اور مستکبرین جن کے استکبار کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

۶۲؎ یعنی ایسا جھوٹ ہے جو قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اور جس کا جھوٹ ہونا بالکل ثابت ہو چکا ہے، اِس لیے کہ ایک مدتِ دراز سے ہم اِسے سن رہے ہیں، لیکن دیکھ سکتے ہو کہ صدیاں گزر گئی ہیں اور وہ قیامت، معلوم نہیں کہاں رہ گئی ہے!

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١٣﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ

اِس سے پہلے موسیٰ کی کتاب موجود ہے، رہنما اور رحمت[۶۳]۔ اور یہ کتاب اُس کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے، عربی زبان میں[۶۴]، اِس لیے کہ جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے، اُنھیں خبردار کرے اور اُن کے لیے خوش خبری ہو جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں[۶۵]۔ ۱۲

یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر (تمام مخالفتوں کے باوجود) اُس پر جمے رہے تو اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ کبھی آزردہ خاطر ہوں

۶۳؎ یعنی دنیا میں رہنما اور جب قیامت برپا ہوگی تو اپنے ماننے والوں کے لیے رحمت۔

۶۴؎ یہ مخاطبین پر احسان بھی ہے جن کی زبان عربی ہے کہ خدا نے اُنھی کی زبان میں اُن پر اپنی حجت پوری کر دی اور پورے عالم کے لیے اِسی زبان کو اپنے دین کی ترجمانی اور اُس کی گواہی کے لیے منتخب فرمایا اور تورات کی اُن پیشین گوئیوں کی طرف ایک لطیف اشارہ بھی جن میں کہا گیا ہے کہ آخری نبی کی بعثت بنی اسمٰعیل میں ہوگی جن کی زبان، ظاہر ہے کہ عربی تھی۔

۶۵؎ یہ الفاظ 'اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' کے مقابل میں آئے ہیں، لہٰذا یہاں خوبی سے عمل کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے خدا سے سرکشی اختیار کر کے اپنے آپ کو کسی ہلاکت میں نہیں ڈالا اور اِس طرح اپنی جان پر ظلم ڈھانے کے بجائے اُس کو دوزخ کی آگ سے بچا لیا۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾
وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ

گے۔[٦٦] یہی جنت کے لوگ ہیں، اُس میں ہمیشہ رہیں گے، اپنے اعمال کے صلے میں جو وہ کرتے رہے۔ ١٣-١٤

(تم سمجھنا چاہتے ہو کہ لوگ کس طرح خوبی سے عمل کرنے والے اور کس طرح اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے بنتے ہیں تو سنو)۔ ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کر رکھی ہے۔[٦٧] اُس کی ماں نے بڑی مشکل سے اُس کو اپنے پیٹ میں رکھا اور بڑی مشکل سے اُس کو جنا اور اُس کا پیٹ میں رکھنا اور اُس کا دودھ چھڑانا (کم و بیش) تیس مہینوں میں ہوا۔[٦٨] یہاں تک کہ (اِن سب

٦٦۔ یعنی نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی غم، جبکہ دنیا کی زندگی، اگر غور کیجیے تو اِنھی اندیشوں اور اِنھی غموں سے عبارت ہے۔ چنانچہ جنت کی زندگی کے لیے یہ نہایت جامع تعبیر ہے اور قرآن میں جگہ جگہ اختیار کی گئی ہے۔

٦٧۔ یہ ہدایت انسان کی فطرت میں بھی ودیعت ہے اور اللہ کے تمام نبیوں اور رسولوں نے بھی اِسی کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ انسان کے اندر اخلاقی شعور کی ابتدا جو درحقیقت اداے حقوق کا شعور ہے، اِسی سے ہوتی ہے۔

٦٨۔ یہ اُن قربانیوں اور جان بازیوں کا حوالہ ہے جو ہر ماں کو اپنی اولاد کے لیے لازماً کرنی پڑتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ حسن سلوک کا مطالبہ تو ماں باپ، دونوں ہی کے لیے

اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ

مراحل سے گزر کر) جب انسان اپنی پختگی کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے[۶۹]
تو دعا کرتا ہے کہ میرے پروردگار، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کروں

کیا گیا ہے، لیکن تین قربانیاں جو مذکور ہوئی ہیں، وہ صرف ماں ہی کی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اِس کے وجوہ ہمارے نزدیک درج ذیل ہیں:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ فی الواقع اولاد کی ابتدائی پرورش و پرداخت میں جو حصہ ماں کا ہوتا ہے، وہ باپ کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدمت کے معاملے میں ماں کا حق باپ کے بالمقابل تین گنا رکھا ہے۔* یہ حدیث اِسی آیت پر مبنی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ماں کا تعلق جنس ضعیف سے ہے۔ اِس کا یہ پہلو بھی متقاضی ہے کہ اولاد اُس کی خدمت و اطاعت باپ سے بھی زیادہ کرے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ باپ سے بالعموم اولاد کا مادی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ اُن کو اُس سے جایداد و املاک وراثت میں ملنے والی ہوتی ہیں۔ اِس سبب سے اُس کے معاملے میں کوتاہی یا نافرمانی کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔ برعکس اِس کے ماں سے عام حالات میں اِس طرح کی توقع کم ہی ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے وہ لوگ ماں کی حقیقی قدر نہیں کرتے جن کے اندر اُس کی قربانیوں کا صحیح شعور نہیں ہوتا۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۳۶۲)

۶۹؎ یہ وہ زیادہ سے زیادہ عمر ہے جس کو پہنچ کر آدمی کو راہوار نفس پر قابو پا لینا چاہیے اور اُس کے اندر وہ پختگی پیدا ہو جانی چاہیے جو اُس کے خالق کو مطلوب ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اِس عمر سے پہلے اگر آدمی دنیا سے رخصت ہو جائے تو اپنے خالق سے وہ کچھ رعایت کی توقع کر سکتا ہے۔

* بخاری، رقم ۵۹۷۱۔ مسلم، رقم ۶۵۰۰۔

الاحقاف ۴۶

الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿١٥﴾

جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر فرمایا[70] اور وہ نیک عمل کروں جو تجھے پسند ہیں[71]۔ اور تو میری اولاد میں بھی میرے لیے نیک بختی پیدا کر دے۔ میں تیری طرف رجوع لایا اور بے شک، میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ یہی لوگ

الاحقاف
۴۶

۷۰۔ اِس سے واضح ہوا کہ انسان اگر اپنی فطرت کو مسخ نہ کرے تو جس ادائے حقوق کا شعور ماں باپ کا حق پہچاننے سے پیدا ہوتا ہے، وہی بتدریج انسان کو اُس منعم حقیقی تک پہنچا دیتا ہے جو اُس کا اور اُس کے ماں باپ کا خالق ہے۔ اِس لیے کہ ماں باپ کی شفقت و محبت اور پرورش و پرداخت میں وہ اُس پروردگاری اور مہر و محبت کی ایک جھلک دیکھ لیتا ہے جو شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ کائنات کی ہر چیز میں دیکھتا ہے۔ پھر اِسی سے منعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے جس سے تمام دین و شریعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جب تک انسان بچہ رہتا ہے، اُس وقت تک وہ سب کچھ ماں باپ ہی کو سمجھتا ہے، اِس لیے کہ وہ جو کچھ بھی پاتا ہے، اُنھی سے پاتا ہے۔ لیکن جب وہ سن رشد کو پہنچتا ہے تو اُس پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصلی منعم و پروردگار وہ ہے جس نے ماں باپ کو بھی وجود بخشا۔ اِس طرح وہ ماں باپ کی انگلی پکڑ کر خدا تک پہنچ جاتا ہے اور اُس کے اندر ماں باپ کے حق سے بھی بڑے حق کا شعور پیدا ہوتا ہے اور یہی دو حق انسان پر سب سے بڑے ہیں اور پھر اِنھی دو سے بہت سے حقوق کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۳۶۱)

۷۱۔ یہ شرط اِس لیے ضروری ہے کہ بعض اوقات انسان کوئی کام اپنے گمان کے مطابق خدا کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے، لیکن وہ خدا کے غضب کا باعث بن جاتا ہے، جیسے عبادت میں شرک یا بدعت کی آمیزش جس کے ساتھ اندیشہ ہے کہ نیک عمل بھی قبول نہ کیا جائے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ ۖ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۷﴾

ہیں کہ جن کے اچھے عمل ہم اُن سے قبول کریں گے اور جن کی برائیوں سے درگذر فرمائیں گے کہ جنت والوں میں ہوں گے۔ یہ سچا وعدہ[2] ہے جو اِن سے کیا جاتا رہا ہے۔۱۵-۱۶

اِس کے برخلاف جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم پر تف ہے، کیا تم مجھے اِس سے ڈراتے ہو کہ میں (دوبارہ زندہ کرکے) قبر سے نکالا جاؤں گا[3]، جب کہ مجھ سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی نکل کر نہیں آیا؟ ماں باپ اللہ کی دہائی دیتے ہیں کہ تیرا ناس ہو[4]، ایمان لا، یقیناً اللہ کا وعدہ برحق

۲؎ اصل میں 'وَعْدَ الصِّدْقِ' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں نصب مصدر کا ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے۔

۳؎ یہ اب اُن لوگوں کی تمثیل ہے جن کا اخلاقی شعور مادر پدر آزاد زندگی گزارنے کی وجہ سے مردہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب پختگی کی عمر کو پہنچتے ہیں تو خدا کو خود پہچان لینا تو درکنار، والدین توجہ دلائیں تو اُن کو بھی نہایت بے دردی کے ساتھ جھڑک دیتے ہیں۔ چنانچہ بالآخر اُنھی لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں جنھیں اوپر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے کہا گیا ہے۔

۴؎ اصل میں 'وَيْلَكَ' کا لفظ ہے۔ یہ اگرچہ لعنت کے الفاظ میں سے ہے، لیکن بعض موقعوں پر دردمندی، دل سوزی اور شفقت و محبت کے اظہار کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اِسی محل

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡقَوۡلُ فِيٓ أُمَمٖ قَدۡ خَلَتۡ مِن قَبۡلِهِم مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡإِنسِۖ إِنَّهُمۡ كَانُواْ خَٰسِرِينَ ﴿١٨﴾
وَلِكُلّٖ دَرَجَٰتٞ مِّمَّا عَمِلُواْۖ وَلِيُوَفِّيَهُمۡ أَعۡمَٰلَهُمۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَ ﴿١٩﴾ وَيَوۡمَ يُعۡرَضُ الَّذِينَ كَفَرُواْ عَلَى النَّارِ أَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبَٰتِكُمۡ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُم بِهَا فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ

ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ کچھ نہیں، یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات[5] پوری ہوگئی کہ اُنھی گروہوں میں شامل ہیں جو اِن سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے گزر چکے ہیں۔ بے شک، یہ نامراد ہونے والے ہی تھے۔ ۱۷-۱۸

اِن دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے لیے (قیامت میں) اُن کے عمل کے مطابق (اچھے یا برے) درجے ہوں گے، اِس لیے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو[6] اور اِس لیے کہ اِن کے اعمال وہ اِن کو پورے کر دے۔ (وہ یہی کرے گا) اور اِن پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ (لوگو)، اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ منکرین آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے اور اِن سے کہا جائے گا کہ تم اپنے حصے کی عمدہ چیزیں اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور تم نے وہاں اُن سے فائدہ اٹھالیا تو آج تم ذلت

میں ہے۔

۵ے یعنی وہ بات جو اللہ تعالیٰ نے روز ازل ابلیس کے جواب میں کہی تھی کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی تیری پیروی کریں گے، میں اُن سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

۶ے یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جو اصل میں محذوف ہے۔

عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿٢٠﴾

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ

کا عذاب بدلے میں پاؤ گے، اِس وجہ سے کہ بغیر کسی حق کے تم زمین میں تکبر کرتے رہے اور اِس وجہ سے کہ تم (خدا کی) نافرمانیاں کرتے رہے۔ ۱۹-۲۰

اِنھیں عاد[۷۷] کا بھائی (ہود) یاد دلاؤ، (اے پیغمبر)، جب اُس نے احقاف[۷۸] میں

الاحقاف
۴۶

۷۷؎ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن، جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے، احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود اِنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے اِن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن نے امتنان و احسان کے لیے فرمایا ہے کہ عاد کی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ اُنھی کے بھائی کو بھیجا تا کہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۷۸؎ عربی زبان میں احقاف، حقف کی جمع ہے جس کے معنی ریت کے ٹیلے کے ہیں جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچا ہو۔ اِس نام سے یہ علاقہ غالباً عاد کے زوال کے بعد موسوم ہوا، جب قوم عاد کی بنائی ہوئی شان دار عمارتیں ختم ہو گئیں اور صرف ریت کے ٹیلے رہ گئے۔ قرآن نے اِس کا ذکر اِس نام سے جس بنا پر کیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”... اِس نام سے ذکر کر کے قرآن نے یہاں اُس عظیم تباہی کی طرف توجہ دلائی ہے جو اِس علاقے پر آئی۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں قوم عاد یہاں اپنے عروج پر تھی، اُس زمانے میں یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور اُن عظیم تمدنی کارناموں سے معمور رہا ہو گا جن کے

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٢١﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٢﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٣﴾

اپنی قوم کو خبردار کیا اور اُس کے آگے اور پیچھے (کے علاقوں میں) خبردار کرنے والے گزر چکے تھے۔ اُس نے خبردار کیا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، میں تم پر ایک ہول ناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں[۷۹]۔ اُنھوں نے جواب دیا: کیا ہمارے پاس اِس لیے آئے ہو کہ جھوٹ بول کر ہمارے معبودوں سے ہمیں برگشتہ کر دو[۸۰]؟ سو اگر تم سچے ہو تو ہم پر لے آؤ وہ عذاب جس کی تم ہمیں دھمکی سنا رہے ہو۔ اُس نے کہا: (وہ کب آئے گا)؟ اِس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ مجھے تو جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے، میں وہی تمھیں پہنچا رہا ہوں۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بالکل جہالت میں مبتلا ہو۔ ۲۱-۲۳

سبب سے قوم عاد کو تاریخ میں ایک خاص شہرت وعظمت حاصل ہوئی۔ لیکن اب وہی مقام ہے، جہاں ایک لق و دق صحرا ہے جس کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں تعمیر و تمدن کا بھی کوئی نقش قائم ہوا ہوگا۔'' (تدبر قرآن ۷/۳۷۰)

۷۹۔ توحید پر ایمان کی یہ وہی دعوت ہے جو خدا کے ہر رسول نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی ہے۔

۸۰۔ اصل میں لفظ 'اِفك' آیا ہے۔ اِس کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں، لیکن اِس کے بعد 'عَنْ' ہے جو اِس بات کا قرینہ ہے کہ یہ پھیرنے یا برگشتہ کرنے کے معنی میں کسی فعل پر متضمن ہو گیا ہے۔

الاحقاف
۴۶

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ

پھر جب اُنھوں نے اُس عذاب کو، (جس کی دھمکی اُنھیں دی گئی تھی)، دیکھا کہ ایک بادل ہے جو اُن کی وادیوں کی طرف امڈا چلا آرہا ہے تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہمیں سیراب کرنے والا ہے۔نہیں، بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔تند ہوا جس میں دردناک عذاب ہے۔ یہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تہس نہس کر دے گی۔ پھر وہ ایسے ہو گئے کہ اُن کے گھروں کے سوا وہاں کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ ہم مجرم لوگوں کو اِسی طرح سزا دیتے ہیں۔۲۴-۲۵

ہم نے اُن چیزوں میں اُنھیں قدرت دی تھی، جن میں، (اے قریش مکہ)، تمھیں قدرت نہیں دی ہے اور ہم نے اُن کو کان اور آنکھیں اور دل عطا فرمائے[۸۱]، لیکن اِس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، نہ اُن کے یہ کان اُن کے کچھ کام آئے، نہ

۸۱؎ یعنی وہ تمام صلاحیتیں بخشیں جو انسان کا اصلی شرف ہیں اور حقائق تک پہنچنے اور اُن سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اُسے عطا فرماتا ہے۔

مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا

اُن کی آنکھیں اور نہ اُن کے دل[۸۲] اور اُن کو اُسی چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے تھے۔ (پھر یہی نہیں)، تمھارے گردو پیش کی بستیاں بھی ہم نے اِسی طرح تباہ کر دی تھیں[۸۳] اور (اِس سے پہلے) اپنی آیتیں اُن کے لیے گونا گوں پہلوؤں سے پیش کی تھیں، (جس طرح تمھارے لیے پیش کر رہے ہیں) تاکہ وہ رجوع کریں۔ پھر (سوچو کہ) اُن ہستیوں نے کیوں نہ اُن کی مدد کی جن کو اُنھوں نے خدا کے سوا اُس کے تقرب کے لیے معبود بنا رکھا تھا؟ بلکہ وہ تو اُن سے کھوئے گئے[۸۴]۔ یہ سب اُن کا جھوٹ اور اُن کا افترا تھا جو وہ کرتے رہے۔ ۲۶-۲۸

اور اِنھیں وہ واقعہ بھی سناؤ، جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف

۸۲۔ اِس لیے کہ اُنھوں نے اُن کو محسوسات تک رسائی ہی کے لیے استعمال کیا، اُن کے پس پردہ حقائق تک پہنچنے کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا۔

۸۳۔ یہ اُن بستیوں کی طرف اشارہ ہے جن پر سے قریش اپنے تجارتی سفروں میں گزرتے رہتے تھے۔

۸۴۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ تم جن پر بھروسا کیے بیٹھے ہو، خدا کا فیصلہ صادر ہو گا تو وہ بھی اسی طرح کھوئے جائیں گے۔

حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا

متوجہ کر دیا[۸۵] کہ وہ قرآن سنیں۔ سو جب وہ اُس جگہ پہنچے، (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو اُنھوں نے آپس میں کہا: خاموش رہو (اور سنو)[۸۶]۔ پھر جب اُس کا پڑھنا تمام ہوا تو وہ اپنی قوم کی طرف لوٹے کہ اُن کو خبردار کریں[۸۷]۔ اُنھوں نے کہا: ہماری

۸۵۔ یہ کس طرح متوجہ ہوئے؟ سورۂ جن (۷۲) میں اِس کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ اِنھوں نے عالم بالا میں کچھ غیر معمولی صورت حال دیکھی تو اِنھیں خیال ہوا کہ شاید دنیا والوں کے ساتھ کوئی اہم معاملہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ اِسی جستجو میں پھرتے پھراتے اُس جگہ آ نکلے، جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھ رہے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طائف والوں کے رویے سے سخت کبیدہ خاطر ہو کر حضور واپس جا رہے تھے کہ آپ نے نخلہ کے مقام پر چند دنوں کے لیے قیام فرمایا۔ رات کی نمازوں میں قرآن کی تلاوت آپ کا معمول تھا۔ خدا کی کارسازی سے یہ ٹھیک اُسی موقع پر آپ کی طرف متوجہ ہوئے، جب آپ تلاوت کر رہے تھے اور وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر یہاں ہوا ہے۔

۸۶۔ اِس حسن ادب کا حوالہ غالباً اِس لیے دیا گیا ہے کہ مکہ اور طائف کے اُن گنڈوں کو تنبیہ ہو جو آپ سے بدتمیزیاں کرتے اور قرآن سنتے ہی غل مچا دیتے تھے کہ یہ لاہوتی کلام کسی کے کانوں میں نہ پڑے۔

۸۷۔ یہ اُن کی سلامتی طبع کی دلیل ہے کہ جس حق کو پایا، تمام خطرات سے بے پروا ہو کر اُسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، جب کہ قریش کے اکابر شب و روز قرآن کا مذاق اڑا رہے تھے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اِس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح انسانوں کے پیغمبر تھے، اُسی طرح جنوں کے بھی پیغمبر تھے، بلکہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حق جہاں اور جس صورت میں بھی سامنے آئے، دنیا کی ہر ذی شعور مخلوق اُسے ماننے

بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٠﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ

قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے[88]، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو (اُس کے متعلق) اُس سے پہلے موجود ہیں[89]۔ یہ حق کی ہدایت دیتی اور ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے[90]۔ ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو اور اُس پر ایمان لاؤ، وہ تمھارے گناہوں

الاحقاف ۴۶

کی مکلّف ہے۔ چنانچہ جنوں کے کسی پیغمبر کی دعوت اگر ہم بھی سن سکتے تو اُس پر اُسی طرح ایمان کے مکلّف ہوتے، جس طرح جنوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے پیغمبروں پر ہمارے ایمان کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ہم اُن کی شریعت کے پابند تو یقیناً نہیں ہیں، لیکن اُنھیں ماننا ہمارے لیے بھی اُسی طرح ضروری ہے، جس طرح اُن کی قوموں کے لیے ضروری تھا۔

۸۸۔ زبور، انجیل اور انبیاے بنی اسرائیل کے صحائف اگرچہ تورات کے بعد نازل ہوئے، لیکن اُن کی حیثیت اُس کے تکملہ وتتمہ کی تھی۔ لہٰذا قرآن سے پہلے اصل کتاب تورات ہی تھی۔ جنوں نے یہ بات اِسی بنا پر کہی ہے۔

۸۹۔ یہ قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے جو جنات نے غالباً قرآن ہی سے سن کر آگے نقل کی ہے۔

۹۰۔ یعنی توحید کی راہ، اِس لیے کہ توحید ہی وہ عقیدہ ہے جو حقیقت کے مطابق اور ہر لحاظ سے عقل وفطرت کے موافق ہے۔ اِسے سیدھی راہ اِس وجہ سے کہا ہے کہ یہ آسان، ہموار اور ہر کج پیچ سے بالکل پاک ہے۔ اِس میں مشرکانہ عقائد کی بھول بھلیاں کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾

وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ

میں سے معاف فرمائے گا (جو اُس کے قانون کے مطابق معاف کیے جا سکتے ہیں)[91] اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ ۲۹-۳۱

اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہیں کرے گا، اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ زمین میں (کہیں بھاگ کر) خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتا اور نہ (قیامت کے دن) خدا کے سوا اُس کے کوئی حمایتی ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح کے لوگ ہیں جو کھلی گم راہی میں ہیں۔ کیا اِنھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ، جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور اُن کے پیدا کرنے میں اُس کو ذرا تکان نہیں ہوئی، وہ

۹۱؎ یعنی، مثال کے طور پر، وہ گناہ جو حقوق العباد سے متعلق نہ ہوں کہ اُن کی تلافی ضروری ہو جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اگر اِن کی تلافی نہیں کی گئی ہے یا تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ یہ معاملہ فریقین کی موجودگی میں آخرت کی عدالت میں پیش ہو۔ وہاں کیا فیصلہ ہو گا، یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ تلافی کا موقع ہوتے ہوئے اگر تلافی نہیں کی گئی ہے تو یہ چیز ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے، اور اگر تلافی کا موقع ہاتھ سے نکل جا چکا ہے تو امید ہے کہ آدمی کا سچا احساس، سچی توبہ، سچی ندامت اور اُس کی وہ نیکیاں اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کے لیے سفارشی بنیں جو وہ اپنے جرائم کی تلافی کے لیے اپنی بعد کی زندگی میں مرتے دم تک کرے گا۔" (تدبر قرآن ۷/ ۳۷۹)

اِس کے بعد فرمایا کہ "اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔" آگے اللہ تعالیٰ کی

بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۳﴾ وَ یَوۡمَ یُعۡرَضُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَلَی النَّارِ ؕ اَلَیۡسَ ہٰذَا بِالۡحَقِّ ؕ قَالُوۡا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّہُمۡ ؕ کَاَنَّہُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَ مَا یُوۡعَدُوۡنَ ۙ لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَۃً مِّنۡ

اِس پر بھی قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔۳۲-۳۳

(لوگو)، اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ منکرین دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے۔ اِن سے پوچھا جائے گا: کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ یہ کہیں گے: ہاں کیوں نہیں، ہمارے پروردگار کی قسم، (ضرور حقیقت ہے)۔ ارشاد ہوگا: تو چکھو اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا مزہ جو تم کرتے رہے تھے[۹۲]۔۳۴

سو، (اے پیغمبر)، ثابت قدم رہو، جس طرح اولوالعزم پیغمبر ثابت قدم رہے اور اِن کے لیے (عذاب کی) جلدی نہ کرو۔ جس دن یہ لوگ اُس چیز کو دیکھیں گے جس کی اِنھیں وعید سنائی جارہی ہے تو محسوس کریں گے کہ گویا دن کی ایک گھڑی

طرف سے تضمین ہے، جنوں کی بات ہمارے نزدیک اِس جملے پر ختم ہوگئی ہے۔

۹۲ قیامت کا انکار ایک بدیہی حقیقت کا انکار ہے جو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی باگ خواہشات نفس کے ہاتھ میں دے رکھی ہو۔ چنانچہ یہ محض ایک بات کا انکار نہیں، بلکہ عقل وفطرت اور خدا کے سب پیغمبروں کی تکذیب ہے جس کے مرتکبین کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

سے زیادہ (دنیا میں) نہیں رہے۔ تمھارا کام پہنچا دینا ہے[۹۳]۔ اب ہلاک تو وہی لوگ ہوں گے جو نافرمان ہیں[۹۴]۔ ۳۵

۹۳ اصل میں 'بَلٰغ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ مبتداے محذوف کی خبر ہے۔ اِس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ اِس سے ساری توجہ خبر پر مرکوز ہوگئی ہے۔

۹۴ یعنی جس عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں، اگر وہ آیا تو کوئی اور نہیں، اُس سے وہی لوگ ہلاک ہوں گے جو خدا کے مقابلے میں اِس طرح سرکش ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں۔

کوالالمپور

۷ ستمبر ۲۰۱۴ء

مرحلۂ تزکیہ و تطہیر

محمد - الحجرات

۴۷ —— ۴۹

محمد - الفتح

٤٧ ــــــ ٤٨

محمد ـ الفتح

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں جو لوگ آپ پر ایمان لے آئے تھے، اُن کے علم و عمل کا تزکیہ اور اُن کی جماعت کی تطہیر ہے۔ اِس کے ساتھ اُنھیں آخرت میں جنت اور دنیا میں فتح و نصرت کی بشارت بھی نہایت واضح الفاظ میں دی گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ منکرین اور مکذبین کی ہزیمت اور اُن کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

اِن سورتوں میں خطاب اصلاً اہل ایمان سے ہے اور اِن کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینہ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ و تطہیر میں اُس وقت نازل ہوئی ہیں، جب منکرین حق کے خلاف فیصلہ کن اقدام میں کچھ زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔

سورة محمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۱﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ ﴿۲﴾

محمد
۴۷

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اُن کے اعمال اللہ نے رایگاں کر دیے ہیں[۱]۔ اور جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے اور اُس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل کی گئی ہے[۲] ـــــ اور اُن کے پروردگار کی طرف سے وہی حق ہے

[۱] سورۂ احقاف (۴۶) منکرین حق کے لیے جس تہدید و وعید پر ختم ہوئی ہے، یہ سورہ بغیر کسی تمہید کے اُسی مضمون سے شروع ہوگئی ہے۔ اعمال کے رایگاں کرنے کا جو ذکر یہاں ہوا ہے، اُس سے مراد اُن کی کوششوں کا رایگاں کرنا ہے جو وہ لوگوں کو خدا کے راستے سے روکنے کے لیے کر رہے تھے۔ یہ مستقبل کی بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کی قطعیت کو ظاہر کرنے کے لیے ماضی کے صیغے میں بیان کی گئی ہے۔

[۲] یعنی اُن لوگوں کے پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوئے جو کفر و اسلام میں سمجھوتے کی باتیں کر رہے تھے کہ کچھ گنجایش اُن کے لیے بھی تسلیم کر لی جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کے لیے اصرار نہ کیا جائے۔ اِس طرح کے لوگوں کا معاملہ پچھلی سورتوں میں بھی زیر بحث آ چکا ہے۔ آگے قرآن ہی کے حق ہونے کی تصریح بھی اِسی لیے کی گئی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ③ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى

——— اُن کی برائیاں اللہ نے اُن سے دور کر دیں اور اُن کا حال درست کر دیا ہے[۳]۔ یہ اِس لیے کہ انکار کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان والوں نے اُس حق کی پیروی کی ہے جو اُن کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے[۴]۔ اِس طرح اللہ اُن کی مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے[۵]۔ ۱-۳

سو، (ایمان والو)، جب اِن منکروں سے تمھارے مقابلے کی نوبت آئے تو بے دریغ گردنیں مارنی ہیں[۶]، یہاں تک کہ جب تم اِن کو اچھی طرح کچل دو، تب قیدی

۳؎ یہ ایک جامع تعبیر ہے اور ظاہر و باطن، دونوں قسم کے احوال کا احاطہ کرتی ہے۔

۴؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد حق و باطل میں وہ فیصلہ لازماً ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۵؎ یعنی تمثیل کے پیرایے میں وہ حقائق سمجھاتا ہے جو عنقریب سب کے سامنے آجائیں گے۔

۶؎ یعنی جنگ کی نوبت آجائے تو کرنے کا ایک ہی کام ہے اور وہ بغیر کسی تامل کے، بے دریغ اِن کی گردنیں مارنا ہے۔ اِس کا حق ادا ہونا چاہیے۔ تمھارا پروردگار یہی چاہتا ہے کہ مقابلے پر آئیں تو زیادہ سے زیادہ تہ تیغ کیے جائیں۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اِن لوگوں پر خدا کے رسول نے اتمام حجت کیا تھا اور اُس کی تکذیب پر اصرار کے باعث اب یہ اُس سزا کے مستحق ہو چکے تھے جو رسولوں کے مکذبین کو لازماً دی جاتی ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ وضاحت کی ہے کہ یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے جو تمام رسولوں کے معاملے میں اِسی طرح جاری رہی ہے۔
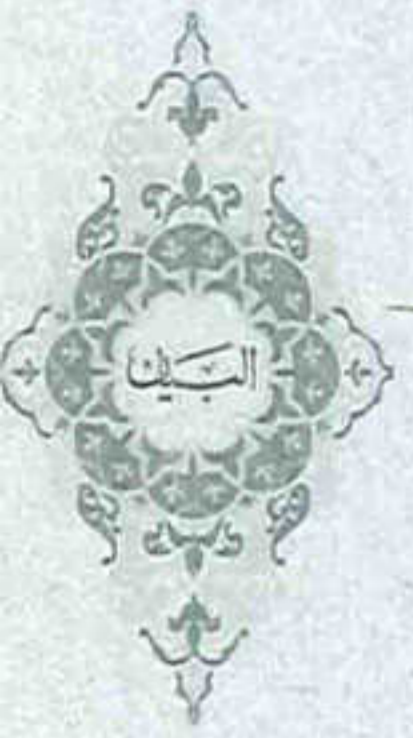
تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا ۃۚ ذٰلِكَ ۛ وَلَوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانۡتَصَرَ مِنۡهُمۡ

بنا کر مضبوط باندھو۔[7] پھر جب باندھ لو[8] تو اُس کے بعد احسان کر کے چھوڑ دینا ہے یا فدیہ لے کر۔[9] (اِن کے ساتھ تمھارا یہی معاملہ رہنا چاہیے)، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال

۷ اُس زمانے میں قیدی من جملہ غنائم تھے۔ اُنھیں پکڑنے کے لیے اہل عرب کی فطری رغبت کے پیش نظر تاکید فرمائی ہے کہ یہ کام اُس وقت ہونا چاہیے، جب پیغمبر کے اِن مکذبین کو بالکل کچل دیا جائے۔ اِس سے پہلے کسی شخص کو قیدی بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۸ یہاں 'فَاِذَا شَدَدۡتُمُ الۡوَثَاقَ' یا اِس کا ہم معنی فقرہ اصل میں محذوف ہے جس پر 'فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ' کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔

۹ یہ اِس لیے فرمایا کہ 'ضَرۡبَ الرِّقَابِ' میں جو ترغیب و تحریض ہے، اُس کی بنا پر لوگ قیدیوں کو قتل بھی کر سکتے تھے، لہٰذا برسر موقع ہدایت فرما دی کہ اِس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: فدیہ لے کر چھوڑنا یا احسان کر کے۔ مطلب یہ ہے کہ قیدی بنانے کا اقدام اُس وقت ہونا چاہیے، جب تہ تیغ کرنے کا حق ادا ہو چکا ہو، لیکن بنا لو گے تو قتل نہیں کر سکتے اور نہ غلام بنا سکتے ہو۔ اُس کے بعد قانون یہ ہے کہ فدیہ لے کر رہا کیا جائے گا یا بلا معاوضہ احسان کے طور پر چھوڑ دیا جائے گا۔

یہ حکم اگرچہ مشرکین عرب کے حوالے سے بیان ہوا ہے، لیکن ہر لحاظ سے عام ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قیدی بنا لینے کے بعد جب رسول کے منکرین سے احسان یا فدیے کے سوا کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا تو دوسروں سے بدرجۂ اولیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن کا یہی حکم ہے جس نے قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور اِس طرح غلامی کی جڑ کاٹ دی۔ اِس کے بعد صرف وہی مستثنیات باقی رہ گئے جو علم و عقل کے مسلمات کی رو سے ہر قانون، ہر قاعدے اور ہر حکم میں اُس کی ابتدا ہی سے مضمر ہوتے ہیں۔ یعنی مثال کے طور پر، سنگین جرائم کے کسی مرتکب کے ساتھ اُس کے جرائم کی بنا پر اِس سے ہٹ کر کوئی معاملہ کیا جائے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ قیدیوں کے بارے میں اِس عام قانون پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶

دے۔ یہ کام ہے جو تمھارے کرنے کا ہے۔[10] اگر اللہ چاہتا تو اِن سے خود ہی انتقام لے لیتا، لیکن اُس نے تم کو حکم دیا، اِس لیے کہ تم میں سے ایک کو دوسرے سے آزمائے۔[11] اور (مطمئن رہو، اِس کے نتیجے میں) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے،[12] اُن کے اعمال اللہ ہرگز رایگاں نہیں ہونے دے گا۔ (چنانچہ) عنقریب وہ اُن کو (اُن کی منزل مقصود کا) راستہ دکھائے گا،[13] اُن کا حال درست کرے گا[14] اور اُن کو جنت میں داخل کر دے گا۔ اُس کی پہچان اُس نے اُنھیں کرادی ہے۔[15] ۴-۶

۱۰؎ اصل میں حرف ’ذٰلِكَ‘ ہے۔ یہ ایک جملے کا قائم مقام ہے۔ اِس طرح کا اسلوب اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب کلام میں خاص زور پیدا کرنا مقصود ہو۔

۱۱؎ یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ قوم نوح، عاد و ثمود اور اِس طرح کی دوسری قوموں کی طرح قریش کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی عذاب کے ذریعے سے سزا کیوں نہیں دی۔ سورۂ آل عمران (۳) میں اِس کی تفصیل ہے۔ رسولوں کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ یہ طریقہ اُس وقت اختیار کرتے ہیں، جب رسول کے ساتھی معتد بہ تعداد میں ہوں اور اُنھیں کوئی ایسا دارالہجرت بھی میسر آجائے، جہاں وہ اپنی حکومت قائم کر کے خدا کے حکم پر جہاد کر سکیں۔

۱۲؎ جنگ سے پہلے یہ ماضی کا صیغہ اِس لیے استعمال فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت اُن لوگوں کو بھی شامل ہو جائے جو اِس سے پہلے بعض سریوں میں قتل ہو چکے تھے۔

۱۳؎ یعنی بغیر کسی رکاوٹ کے سیدھا جنت کے دروازے تک پہنچا دے گا۔

۱۴؎ اِس اجمال کے اندر وہ ساری تفصیل مضمر ہے جو اہل جنت کی سرفرازی اور فیروزمندی سے متعلق قرآن میں مذکور ہوئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ

ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے[16] تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور (اِن دشمنوں کے مقابلے میں) تمھارے پاؤں جما دے گا۔ رہے وہ جنھوں نے انکار کا فیصلہ کر لیا ہے تو اُن کے لیے ہلاکی ہے[17] اور اُن کے اعمال اللہ نے رایگاں کر دیے ہیں۔ یہ

محمد ۴۷

۱۵؎ یہ کس لیے فرمایا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''... اِس تصریح کی ضرورت اِس وجہ سے ہوئی کہ کوئی اِس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جنت کا یہ وعدہ ایک مجمل و مبہم وعدہ ہے، کچھ نہیں معلوم کہ اِس اسم کا مسمیٰ کیا ہے! اگر کوئی معاہدہ مبہم ہو، اُس کی تفصیلات واضح نہ ہوں تو کم زور فریق برابر اندیشے میں رہتا ہے کہ معلوم نہیں، وقت پر اِس کی کیا تفسیر و تاویل سامنے آئے۔ جنت کے وعدے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اِس قسم کے اندیشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ کیا ہے کہ اُس کی ساری تفصیلات سے اُن کو قرآن میں آگاہ کر دیا ہے اور جو باتیں تعبیر و بیان کی گرفت میں نہیں آ سکتی ہیں، اُن کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ بندوں کو پورا اطمینان رہے کہ جس چیز کے عوض میں اُنھوں نے اپنی جانیں اپنے رب کے حوالے کی ہیں، وہ کوئی مبہم شے نہیں ہے، بلکہ اُس کی ساری تفصیلات طے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اُن میں سے ہر بات کے پورا کرنے کا ذمہ لیا ہے، بلکہ اُن پر مزید اضافوں کا وعدہ فرمایا ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۴۰۰)

۱۶؎ یعنی اُس کے دین کی مدد کرو گے۔

۱۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَتَعْسًا لَّهُمْ'۔ یہ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے اور اِسی طرح استعمال ہوتا ہے۔

بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿٩﴾
اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ﴿١٠﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿١١﴾
اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ

اِس لیے کہ اُنھوں نے اُس چیز کو برا جانا جو اللہ نے اتاری ہے تو اللہ نے اُن کے اچھے اعمال بھی اکارت کر دیے۔[18] ۷-۹

پھر کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ (کبھی آنکھ اٹھا کر) دیکھتے کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو اِن سے پہلے گزرے ہیں؟ اللہ نے اُن کو اُن کی ہر چیز کے ساتھ تہس نہس کر دیا۔ اِن منکروں کے سامنے اب اِسی کی مثالیں آنی ہیں۔[19] یہ اِس لیے کہ اللہ ایمان والوں کا حامی و ناصر ہے اور اِن منکروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں۔ ۱۰-۱۱

یقیناً اللہ اُن کو، جو ایمان لائے اور اُنھوں نے اچھے عمل کیے، ایسے باغوں میں

۱۸؎ یعنی وہ اعمال جو بظاہر نیکی کے تھے، وہ بھی اکارت کر دیے، جیسے حرم کے انتظام و اہتمام اور حجاج کی خدمت وغیرہ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہی اعمال مقبول ہوتے ہیں جو اُس کے بیان کردہ شرائط کے مطابق انجام دیے جائیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں، وہ کسی کی نیکی کا محتاج نہیں ہے کہ جس طرح بھی کوئی نیک عمل کر دیا جائے، وہ ممنون ہو کر اُس کو قبول کر لے۔

۱۹؎ یعنی اِن کو بھی اُسی طرح کے نتائج بھگتنا ہیں جو اِن قوموں نے اپنی سرکشی کی پاداش میں بھگتے ہیں۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ

محمد ۴۷

داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جنھوں[۲۰] نے انکار کر دیا ہے، (اُن کی رفاہیت پر تعجب نہیں ہونا چاہیے)، وہ اُسی طرح بہرہ مند ہو رہے اور کھا پی رہے ہیں، جس طرح چوپایے کھاتے ہیں[۲۱] اور اُن کا ٹھکانا بالآخر دوزخ ہے۔ ۱۲

(یہ کس بل بوتے پر اکڑ رہے ہیں، اے پیغمبر)۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جو قوت میں تمھاری اُس بستی سے کہیں بڑھ کر تھیں، جس نے تمھیں نکالا ہے[۲۲]۔ اُن کو ہم نے ہلاک کر دیا تو کوئی بھی اُن کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ ۱۳

(آگے قیامت میں بھی یہی ہو گا۔ اگر نہیں مانتے تو اِن سے پوچھو)، پھر کیا جو

۲۰ یہاں سے آگے اِس شبہے کا جواب ہے کہ جب منکرین کے اعمال رایگاں ہیں تو دنیا میں اُن کو اِس قدر رفاہیت اور شان و شوکت کیوں حاصل ہوتی ہے۔

۲۱ مطلب یہ ہے کہ جس طرح چوپایے اخلاقی شعور سے عاری کھانے پینے کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں رکھتے، یہ بھی اُسی طرح کھا پی رہے ہیں اور اِسی طرح کھاتے پیتے ایک دن دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

۲۲ یعنی مکہ، جہاں سے آپ کو ہجرت کرنا پڑی۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا

اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل[۲۳] پر ہیں اور اچھے عمل بھی کرتے ہیں،[۲۴] وہ اُن لوگوں کی طرح ہو جائیں گے، جن کے پاس کوئی دلیل نہیں اور[۲۵] جن کی بدعملی اُن کے لیے خوش نما بنا دی گئی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں؟ (ہرگز نہیں)،[۲۶] وہ جنت جس کا وعدہ خدا سے ڈرنے والوں کے ساتھ کیا گیا ہے، اُس کی مثال یہ ہے کہ اُس میں پانی کی نہریں ہیں جس میں کوئی آمیزش نہیں ہو گی اور دودھ کی نہریں ہیں جس کے ذائقے میں ذرا فرق نہیں آیا ہو گا اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے یکسر لذت ہو گی اور شہد کی نہریں ہیں جو بالکل

محمد ۴۷

البیان

۲۳۔ اِس سے مراد وہی عقل و فطرت کی روشنی ہے جو خدا نے انسان کے اندر رکھ دی ہے اور جو وحی کی تائید سے 'نُوْرٌ عَلٰی نُوْر' ہو جاتی ہے۔

۲۴۔ یہ فقرہ تقابل کے اصول پر اصل میں محذوف ہے، اِس لیے کہ یہاں صرف اہل ایمان کے باطن کا ذکر کیا ہے، اُن کے ظاہر کا ذکر نہیں کیا، جب کہ مقابل میں منکرین کا ذکر ہے اور وہاں صرف ظاہر کا حوالہ ہے، اُن کے باطن کو نظر انداز کر دیا ہے۔

۲۵۔ یہ منکرین کا باطن ہے جو اہل ایمان کے باطن کے مقابل میں آپ سے آپ مفہوم ہو رہا ہے، لہٰذا اصل میں حذف کر دیا ہے، بالکل اُسی طرح جیسے اوپر اہل ایمان کا ظاہر مفہوم ہو رہا ہے اور اُس کو حذف کر دیا ہے۔

۲۶۔ اِس لیے کہ اِس کے معنی تو یہ ہوئے کہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے جس کا بنانے والا آسمان پر بیٹھا ہوا اِس کا تماشا دیکھ رہا ہے اور اِس کے خیر و شر سے اُس کو کوئی غرض نہیں ہے۔

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ

صاف شفاف ہوگا[27] اور اُن کے لیے اُس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور اُن کے پروردگار کی طرف سے مغفرت بھی۔ کیا وہ جن کے لیے یہ نعمتیں ہیں[28]، اُن لوگوں کی طرح

محمد ۴۷

۲۷۔ یہ جنتی نعمتیں بیان ہوئی ہیں، اِن میں، اگر غور کیجیے تو اِن کے خالص اور بے آمیز ہونے کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...اِس کی وجہ یہ ہے کہ نعمتیں جتنی بھی ہیں، سب کا اصلی منبع جنت ہی ہے، لیکن اِس عالم ناسوت میں جب ہمیں وہ ملتی ہیں تو اتنے مراحل اور اتنے وسائل و وسائط سے گزر کر ملتی ہیں کہ اُن کی حقیقت و ماہیت بھی بالکل بدل جاتی ہے اور اُن کی شکل و صورت بھی بالکل مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، سب سے زیادہ عام چیز پانی ہی کو لیجیے، یہ فضاؤں، بادلوں، ہواؤں، دریاؤں، ندیوں، نالوں اور زمین کی تہوں کے کتنے مراحل طے کر کے ہم تک پہنچتا ہے! ظاہر ہے کہ ہر مرحلے کے اثرات سے یہ متاثر ہوتا ہے جس کے سبب سے اِس کا وہ مزاج، جو اِس کے اصل منبع، یعنی جنت میں ہے، بالکل بدل جاتا ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس دودھ کو لیجیے۔ اِس دنیا میں یہ جن راستوں سے گزر کر ہمیں ملتا ہے، اُس کے متعلق خود قرآن کا بیان ہے کہ وہ 'مِنْ م بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ'*، یعنی گوبر اور خون کے درمیان سے ہو کر ہم تک پہنچتا ہے۔ غور کیجیے کہ جنت کی جو نعمت اِس راستے سے گزر کر ہم تک پہنچے گی، وہ اپنی اصلی مزاجی خصوصیات پر کس طرح باقی رہ سکے گی۔ اِس وجہ سے جنت کے دودھ اور شہد اور اِس دنیا کے دودھ اور شہد میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا فرق آسمان و زمین میں ہے۔ یہاں کی نعمتوں سے وہاں کی نعمتوں کا ایک مبہم سا تصور تو آپ کر سکتے ہیں اور یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی بھی اِسی لیے ہیں کہ ہم اِن مجازی نعمتوں سے اُن حقیقی نعمتوں کا تصور کر سکیں، لیکن دونوں میں نسبت بہرحال حقیقت و مجاز ہی کی ہے۔ اِس نسبت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۴۰۴)

۲۸۔ تقابل کے اصول پر 'أفمن کان له مثل هذه الجنة' یا اِس کے ہم معنی الفاظ یہاں

* النحل ۱۶:۶۶۔

وَسُقُوا مَآءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ ﴿۱۵﴾

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوۡا مِنۡ عِنۡدِكَ قَالُوۡا لِلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ

ہوں گے جو ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں، جنھیں اُس میں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو اُن کی آنتوں کو وہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گا؟[۲۹] ۱۴-۱۵

اور اُن میں، (جو خدا کی اتاری ہوئی اِس کتاب کو پسند نہیں کرتے)،[۳۰] کچھ ایسے بھی ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں، (لیکن سنتے سمجھتے کچھ نہیں)۔ یہاں تک کہ جب تمھارے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو علم والوں سے پوچھتے ہیں کہ ابھی اِنھوں نے کیا فرمایا تھا؟[۳۱] یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے، اِس لیے کہ یہ اپنی خواہشوں کے پیرو بنے رہے ہیں۔[۳۲] اِس کے برخلاف جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی ہے، اُن کی

بر بنائے قرینہ محذوف ہیں۔ استفہامیہ اور شرطیہ جملوں میں اِس قسم کا حذف معروف ہے۔

۲۹؎ یہ اہل دوزخ کی اولین ضیافت ہے جس کے بعد ہر قسم کے عذاب کے دروازے اُن کے لیے کھول دیے جائیں گے۔

۳۰؎ اِن کا ذکر پیچھے آیت ۹ میں ہو چکا ہے۔

۳۱؎ یعنی ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں، آپ لوگ کچھ سمجھ گئے ہوں تو بتا دیں۔ یہ فقرہ، ظاہر ہے کہ طنزیہ ہے، لیکن گرفت کی جائے تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ہم تو بات کو سمجھنے کے لیے پوچھ رہے تھے، اِس لیے کہ پوری طرح سمجھیں گے تو عمل کریں گے۔

۳۲؎ اِن کے دلوں پر مہر کیوں کی گئی؟ یہ اِس کی وجہ بتائی ہے کہ جب خواہشوں کی پیروی میں اِنھوں نے اُس نور بصیرت کی قدر نہیں کی جو اللہ نے اِن کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا تو

هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿١٧﴾
فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿١٨﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ

ہدایت (اِس قرآن سے) اللہ نے اور بڑھا دی اور اُن کے حصے کی پرہیزگاری اُنھیں عطا فرما دی ہے۔۱۶-۱۷

(اِن کی سمجھ میں تمھاری بات نہیں آرہی) تو اب یہ اِسی کے منتظر ہیں کہ قیامت اِن پر اچانک آجائے[۳۳]۔ سو یاد رکھیں کہ اُس کی علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں[۳۴]۔ پھر جب وہ اِن پر آہی جائے گی تو اِن کے لیے اِن کے سمجھنے کا موقع کہاں ہو گا! تو، (اے پیغمبر)، تم البتہ جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور (فیصلے کی گھڑی قریب آگئی ہے تو) اپنی اور

اُس کی سزا کے طور پر اللہ نے اِنھیں اُس نور سے بھی محروم کر دیا جو اِن کے پاس قرآن کی صورت میں آیا ہے۔

۳۳؎ یعنی جب پیشگی آگاہی کی قدر نہیں کر رہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہی چاہتے ہیں اور اِسی کے منتظر ہیں۔

۳۴؎ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ چونکہ آخری نبی تھے، اِس لیے اِس بات کی بھی علامت تھے کہ اب دنیا کی بساط لپیٹی جانے والی ہے۔ پھر مزید یہ کہ آپ کی قوم کے لیے تو قیامت گویا سر پر کھڑی تھی، کیونکہ آپ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد ایک قیامت صغریٰ اُن کے لیے اِسی دنیا میں برپا ہونے والی تھی جو درحقیقت اُس عدالت کبریٰ کے لیے توطیہ اور تمہید ہوتی ہے جو آخرت میں قائم ہو گی۔

يَعۡلَمُ مُتَقَلَّبَكُمۡ وَمَثۡوٰىكُمۡ ﴿١٩﴾

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَتۡ سُوۡرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ

(اپنے ساتھی) مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کی لغزشوں کی معافی مانگتے رہو۔[۳۵]

اللہ تمھارے آنے جانے کی جگہوں اور تمھارے ٹھکانوں کو جانتا ہے[۳۶]۔ ۱۸-۱۹

یہ جو بظاہر ایمان لائے ہیں[۳۷]، کہتے تھے کہ جنگ کے بارے میں[۳۸] کوئی سورت

محمد ۴۷

۳۵؎ یہ ہدایت جماعت کے وکیل اور شفیع کی حیثیت سے ہے اور اِس لیے کی گئی ہے کہ فیصلے کی گھڑی جب ظاہر ہو تو اہل ایمان اُس کی آفتوں سے محفوظ رہیں۔ آیت میں لغزش یا 'ذَنْب' کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی ہوئی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف 'ذَنْب' کی نسبت اول تو...امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے نہ کہ براہ راست اُس کے ذمہ دار کی حیثیت سے۔ پھر انبیا علیہم السلام سے جو خطائیں صادر ہوتی ہیں، وہ اتباع ہوا کی نوعیت کی نہیں ہوتیں، بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ اتباع حق میں اُس کے متعین حدود سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ اِس کی وضاحت اِس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اِس قسم کا تجاوز کوئی معصیت نہیں ہے، لیکن حضرات انبیا علیہم السلام چونکہ حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہوتے ہیں، اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن کی اِس طرح کی باتوں پر بھی گرفت اور اُن کی اصلاح فرماتا رہتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/۴۱۵)

۳۶؎ یہ تسلی کے لیے فرمایا ہے کہ اِس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم عذاب کی زد میں آجاؤ۔ تمھاری آمد و شد کی جگہوں اور تمھارے ٹھکانوں کو اللہ جانتا ہے۔ تم برابر اپنے رب سے استغفار کرتے رہے تو جہاں کہیں بھی ہو گے، اللہ تمھاری حفاظت فرمائے گا۔

۳۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا'۔ 'الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا' میں فعل دعویٰ فعل کے مفہوم میں ہے اور 'يَقُوۡلُ' سے پہلے عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے۔

سُوۡرَةٌ مُّحۡكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيۡهَا الۡقِتَالُ ۙ رَاَيۡتَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ يَّنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ نَظَرَ الۡمَغۡشِىِّ عَلَيۡهِ مِنَ الۡمَوۡتِ ؕ فَاَوۡلٰى لَهُمۡ ۚ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّقَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ ۟ فَاِذَا عَزَمَ الۡاَمۡرُ ۟ فَلَوۡ

کیوں نہیں اتاری جاتی؟[۳۹] پھر جب ایک واضح سورت[۴۰] اتاردی گئی اور اُس میں جنگ کا ذکر بھی ہوا تو جن کے دلوں میں بیماری ہے[۴۱]، تم اُن کو دیکھتے ہو کہ وہ تمھاری طرف اِس طرح دیکھ رہے ہیں، جس طرح کوئی ایسا شخص دیکھتا ہے جس پر موت کی بے ہوشی طاری ہو۔ سو اِن کے حال پر افسوس[۴۲]! اِن کے لیے صحیح رویہ تھا کہ حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنی ہے[۴۳]۔ پھر

۳۸؎ 'لَوۡلَا نُزِّلَتۡ سُوۡرَةٌ' کے بعد یہ الفاظ آیت میں محذوف ہیں، یعنی 'فِى الۡجِهَادِ' یا 'فِى الۡقِتَالِ'۔ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ آگے تفصیل آرہی ہو تو وہ پہلے اجمال کا طریقہ اختیار کرتا ہے جس کے مقدرات اُس تفصیل سے سمجھ لیے جاتے ہیں۔

۳۹؎ یہ بات وہ اپنے دعوئ ایمان کی دھونس جمائے رکھنے کے لیے کہتے تھے تاکہ سننے والے یہی خیال کریں کہ وہ ایمان کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کے لیے تیار ہیں، یہاں تک کہ اُس کے لیے جان بھی دینی پڑی تو دریغ نہیں کریں گے۔

۴۰؎ یعنی جس میں کوئی ابہام و اجمال یا تفسیر و تاویل کی گنجایش نہیں تھی۔

۴۱؎ یعنی کینے، حسد اور نفاق کی بیماری ہے۔

۴۲؎ اصل میں 'فَاَوۡلٰى لَهُمۡ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بھی 'وَيۡلَكَ' یا 'وَيۡلٌ لَّهُمۡ' کی طرح لعنت اور اظہار نفرت کا کلمہ ہے۔

۴۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'طَاعَةٌ وَّقَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ'۔ یہ مبتدا کے محل میں ہیں جس کی خبر بلاغت کے تقاضے سے حذف کردی ہے۔ اِن میں 'قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ' سے مراد 'سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا' کا وہی کلمہ ہے جو ہمیشہ سے سچے اہل ایمان کا دستور رہا ہے۔

صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿٢١﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ

جب معاملے کا قطعی فیصلہ ہو جائے[۴۴] تو اُس وقت اگر یہ اللہ سے سچے ثابت ہوتے تو اِن کے لیے بہت بہتر ہوتا۔ سو، (ایمان کا دعویٰ کرنے والو)[۴۵]، اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو تم سے اِس کے سوا کیا توقع ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رحمی رشتوں کو توڑو[۴۶]! یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، پھر اِن کے کانوں کو بہرا اور اِن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا[۴۷]۔ سو کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر اُن کے تالے چڑھے ہوئے ہیں[۴۸]؟ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے الٹے پاؤں پھر گئے، اِس کے

۴۴۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ ابھی صرف جہاد کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی، جیسا کہ اِس سورہ کی آیت ۴ سے واضح ہے، اُس کے لیے کسی عملی اقدام کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

۴۵۔ پیچھے غائب کا اسلوب ہے، لیکن یہاں سے براہ راست خطاب فرمایا ہے۔ یہ موعظت کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ہے۔

۴۶۔ یعنی جاہلیت کے اُنھی طور طریقوں کی طرف لوٹ جاؤ جو اسلام سے پہلے تم نے اختیار کر رکھے تھے اور باہمی تعلقات میں امن وعدل اور اخوت ومودت کی جو تعلیم تمھیں دی گئی ہے، اُس سے ایک مرتبہ پھر محروم ہو جاؤ، اِس لیے کہ اِس تعلیم کی بنیاد وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے عقیدے پر ہے اور جس طرف لوٹو گے، وہاں باوا آدم بھی الگ الگ ہے اور خدا بھی ہر قبیلے کا جدا ہے۔

۴۷۔ یہ جس قانون کے تحت ہوا، اُس کی وضاحت ہم اوپر حاشیہ ۳۲ میں کر چکے ہیں۔

۴۸۔ یعنی وہ تالے جو دلوں ہی پر چڑھتے ہیں۔ اِس سے وہ روگ اور بیماریاں مراد ہیں جو دلوں کو

مِّنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡهُدَى ۙ الشَّيۡطٰنُ سَوَّلَ لَهُمۡ ؕ وَاَمۡلٰى لَهُمۡ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لِلَّذِيۡنَ كَرِهُوۡا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ بَعۡضِ الۡاَمۡرِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِسۡرَارَهُمۡ ﴿۲۶﴾ فَكَيۡفَ اِذَا تَوَفَّتۡهُمُ

بعد کہ ہدایت اُن کے لیے واضح ہوگئی تھی، اُنھیں شیطان نے فریب دیا اور اُن کو خدا نے بھی ڈھیل دے دی۔[49] یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اِنھوں نے اُن لوگوں سے کہا، جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کو برا جانا[50] کہ بعض معاملات میں ہم تمھاری ہی مانیں گے۔[51] اللہ اِن کی رازداری کو خوب جانتا ہے۔[52] (اِن کا یہی رویہ ہے) تو اُس وقت کیا ہو گا،

محمد ۴۷

لگ جاتی ہیں، جیسے موت کا خوف، دنیا کی محبت، کینہ، حسد، نفاق، بزدلی، کبر و غرور اور قساوت وغیرہ۔

۴۹؎ یعنی اپنے اِس قانون کے مطابق ڈھیل دے دی کہ جو لوگ اپنی خواہشوں کی پیروی میں راہ حق سے انحراف پر اصرار کریں، اُنھیں چھوڑ دیا جائے گا کہ جس وادی میں ہرزہ گردی کرنا چاہیں، کرلیں اور بالآخر اُس انجام کو پہنچ جائیں جو اِس طرح کے لوگوں کے لیے مقرر ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اِس جملے میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں: ایک 'سَوَّلَ' اور دوسرے 'اَمْلٰی'۔ پہلے کا فاعل شیطان اور دوسرے کا اللہ تعالیٰ ہے۔ اِس کی بنا فعل کی مناسبت پر ہے۔ چنانچہ قرینہ موجود ہو تو مجرد فعل ہی بتا دیتا ہے کہ اُس کا فاعل کون ہے۔

۵۰؎ یہ اشارہ یہود اور قریش کے لیڈروں کی طرف ہے جن کے ساتھ یہ لوگ بظاہر مسلمان ہو جانے کے باوجود ساز باز رکھتے تھے۔

۵۱؎ یعنی ہر چند ہم مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہیں، لیکن اگر کوئی مشکل وقت آیا یا تمھارے خلاف کسی اقدام کا فیصلہ ہوا تو جو کچھ تم کہو گے، ہم وہی مانیں گے۔ اُس وقت ہم کسی دوسرے کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہیں کریں گے۔

۵۲؎ یہ سخت تہدید کا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوب جانتا ہے تو ایک دن محاسبہ بھی کرے گا اور تم کو تمھارے انجام تک بھی پہنچا دے گا۔

الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾

جب فرشتے اِن کے مونھوں پر اور اِن کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے اِن کی روحیں قبض کریں گے؟ یہ اِس وجہ سے کہ اِنھوں نے اُس چیز کی پیروی کی جو خدا کو غصہ دلانے والی تھی اور اُس کی خوشنودی کو پسند نہیں کیا تو اللہ نے اِن کے (بظاہر) اچھے اعمال بھی اکارت کر دیے۔[۵۳] ۲۰-۲۸

کیا یہ لوگ، جن کے دلوں میں بیماری[۵۴] ہے، اِس خیال میں ہیں کہ اِن کے کینوں کو اللہ کبھی ظاہر نہیں کرے گا؟ اگر ہم چاہتے تو، (اے پیغمبر)، اِن کو اِس طرح تمھیں دکھا دیتے کہ تم اِن کی علامتوں سے اِنھیں پہچان لیتے اور اِن کے لہجے کے تذبذب[۵۵] سے تو اِنھیں تم (اِس وقت بھی) ضرور پہچان لو گے۔ (ایمان کا دعویٰ کرنے والو، تم کس کو دھوکا دے رہے ہو)؟ اللہ تمھارے اعمال کو جانتا ہے۔ ۲۹-۳۰

۵۳؎ اِس لیے کہ اللہ اچھا عمل بھی وہی قبول کرتا ہے جو اُس کے بیان کردہ شرائط کے مطابق کیا جائے۔

۵۴؎ یعنی نفاق کی بیماری ہے جس کے ساتھ حسد اور کینہ بھی شامل ہو گیا ہے۔

۵۵؎ بات میں ایچ پیچ اور کلام میں دورخاپن ہو تو انسان کے لہجے میں تذبذب نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن نے اُسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

محمد ۴۷

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ

ہم لازماً تمھیں آزمائیں گے، یہاں تک کہ تم میں جو مجاہد اور ثابت قدم ہیں، اُن کو ہم الگ معلوم کر لیں اور تمھارے حالات کو جانچ لیں۔[۵۶] (تم کن کے پیچھے لگ کر اپنے آپ کو برباد کر رہے ہو؟ یاد رکھو)، جن لوگوں نے انکار کر دیا ہے اور اللہ کی راہ سے (لوگوں کو) روکا ہے اور ہدایت کے اُن پر واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کی ہے،[۵۷] وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، بلکہ وہ اُنھی کے اعمال اکارت کر دے گا۔ ۳۱-۳۲

ایمان والو، (ہر چیز سے بے پروا ہو کر) اللہ کے حکم پر چلو اور رسول کے حکم پر چلو اور (اللہ اور رسول سے بے وفائی کر کے) اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔[۵۸] اِس

---

۵۶ آزمایش ایک سنت الٰہی ہے جس میں کوئی استثنا نہیں ہے، ہر عامی و عارف کو کسی نہ کسی درجے میں اِس سے لازماً گزرنا ہوتا ہے، لیکن اِس کی نوعیت اُن لوگوں کے لیے بالکل مختلف ہو جاتی ہے جو رسول کے ساتھی ہوں۔ اللہ تعالیٰ منکرین پر عذاب سے پہلے اُن کی جماعت کی تطہیر کرتا ہے تاکہ آخری فیصلے کے وقت یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہو جائے کہ کون کہاں کھڑا ہے۔ اِس طرح کی آزمایشیں عام لوگوں کو بالعموم پیش نہیں آتیں۔

۵۷ یعنی قریش مکہ اور حق و باطل کی اِس کشمکش میں اُن کے حلیف اور ساتھی۔

محمد ۴۷

مَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوۡا وَتَدۡعُوۡۤا اِلَى السَّلۡمِ ۖۚ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ ۖۚ وَاللّٰهُ مَعَكُمۡ وَلَنۡ يَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ ؕ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا يُؤۡتِكُمۡ

میں کچھ شک نہیں کہ جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، پھر اِسی انکار کی حالت میں مر گئے، اُن کو اللہ ہرگز نہیں بخشے گا۔ سو تم کم زور نہ پڑو اور (یہ جو عذاب کی زد میں ہیں، اِن کو اب) سمجھوتے کی دعوت نہ دو[۵۹] اور (جان لو کہ) تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ تمھارے ساتھ ہے اور تمھارے اعمال کے معاملے میں وہ ہرگز تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ کرے گا۔ ۳۴-۳۵

یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے۔ اگر تم ایمان رکھو گے اور تقویٰ اختیار کرو

۵۸؎ اِس لیے کہ سچے ایمان سے محرومی کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوتا۔

۵۹؎ یعنی اِس وقت جب کہ خدا کا فیصلہ صادر ہونے والا ہے، اپنی کم زوری اور بزدلی کو چھپانے کے لیے صلح اور سمجھوتے کے داعی نہ بنو، اِس کا وقت گزر چکا ہے۔ اِس کے لیے اصل میں 'تَدۡعُوۡۤا اِلَى السَّلۡمِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں لاے نہی کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ اِس میں کیا بلاغت ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... جہاں معطوف اور معطوف علیہ، دونوں میں ایک ہی حقیقت ظاہر کی گئی ہو، وہاں لاے نہی کے اعادے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی صورت آیت زیر بحث میں بھی ہے۔ اِن منافقین کی یہ دعوت صلح چونکہ اِن کی بزدلی ہی کا نتیجہ تھی۔ اِس وجہ سے 'تَدۡعُوۡا' کو 'فَلَا تَهِنُوۡا' پر عطف کر دیا اور 'لَا' کو حذف کر دیا تا کہ اسلوب کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ دعوت صلح اِس لیے نہیں دے رہے ہو کہ تم بڑے صلح پسند ہو، بلکہ یہ محض اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے کی ایک ناکام سعی ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/۴۲۵)

محمد
۴۷

أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ

محمد
۴۷

گے تو اللہ تمھارا اجر تمھیں دے گا اور تم سے تمھارے مال سمیٹ کر نہیں مانگے گا۔[۶۰] اور اگر وہ اِن کو تم سے مانگ لے اور سب کچھ سمیٹ کر مانگ لے تو (معلوم ہے کہ) تم بخیلی کرو گے (اور صاف انکار کر دو گے) اور اِس سے وہ تمھارے (دلوں میں چھپے ہوئے) کینوں کو ظاہر کر دے گا۔[۶۱] سنو، تم وہ لوگ ہو کہ تم کو (تمھارے مال کا کچھ حصہ) خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے تو تم میں ایسے بھی ہیں جو (اُس میں بھی) بخیلی کرتے ہیں۔ (یاد رکھو)، جو بخیلی کرتا ہے تو حقیقت میں اپنے ہی ساتھ بخیلی کرتا ہے۔[۶۲] اللہ تو (ہر چیز سے) بے نیاز ہے اور تم اُس کے محتاج ہو۔ (تم

۶۰۔ اصل الفاظ ہیں: 'لَا يَسْئَلُكُمْ اَمْوَالَكُمْ'۔ اِن کے بعد لفظ 'اِحْفَاء' محذوف ہے۔ آگے اِس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ یہ وہی اسلوب ہے جس کا ذکر ہم پیچھے کر چکے ہیں کہ آگے تفصیل آ رہی ہو تو اِس سے پہلے اجمال کا طریقہ اختیار کر لیا جاتا ہے جس کے مقدرات اُس تفصیل سے سمجھ لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تم لوگوں کو اِس آزمایش میں نہیں ڈالے گا کہ تم کو تمھارا سارا مال اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہے، بلکہ اُس کا ایک حصہ ہی طلب کرے گا۔

۶۱۔ یعنی تمھاری کم زوری اور منافقت کا سارا بھرم کھل جائے گا اور جو عداوت تم خدا کے پیغمبر اور اُس کی دعوت کے ساتھ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو، وہ سب باہر آ جائے گی۔ لہٰذا اِس طرح کی باتیں کرنے کے بجائے اپنے باطن کو پاک کرنے کی کوشش کرو۔

۶۲۔ اِس لیے کہ اِس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو خدا کی ابدی بادشاہی سے محروم کر لیتا ہے۔

قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ﴿۳۸﴾

سورة الفتح

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ

خدا سے روگردانی کرنا چاہتے ہو تو جاؤ، کرو)۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمھاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہ ہوں گے۔[۶۳] ۳۶-۳۸

۲

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

اِس میں کچھ شک نہیں، (اے پیغمبر) کہ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی ہے[۶۴] کہ

---

۶۳ یعنی تمھاری طرح خدا سے عناد رکھنے والے، اُس کی رضاطلبی سے بے زار، دنیا کے طالب اور خدا کے دشمنوں سے درپردہ دوستی رکھنے والے نہیں ہوں گے، بلکہ خدا سے محبت کرنے والے، اُس کی رضا اور آخرت میں کامیابی کے طالب اور خدا اور اُس کے رسول کی وفاداری پر ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔

۶۴ سورہ کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اِس سے حدیبیہ کا معاہدہ مراد ہے جو روایتوں کے مطابق ذی القعدہ ۶ رہجری میں قریش مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان طے پایا، جب اپنے ایک رؤیا کی بنا پر آپ ہدی کے جانور ساتھ لیے ہوئے اپنے کم و بیش چودہ پندرہ سو صحابہ کی معیت میں عمرے کے لیے وہاں پہنچے، لیکن قریش نے آپ کو اِس کی اجازت نہیں دی۔ یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا اور اِس کے شرائط درج ذیل تھے:

۱۔ دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی۔ اِس دوران میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے کے خلاف کوئی خفیہ یا علانیہ کارروائی نہیں کرے گا۔

۲۔ اِس دوران میں قریش کا کوئی آدمی اگر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائے گا تو آپ اُسے واپس کر دیں گے۔ اور اگر مسلمانوں میں سے کوئی آدمی قریش کے پاس آ جائے گا تو وہ اُس کو واپس نہیں کریں گے۔

۳۔ قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی چاہے، فریقین میں سے کسی کا حلیف بن کر اِس معاہدے میں شامل ہو سکتا ہے۔

۴۔ مسلمان اِس سال واپس چلے جائیں گے۔ آیندہ سال وہ عمرے کے لیے آ کر تین دن تک مکے میں ٹھیر سکتے ہیں۔ اسلحہ میں سے ہر شخص صرف ایک تلوار میان میں لا سکتا ہے۔ اِن تین دنوں میں اہل مکہ اُن کے لیے شہر خالی کر دیں گے تا کہ کسی تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔*

یہی معاہدہ ہے جسے قرآن نے یہاں کھلی فتح قرار دیا ہے۔ اِس کے متعدد پہلو بالکل واضح ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''ایک یہ کہ یہ پہلا موقع ہے کہ قریش نے علانیہ بیت اللہ پر مسلمانوں کا حق تسلیم کیا اور یہ تسلیم کرنا بطور احسان نہیں، بلکہ مسلمانوں سے دب کر ہوا۔ آگے آیت ۲۴ سے واضح ہو گا کہ اگر معاہدہ نہ ہوتا اور جنگ چھڑتی تو مسلمانوں کی فتح یقینی تھی۔ قریش نے صورت حال کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا، اِس وجہ سے وہ معاہدے کے دل سے خواہش مند تھے۔ البتہ اپنی ناک ذرا اونچی رکھنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اِسی سال عمرہ کرنے پر اصرار نہ کریں، بلکہ آیندہ سال آئیں۔ مسلمانوں کو اِس بات پر راضی کرنے کے لیے اُنھوں نے بہت بڑی رشوت بھی دی کہ تین دن کے لیے وہ شہر بالکل خالی کر دیں گے تا کہ کسی تصادم کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔ قریش کی طرف سے یہ پیش کش کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

دوسرا یہ کہ قریش نے اِس معاہدے کی رو سے مسلمانوں کو اپنے برابر کی ایک حریف قوت عرب میں تسلیم کر لیا۔ اُن کی نظر میں مسلمانوں کی حیثیت اب باغیوں اور غداروں کی نہیں رہی تھی، جیسا کہ وہ علانیہ اب تک کہتے رہے تھے، بلکہ مساوی درجے کی ایک سیاسی قوت کی ہو گئی۔ چنانچہ اُنھوں نے علانیہ اُن کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا کہ عرب کے جو قبائل اُن

---

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۳/ ۲۹۱۔

ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ﴿۲﴾

(تم سرخ روئی کے ساتھ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاؤ اور اِس کے صلے میں) اللہ تمھارے اگلے اور پچھلے سب گناہوں کو بخش دے[۶۵] اور تم پر اپنی نعمت تمام

کے حلیف بننا چاہیں، وہ اُن کو اپنا حلیف بنا سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ قریش نے مسلمانوں کی جنگی صلاحیت کا لوہا بھی اِس حد تک مان لیا کہ خود اصرار کر کے معاہدے میں دس سال کے لیے جنگ بندی کی شرط رکھوائی۔

چوتھا یہ کہ اِس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں کو جنگ کی اجازت جو نہیں دی تو اِس کی وجہ مسلمانوں کی کوئی کم زوری نہیں تھی، بلکہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں بہت سے ظاہر اور مخفی مسلمان تھے جو وہاں سے ابھی ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ اندیشہ تھا کہ جنگ کی صورت میں اُن کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچ جائے گا۔

غرض اِس کے ایک فتح مبین ہونے کے گونا گوں پہلو واضح تھے جو مسلمانوں سے مخفی نہیں ہو سکتے تھے، لیکن قریش نے اپنی حمیت جاہلیت کا مظاہرہ کچھ اِس طرح کیا اور بعض واقعات نہایت اشتعال انگیز، مثلاً ابو جندل کا واقعہ —— اِس دوران میں ایسے پیش آ گئے کہ مسلمانوں کے اندر عام احساس یہ پیدا ہو گیا کہ یہ معاہدہ دب کر کیا جا رہا ہے۔ جذبات کے ہیجان میں لوگ اِس کے ہر پہلو پر غور کر کے یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ اِس معاہدے کی رو سے اُنھوں نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ اِس سورہ نے جب اصل حقائق کی طرف توجہ دلائی، تب لوگوں کو محسوس ہوا کہ فی الواقع اُنھوں نے معاہدے کے مضمرات سمجھنے میں غلطی کی اور جب اُس کے نتائج سامنے آئے تو ہر شخص نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ فی الواقع یہی معاہدہ فتح مکہ کی تمہید ثابت ہوا۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۴۳۶)

۶۵۔ یہ عظیم بشارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اِس فتح کے نتیجے میں اب عنقریب وہ وقت آئے گا کہ آپ فریضۂ رسالت کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائیں گے اور یہ سبک دوشی نہایت سرخ روئی اور سرفرازی کے ساتھ ہوگی کہ اِس کے دوران میں اگر کوئی لغزش کہیں ہوئی ہے یا بعد میں بھی اگر ہو تو معاف کر دی جائے اور اللہ تعالیٰ نے جس عظیم مشن پر آپ کو مامور فرمایا تھا، اُس کے بارے میں

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿٣﴾

کرے[۶۶] اور تمھارے لیے ایک سیدھی راہ کھول دے[۶۷] اور اللہ تمھاری ایسی مدد کرے جو ناقابل شکست ہو[۶۸]۔ ۱-۳

کوئی چھوٹی یا بڑی مسئولیت آپ پر باقی نہ رہے۔ آپ کے لیے، اگر غور کیجیے تو یہ پروردگار عالم کی خوشنودی کا ایسا پروانہ ہے کہ اِس سے بڑا کوئی پروانہ نہیں ہوسکتا۔ یہ اِسی کی شکرگزاری تھی کہ آخری زمانے میں آپ کا زیادہ وقت تسبیح ومناجات، استغفار اور نماز میں گزرتا تھا۔

آیت میں لغزش یا 'ذَنْب' کی جو نسبت آپ کی طرف ہوئی ہے، اُس کی نوعیت کیا ہے؟ اِس کی وضاحت ہم نے سورۂ محمد (۴۷) کی تفسیر میں حاشیہ ۳۵ کے تحت کر دی ہے۔

۶۶۔ یہ دوسری عظیم بشارت ہے کہ جس دین کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے اُس کی تمام تفصیلات کے ساتھ پہلی وحی سے دینا شروع کی تھی، وہ پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ یہ نعمت پوری ہوگئی تو قرآن نے سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۳ میں اعلان کر دیا کہ آج میں نے تمھارے دین کو پورا کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند فرمایا ہے۔

۶۷۔ یہ اُس نعمت کا ثمرہ ہے جس کا ذکر ہوا کہ اِس کے نتیجے میں توحید کی راہ ہر سالک کے لیے روشن ہو جائے گی اور ام القریٰ مکہ میں وہ مرکز نور بھی اپنے اصلی جلال و جمال کے ساتھ بے نقاب ہو جائے گا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ہدایت کی اصل شاہ راہ کی طرف رہنمائی کے لیے تعمیر کیا تھا۔

۶۸۔ یعنی جس کے نتیجے میں قریش کا زور بالکل ختم ہو جائے، بیت اللہ مسلمانوں کی تحویل میں آ جائے اور سرزمین عرب میں دین حق کا غلبہ قائم ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس مشن کے لیے مامور تھے، اُس کے لیے ایسی مدد ہی ناقابل شکست ہوسکتی تھی۔

یہ بشارتیں یہاں جس ترتیب سے بیان کی گئی ہیں، اُس کی بلاغت بھی قابل توجہ ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

وہی ہے جس نے (فتح کے اِس سفر کے لیے نکلتے وقت)[69] مسلمانوں کے دلوں میں طمانیت نازل فرمائی[70] تاکہ (وہ نکلیں اور اِس کے صلے میں) اُن کے ایمان کے ساتھ اور ایمان کا اضافہ ہو،[71] (ورنہ اللہ اپنے دین کی نصرت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے)۔

الفتح ۴۸

''...جو چیز سب سے پہلے ظہور میں آنے والی ہے، اُس کا ذکر آخر میں ہوا اور جو چیز سب کا خلاصہ ہے اور سب سے آخر میں ظاہر ہوگی، اُس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ یہ ترتیب نزولی ہے، یعنی بیان مطالب میں نیچے سے اوپر چڑھنے کی نہیں، بلکہ اوپر سے نیچے اترنے کی ترتیب اختیار فرمائی گئی ہے۔ اِس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ موقع آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دینے کا تھا۔ فتح مکہ کی بشارت بھی اگرچہ اہم بشارت تھی، لیکن اِس سے بھی بڑی، بلکہ سب سے بڑی بشارت آپ کے لیے یہ تھی کہ وہ انعام اخروی آپ کے سامنے رکھ دیا جائے جو آپ کو ملنے والا ہے اور جس کے ملنے میں اب زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔''

(تدبر قرآن ۷/۴۴۰)

۶۹؎ یعنی جب آپ عمرے کے ارادے سے اپنے صحابہ کے ساتھ مکے سے نکل رہے تھے۔

۷۰؎ اوپر جس نصرت کا وعدہ فرمایا ہے، یہ اُس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ مسلمان جب اِس سفر کے لیے نکل رہے تھے تو دیکھنے والے یہی خیال کر رہے تھے کہ یہ لوگ موت کے منہ میں جا رہے ہیں اور اِن کو اب گھر پلٹنا نصیب نہیں ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا عزم و حوصلہ اُن کے اندر پیدا کر دیا کہ حضور نے جیسے ہی اپنا ارادہ ظاہر فرمایا، وہ بغیر کسی تردد کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لہٰذا ہر شخص کو مطمئن رہنا چاہیے، اللہ آگے بھی اِسی طرح مدد فرمائے گا۔

۷۱؎ یہ حقیقی ایمان کا ذکر ہے اور وہ ہرگز کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ خدا کی نشانیوں کے ظہور کو دیکھ کر یقیناً اُس میں افزونی ہوتی ہے۔

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۴﴾ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۵﴾

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ

زمین اور آسمانوں کے تمام لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اِس لیے کہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور اِس لیے کہ وہ اُن کے گناہ اُن سے جھاڑ دے[۲]۔ اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی یہی ہے۔ ۴-۵

اور اِس لیے بھی کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں، اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے[۳] جو اللہ کے حق میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے

۲؎ یہ چیز، ظاہر ہے کہ مقدم ہے، اِس لیے کہ لوگ گناہوں کے جھاڑے جانے کے بعد ہی جنت میں داخل ہوں گے، لیکن بیان میں اِسے موخر اِس لیے کر دیا ہے کہ بشارت کا پہلو نمایاں رہے۔

۳؎ یعنی وہی سفر جس سے اہل ایمان کے لیے فوز و فلاح کے دروازے کھلیں، منافقین اُسی سے گریز و فرار کے راستے تلاش کر کے اپنے لیے دوزخ کے دروازے کھول لیں۔ اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے، اِس میں بارہا ایک ہی چیز کسی کے لیے نعمت اور کسی کے لیے نقمت کا باعث بن جاتی ہے۔ آیت میں منافقین اور مشرکین کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ یہ اُس گہری ذہنی اور قلبی مماثلت کی بنا پر ہے جو دونوں کے درمیان پائی جاتی تھی۔

عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝
اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

رہے ہیں[4]۔ (یہ مسلمانوں کے لیے بری گردش کے منتظر ہیں)۔ بری گردش اِنھی پر ہے۔ اِن پر اللہ کا غضب ہوا اور اُس نے اِن پر لعنت کی اور آگے اِن کے لیے اُس نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ (یہ اللہ سے بے پروا ہیں تو اللہ کو بھی اِن کی کوئی ضرورت نہیں ہے)۔ زمین اور آسمانوں کے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے۔ ۶-۷

ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو گواہی دینے والا[5]، خوش خبری پہنچانے والا اور خبردار

۴؎ اِن بدگمانیوں کی تفصیل آگے آیت ۱۲ میں آ رہی ہے۔ اِن آیتوں میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بڑی آزمایش کا دور تھا جس میں اگر مومن عورتیں اپنے عزم و صبر سے مومن مردوں کی ہمت بندھا رہی تھیں تو منافق مردوں کے اندر نفاق کی پرورش میں منافق عورتوں کا بھی بڑا دخل تھا۔ یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ اُن کا کردار بھی نمایاں ہو اور دونوں کو معلوم ہو جائے کہ اُن کا پروردگار اُن کے حالات سے بے خبر نہیں ہے۔

۵؎ اِس گواہی کے معنی قرآن کی اصطلاح میں یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اِس طرح واضح کر دیا جائے کہ اِس کے بعد کسی شخص کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں میں سے بعض کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اُس سے انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے

وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ۭ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ⑨

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ

کرنے والا[۶] بنا کر بھیجا ہے تاکہ (لوگو)، تم اللہ اور اُس کے رسول پر سچا ایمان لاؤ، رسول کا ساتھ دو، اُس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو[۷]۔ ۸-۹

(یہ تمھارے ہاتھ پر بیعت کی اہمیت کو سمجھتے نہیں ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ تم سے نہیں، بلکہ اللہ ہی سے بیعت کرتے

الفتح ۴۸

کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ بچشم سر دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہی گواہی ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن نبیوں کو غلبہ عطا فرماتا اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے۔

۶؎ یعنی جو اِس گواہی کو قبول کر کے اپنی زندگیاں سنوار لیں، اُن کو جنت کی بشارت دینے والا اور جو رد کر دیں، اُن کو دوزخ کے عذاب سے خبردار کرنے والا۔ یہ بات اگرچہ ایک عام کلیہ کی حیثیت سے ارشاد ہوئی ہے، لیکن کلام کے تدریجی ارتقا سے واضح ہو جائے گا کہ روے سخن اُنھی منافقین اور منافقات کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۷؎ اللہ اور رسول پر ایمان کے یہ تقاضے صعودی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں تاکہ رسول کا حق اُس کے ذکر سے متصل ہی بیان ہو جائے اور اللہ کا ذکر چونکہ مقدم تھا، لہٰذا اُس کا حق اِس ترتیب کی رعایت سے بعد میں بیان کیا جائے۔ ہم پچھلی سورہ کے حواشی میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض اوقات مجرد فعل بتا دیتا ہے کہ اُس کا فاعل یا مفعول کون ہے اور اہل ذوق اُس کو سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

اَيۡدِيۡهِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۰﴾

سَيَقُوۡلُ لَكَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ شَغَلَتۡنَاۤ اَمۡوَالُنَا وَاَهۡلُوۡنَا فَاسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ

ہیں[۸]۔اُن کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔سو جس نے یہ عہد توڑا، وہ اِس عہد شکنی کا وبال اپنے ہی سر لیتا ہے اور جس نے اُس بات کو پورا کر دیا جس کا عہد اُس نے اللہ سے کیا تھا[۹] تو اللہ عنقریب اُس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔۱۰

(تم اِس سفر سے واپس گھر پہنچو گے تو) اہل بدو میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے[۸۰]، وہ اب تم سے عذر کریں گے (کہ ہم آپ کے ساتھ نکل نہیں سکے تھے)۔ہم کو ہمارے مال مواشی اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں نے مشغول کیے رکھا۔(یہ ہماری کوتاہی تھی)، سو آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔یہ اپنی

۸ے یہ اُس عام بیعت کا ذکر ہے جو ہر ایمان لانے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کرتا تھا۔

۹ے اصل الفاظ ہیں: 'بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ'۔اِن میں 'عَلَيۡهُ' کی ضمیر مجرور پر عام طریقے کے خلاف ضمہ پڑھا گیا ہے۔یہ تبدیلی محض صوت و آہنگ کے تقاضے سے ہے۔اِس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔اِس کی متعدد مثالیں عربی زبان میں موجود ہیں۔

۸۰ے یہ لفظ نہایت بلیغ استعمال ہوا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ خود پیچھے رہے، لیکن درحقیقت خدا کی طرف سے پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے۔اِس لیے کہ اللہ نے پسند نہیں فرمایا کہ اِس طرح کے لوگ خدا کے پیغمبر کی ہم رکابی کا شرف حاصل کریں۔اِن کے دلوں میں جو کچھ تھا، یہ اللہ کی طرف سے اُس کی سزا تھی اور یہ اِسی کے حق دار تھے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَلِلّٰهِ

زبانوں سے وہ بات کہتے ہیں جو اِن کے دلوں میں نہیں ہے۔ اِن سے کہنا، (تم نے دنیا کو اہمیت دی اور خدا کا حق نہیں پہچانا، ذرا بتاؤ کہ) پھر کون ہے جو تمھارے لیے اللہ کو روک دینے کا کچھ اختیار رکھتا ہے[۸۱]، اگر اللہ تم کو کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا تم کو نفع پہنچانا چاہے؟ نہیں، (یہ کوئی عذر نہیں)، بلکہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے۔ (اُسے معلوم ہے کہ تم اِس لیے پیچھے نہیں رہے)، بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ رسول اور (اُس کے ساتھی) اہل ایمان اب کبھی اپنے گھروں کی طرف پلٹ کر نہیں آسکیں گے اور یہ بات تمھارے دلوں میں کھبا دی گئی[۸۲] اور تم نے برے برے گمان کیے اور (اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ) بالآخر تم لوگ برباد ہوئے۔ (یاد رکھو)، جو اللہ اور اُس کے رسول پر سچا ایمان نہیں لائے تو اِسی طرح کے منکرین ہیں جن کے

۸۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا'۔ اِن میں 'مِنْ' کا صلہ دلیل ہے کہ 'يَّمْلِكُ' یہاں 'يَمْنَعُ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔

۸۲۔ یہ اُسی قانون کے مطابق ہوا جو ہدایت و ضلالت کے باب میں بیان ہوا ہے کہ جب کوئی شخص برائی کو پسند کرتا ہے تو کچھ مہلت دینے اور تنبیہ کرنے کے بعد وہ برائی اُس کے لیے پسندیدہ تر بنا دی جاتی ہے، یہاں تک کہ بالآخر اُسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ

لیے ہم نے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے اور (وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، اِس لیے کہ) زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ وہی جس کو چاہے گا، بخشے گا اور جس کو چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق)، سزا دے گا۔ اور (جواب بھی پلٹنا چاہیں تو) اللہ مغفرت فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۱-۱۴

تم لوگ (آیندہ) جب غنیمتیں لینے کے لیے جانے لگو گے[۸۳] تو یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہیں گے کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی بات کو بدل دیں[۸۴]۔ اِن سے صاف کہہ دینا کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ یہی بات تو اللہ نے تم کو پہلے فرمائی تھی[۸۵]۔ (جب پیغمبر سفر کے لیے نکلے

۸۳؎ یعنی ایسے معرکوں کے لیے جانے لگو گے جن میں بغیر کسی جنگ کے بہت کچھ مال غنیمت حاصل ہونے کی توقع ہوگی۔ آیت میں اِس کے لیے 'لِتَاْخُذُوْھَا' کا لفظ ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ گویا مسلمان گھروں سے نکلے ہی اِس لیے کہ بغیر لڑے بھڑے مال غنیمت باندھ کر واپس آجائیں۔

۸۴؎ یعنی وہ بات جو سورہ کے شروع میں فرمائی ہے کہ اللہ اِن منافقین اور منافقات کو، جو اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے رہے، اب اِن کے جرائم کی سزا دینا چاہتا ہے۔

۸۵؎ یعنی تم کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی، جس کا اب تقاضا کر رہے ہو۔

كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥﴾

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦﴾

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى

الفتح ۴۸

تھے)[۸۶]! اِس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ نہیں، بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو۔ ہرگز نہیں، بلکہ یہی لوگ بہت کم سمجھتے ہیں۔ ۱۵

یہ جو اہل بدو میں سے پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، اِن سے کہنا کہ عنقریب تمھیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم اُن سے لڑو گے یا وہ اسلام قبول کرلیں گے۔[۸۷] پھر اگر تم نے حکم کی اطاعت کی تو اللہ تمھیں اچھا اجر دے گا اور اگر (کہیں اُس وقت بھی) سرتابی کی، جیسے پہلے سرتابی کر چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک عذاب سے دوچار کردے گا۔ ۱۶

(اِس سے صرف معذورین مستثنیٰ ہوں گے، اِس لیے کہ) اندھے پر کوئی گناہ نہیں،

۸۶؎ یعنی عمرے کے سفر کے لیے، جس کے نتیجے میں حدیبیہ کا معاہدہ ہوا۔

۸۷؎ یہ اشارہ قریش کی طرف ہے۔ عرب میں اُنھی کی قوت وصولت ایسی تھی جس کے لیے یہ الفاظ موزوں ہو سکتے ہیں۔ پھر اسلام یا تلوار کا معاملہ بھی اُنھی کے ساتھ تھا، اِس لیے کہ خدا کے رسول کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُس کی قوم کے لیے یہی دو راہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ ایک سنت الٰہی ہے جس کی وضاحت ہم پیچھے کئی جگہ کر چکے ہیں۔

الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا

(اگر وہ جہاد کے لیے نہ نکلے۔ اِسی طرح) لنگڑے پر بھی گناہ نہیں اور نہ مریض پر کوئی گناہ ہے، (اگر وہ اطاعت پر قائم ہوں)۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہے گا، اللہ اُس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اور جو روگردانی کرے گا، اُسے وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا۔ ۱۷

(تمھیں خوش خبری ہو کہ) اللہ ایمان والوں سے راضی ہو گیا، جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے،[۸۸] اُس وقت اللہ نے جان لیا جو کچھ اُن کے دلوں

۸۸؎ یہ اُس بیعت کا ذکر ہے جو حدیبیہ کے مقام پر صحابۂ کرام سے اُس وقت لی گئی تھی، جب یہ افواہ پھیل گئی کہ قریش نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی حیثیت سے اُن کے پاس مذاکرات کے لیے گئے تھے۔ اِس میں درخت کے ذکر سے قرآن نے غربت و مسافرت کی اُس حالت کی طرف اشارہ کرنا چاہا ہے جس میں اسلام کی تاریخ کا یہ عظیم واقعہ پیش آیا۔ اِسے بیعت رضوان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اِس کو یہ نام اِسی آیت میں خدا کی خوشنودی کے اعلان سے ملا ہے۔ صحابۂ کرام نے یہ بیعت اُس وقت کی، جب اُنھیں معلوم تھا کہ اُن میں سے کسی کے پاس ایک تلوار کے سوا کوئی اسلحہ نہیں ہے، وہ جنگی لباس بھی ساتھ نہیں لائے، بلکہ احرام کی چادریں باندھے ہوئے ہیں، اُن کا جنگی مستقر بھی میلوں دور ہے اور دشمن کا مستقر، جہاں سے وہ ہر قسم کی مدد لا سکتا ہے، چند میل کے فاصلے

قَرِیبًا ﴿۱۸﴾ وَّ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً یَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَکُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَکُمْ هٰذِهٖ

میں تھا[89] تو اُس نے اُن پر طمانیت اتار دی[90] اور اُن کو ایسی فتح عطا فرما دی جو عنقریب ظاہر ہونے والی ہے اور بہت سی غنیمتیں بھی، جن کو وہ حاصل کریں گے۔[91] اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ ۱۸-۱۹

(ایمان والو)، اللہ نے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ تم سے کیا ہے جو تم حاصل کرو گے۔ سو یہ (پہلی فتح کے) غنائم تو اُس نے فوری طور پر تمھیں عطا کر دیے ہیں[92]

الفتح ۴۸

پر واقع ہے۔ اِس طرح کے خطرناک حالات میں یہ بیعت وہی لوگ کر سکتے تھے جو انتہائی صادق و مخلص اور خدا اور رسول کی وفاداری میں درجۂ کمال پر فائز ہوں۔

۸۹ یہ اُس توجہ اور انابت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بھروسے پر بالکل بے سروسامانی کی حالت میں یہ بیعت کرتے وقت اُن کے دلوں میں پیدا ہوئی ہوگی۔

۹۰ یعنی اپنی خاص عنایت سے ایسا اطمینان اُن کے دلوں میں پیدا کر دیا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنے فیصلے پر جمے رہے۔ یہ وہ سب سے بڑی نصرت ہے جو سنت الٰہی کے مطابق اُن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو خدا کے حکم پر اُس کی راہ میں جہاد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔

۹۱ یہ اُن فتوحات اور غنائم کی طرف اشارہ ہے جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد معاً مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔ اِن میں سب سے نمایاں فتح خیبر تھی جس سے یہ اعتقاد اُن کے دلوں میں راسخ ہو گیا کہ اللہ کے دوسرے وعدے بھی لازماً پورے ہوں گے اور حدیبیہ کا جو معاہدہ وہ کر کے آئے ہیں، وہ بھی درحقیقت اُن کی شکست نہیں، بلکہ اُن کے لیے فتح مبین ہے۔

۹۲ یعنی فیصلہ کر دیا ہے کہ اِبھی تم حملہ کرو گے اور اِبھی اِنھیں حاصل کر لو گے۔ یہ اشارہ غالباً خیبر کی طرف ہے، اِس لیے کہ روایتوں کے مطابق حدیبیہ کے فوراً بعد اِسی کے غنائم مسلمانوں کو حاصل ہوئے تھے۔

وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٢٠﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا

اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے ہیں[۹۳] کہ یہ موجب طمانیت ہو[۹۴] اور ایمان والوں کے لیے (خدا کی نصرت کی) ایک نشانی بن جائے اور وہ تم کو سیدھی راہ کی ہدایت بخشے۔[۹۵] اِس کے علاوہ ایک فتح اور بھی ہے جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے[۹۶]، مگر اللہ نے اُس کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۲۰-۲۱

یہ منکرین (جن سے تم معاہدہ کر کے آئے ہو)، اگر (اِس موقع پر) تم سے

۹۳؎ یعنی قریش کے ہاتھ، جو معاہدۂ حدیبیہ کی رو سے پابند ہو چکے تھے کہ دس سال تک مسلمانوں کے خلاف کوئی جنگی اقدام نہیں کریں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کو اچھا موقع مل گیا کہ حدیبیہ کے فوراً بعد وہ اُن یہودیوں سے نمٹ لیں جو خیبر میں اُن کے خلاف مورچے بنائے بیٹھے تھے۔

۹۴؎ یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جو عربیت کے اسلوب پر اصل میں حذف کر دیا ہے۔

۹۵؎ یعنی ٹھیک اُس طریقے پر لے آئے جس کی روایت ابراہیم علیہ السلام نے اِس سرزمین میں قائم کی تھی اور جسے اب صدیوں سے فراموش کر دیا گیا ہے۔

۹۶؎ اِس سے فتح مکہ ہی مراد ہو سکتی ہے جو اِس تمام جدوجہد کا اصلی مقصود تھی تاکہ خدا کی زمین پر اُس کی عبادت کا اولین معبد ایک مرتبہ پھر اُسی کی عبادت کے لیے خاص کر دیا جائے۔

وَّلَا نَصِيرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِىْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾

وَهُوَ الَّذِىْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيرًا ﴿٢٤﴾

جنگ کرتے تو ضرور پیٹھ پھیرتے،[97] پھر اپنے لیے کوئی حامی اور کوئی مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور اللہ کی سنت میں تم کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔[98] ۲۲-۲۳

وہی ہے جس نے مکہ کی وادی[99] میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ اُن سے روک دیے، اِس کے بعد کہ اُس نے تم کو اُن پر غلبہ عطا کر دیا تھا[100] اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اُسے دیکھ رہا تھا۔[101] ۲۴

۹۷؎ یہ مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ خدا نے حدیبیہ کا معاہدہ اِس لیے نہیں کرایا کہ جنگ میں تمھاری شکست کا اندیشہ تھا۔ اگر جنگ ہوتی تو تمھارے یہ حریف پیٹھ دکھاتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

۹۸؎ یہ اُسی سنت کا حوالہ ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ رسولوں کے منکرین، جب اُن کے مقابلے میں آتے ہیں تو لازماً شکست کھاتے ہیں، اِس لیے کہ خدا کا فیصلہ ہے کہ اُس کے رسول کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔

۹۹؎ اصل میں 'بَطْنِ مَكَّةَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اشارہ حدیبیہ کی طرف ہے جو بالکل مکہ کے دامن میں ہے۔

۱۰۰؎ یہ اُس غلبے کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کو قریش پر اخلاقی اعتبار سے بھی حاصل ہو گیا تھا اور بیعت رضوان کے بعد عزم و حوصلہ کے اعتبار سے بھی۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے اِس اقدام کے بعد آخری درجے میں مرعوب ہو چکے تھے اور لڑنے کا دم خم بالکل کھو چکے

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ

یہ وہی ہیں جنھوں نے (خدا کے پیغمبر کا) انکار کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روک دیا کہ وہیں کھڑے رہ جائیں اور اپنی جگہ پر نہ پہنچنے پائیں[102]۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر (مکہ میں اُس وقت) ایسے مومن مرد اور ایسی مومنہ عورتیں نہ ہوتیں جنھیں تم نہیں جانتے تھے کہ (حملہ کرتے تو) روند ڈالتے، پھر اِن کے باعث تم پر بے خبری میں الزام آجاتا[103] تو ہم جنگ کی اجازت دے دیتے[104]، لیکن ہم

تھے، مگر کسی نہ کسی طریقے سے اپنی آن رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۰۱؎ یعنی خود جائزہ لے رہا ہے کہ اِس وقت تمھارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ چنانچہ جو کچھ ہوا، اُس کی حکمت کے مطابق ہوا اور وہی ہوا جس میں تمھاری اور اُس مشن کی بہتری تھی جس کے لیے اُس نے اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا ہے۔

۱۰۲؎ مطلب یہ ہے کہ اللہ اِن کے جرائم سے واقف تھا اور یہ جرائم ایسے نہیں تھے کہ اِنھیں معاف کر دیا جاتا، کیونکہ بادشاہ کائنات کے حضور میں جو ہدیے لائے گئے تھے، اِن ظالموں نے اُن کو بھی روک دیا تھا۔ آیت میں 'هَدْی' کے ساتھ 'مَعْكُوْفًا' کا لفظ اِسی صورت حال کی نزاکت کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ فرمایا کہ اِس کے باوجود اُس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ ابھی اِن کے جرائم کی، یہاں تک کہ اِس گستاخی کی سزا بھی اِنھیں نہ دی جائے۔

۱۰۳؎ یعنی تم جو کرتے، لاعلمی میں کرتے، مگر قریش کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ یہ لوگ تو لڑائی میں خود اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔

۱۰۴؎ یہ 'لَوْ' کا جواب ہے جو اصل میں حذف کر دیا ہے اور یہ حذف متکلم کی شدت غضب

لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٢٥﴾

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ

نے اِس لیے اجازت نہیں دی کہ اللہ جس کو چاہے، (ایمان کی توفیق دے اور) اپنی رحمت میں داخل کر لے۔[105] یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ لوگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم اُن میں سے منکرین کو دردناک عذاب سے دوچار کر دیتے۔[106] ۲۵

اُس وقت کو یاد رکھو، جب اِن منکروں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کر لی،

الفتح ۴۸

پر دلیل ہے۔ آگے 'لَوْ تَزَيَّلُوْا' سے جو فقرہ شروع ہوا ہے، اُس نے اِس حذف کو کھول دیا ہے۔

۱۰۵۔ یہ اللہ تعالیٰ نے وہ مصلحت بیان فرمائی ہے جس کی بنا پر معاہدۂ حدیبیہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ سے روک دیا۔ فرمایا کہ اُس وقت قریش کے اندر ایسے بہت سے لوگ تھے جو یا اپنے دل میں شرک سے تائب ہو کر توحید پر ایمان لا چکے تھے یا ایمان کے قریب پہنچ چکے تھے اور حالات معتدل ہو جاتے تو یقینی تھا کہ ایمان لے آئیں گے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ انتہائی غضب کے موقعوں پر بھی اللہ تعالیٰ کس طرح انصاف کا معاملہ کرتا اور جو اُس کی طرف آنا چاہیں، کس طرح کمال رحمت و شفقت سے اُن کی حفاظت فرماتا ہے، یہاں تک کہ اِس کے لیے اپنے پیغمبر کے سچے جان نثاروں کی آزردگی بھی گوارا کر لیتا ہے۔ نیز اِس سے یہ سبق بھی ملا کہ اخلاقی تقاضے دوسری ہر چیز سے مقدم ہیں، یہاں تک کہ اُن کے لیے اگر اپنے احساس حمیت، بلکہ اُس سے بھی آگے کسی جذبے کی قربانی دینی پڑے تو اُس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

۱۰۶۔ اِس سے مسلمانوں کا حملہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور اُس طرح کا کوئی آسمانی عذاب بھی، جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں پر آتا رہا ہے۔ رسولوں کے باب میں یہی اللہ کی سنت ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

زمانۂ جاہلیت کی سی حمیت[۱۰۷] تو اللہ نے اپنے رسول پر اور اُس کے ماننے والوں پر اپنی طمانیت نازل فرمائی[۱۰۸] اور اُنھیں تقویٰ کی بات کا پابند رکھا[۱۰۹] اور وہ اُس کے حق دار

۱۰۷۔ یہ حق و عدل کے بالکل خلاف محض اپنی ناک کی خاطر اور اپنی بات کی پچ میں بعض چیزوں پر اصرار کا جو رویہ قریش کی قیادت نے اختیار کیا، اُس کی تعبیر ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اُن پر یہ حقیقت واضح تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف عمرے کے لیے تشریف لائے ہیں، جنگ کا نہ آپ کے دل میں کوئی خیال ہے، نہ اُس کا آپ کے پاس کوئی سامان ہی ہے، لیکن اِس کے باوجود وہ کسی طرح آپ کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے اور اُس کے حضور میں اپنے لائے ہوئے ہدیے پیش کرنے کی اجازت دینے پر راضی نہ ہوئے۔

حضور نے اپنے جو سفیر اُن کے پاس اپنی آمد کی غرض سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجے، اُن کی سفارتی حیثیت کا نہ صرف یہ کہ اُنھوں نے کوئی احترام نہیں کیا، بلکہ اُن میں سے ایک سفیر کے وہ قتل کے درپے ہوگئے اور دوسرے کو اُنھوں نے اِس طرح لیت و لعل میں رکھا کہ مسلمانوں کے اندر یہ افواہ پھیل گئی کہ اُس کو بھی اُنھوں نے قتل کر دیا۔

معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط طے کرنے میں اُنھوں نے بالکل بے ضرورت الجھنیں پیدا کیں اور ایسی شرطیں اُس میں داخل کرنے پر اصرار کیا جن کا کوئی سیاسی فائدہ ان کو حاصل نہیں ہوا، بس وقتی طور پر اُن کو یہ تسلی ہوگئی کہ اُن کی بات اونچی رہی۔" (تدبر قرآن ۷/ ۴۶۴)

۱۰۸۔ یعنی اُن کو توفیق دی کہ انتہائی اشتعال کے موقع پر بھی وہ صبر، حلم، رزانت اور حکمت و تدبر کے ساتھ معاملہ کریں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اجتماعی زندگی میں ایسے مراحل بہت پیش آتے ہیں، جب کسی جماعت کے حلم و تدبر کا نہایت سخت امتحان ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اگر جماعت حریف کے رویے سے مشتعل ہو

الفتح ۴۸

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾
لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِينَ ۙ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ

اور اُس کے اہل بھی تھے[110] اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے[111]۔ ۲۶

(اِس لیے مطمئن رہو، ایمان والو)، یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو بالکل سچا خواب دکھایا تھا[112]۔ بے شک، اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہوگے، پورے

الفتح ۴۸

کر کوئی عاجلانہ قدم اٹھا دے تو اِس سے اصل مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ایسے امتحانات سے کوئی جماعت اور اُس کے لیڈر حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور یہ توفیق اُن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر حال میں اپنے رب سے وابستہ رہتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۴۶۴)

۱۰۹؎ یعنی قریش نے جو رویہ اختیار کیا، اُس کا قدرتی ردعمل یہی ہو سکتا تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے، مگر اُن کی تمام اشتعال انگیز حرکتوں کے باوجود مسلمان اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کے فیض سے اپنے اِس شعار پر قائم رہے کہ ہم ہر حال میں اللہ اور اُس کے رسول کے فیصلے پر راضی ہیں۔

۱۱۰؎ یہ وضاحت فرما دی ہے کہ تقویٰ اور اُس پر استقامت کی سعادت ہر مدعی کو حاصل نہیں ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اُنھی کو عطا فرماتا ہے جو اپنے ایمان کی قدر اور اپنے اخلاقی وجود کی حفاظت کرتے اور حالات جیسے بھی ہوں، ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۱۱؎ یہ تسلی کے لیے فرمایا ہے کہ خدا اپنے بندوں کے حالات اور اُن کے احساسات سے بے خبر نہیں ہوتا، لہٰذا اُن کو جب کسی آزمایش میں ڈالتا ہے تو تنہا نہیں چھوڑتا، بلکہ ہر گام پر اُن کا مددگار رہتا ہے۔

۱۱۲؎ یہ اُس خواب کا ذکر ہے جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرے کا سفر کیا جس کے

وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ

امن کے ساتھ، اِس طرح کہ اپنے سر منڈواؤ گے اور بال کتراؤ گے،[۱۱۳] تمھیں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔ بس اتنی بات تھی کہ اللہ نے جان لیا[۱۱۴] جو تم نے نہیں جانا تو اِس سے پہلے اُس نے ایک قریبی فتح[۱۱۵] تمھیں عطا فرما دی۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت

ثمرات ونتائج اِس سورہ میں زیر بحث ہیں۔ حضور اِس سفر کے لیے نکلے تو صحابۂ کرام میں سے ہر شخص کو توقع تھی کہ ہم عمرہ کر کے آئیں گے، مگر جب نتیجہ توقع کے خلاف نکلا اور مسلمانوں کو قریش سے معاہدہ کر کے عمرہ کیے بغیر لوٹنا پڑا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جب یہ سفر اللہ کے حکم سے ہوا تھا تو ہم بے نیل مرام کیوں واپس جا رہے ہیں؟ اوپر صلح حدیبیہ کی مصلحتیں اِسی سوال کے جواب میں واضح کی گئی ہیں۔ یہ مزید وضاحت ہے کہ عمرہ ضرور ہوگا۔ اِس کا وعدہ اللہ نے کر رکھا ہے اور تم اگر غور کرو تو جو معاہدہ کر کے آئے ہو، اُس سے اُسی کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ اب تم بغیر کسی خطرے کے اگلے سال عمرے کے لیے جا سکتے ہو۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ لوگوں کی پریشانی محض اُن کی توقعات اور حضور کے عزم سفر کی وجہ سے تھی، ورنہ خواب میں یہ وعدہ ہرگز نہیں کیا گیا تھا کہ یہ عمرہ اِسی سال لازماً ہوگا۔

۱۱۳۔ عمرے کے مناسک میں یہ آخری چیز ہے جو اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مدعا یہ ہے کہ جس عبادت کے لیے جا رہے ہو، اُس کے تمام مناسک پورے کرو گے۔ آگے کا جملہ اِس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

۱۱۴۔ یعنی یہ جان لیا کہ اگرچہ اِس سال تم لوگ عمرہ نہیں کر سکو گے، مگر آگے عمرے کی راہ نہ صرف یہ کہ اِس سفر سے کھل جائے گی، بلکہ ایک ایسی قریبی فتح بھی حاصل ہوگی جو آیندہ تمام فتوحات کی راہ کھول دے گی۔

۱۱۵۔ اِس سے وہی معاہدۂ حدیبیہ مراد ہے جس کو سورہ کی تمہید میں فتح مبین سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِس کو قریبی فتح فتح مکہ کی رعایت سے کہا ہے جو ابھی کچھ دور تھی۔

الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۲۸﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ

اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اِس سرزمین کے تمام ادیان پر وہ اُس کو غالب کر دے۔[116] (یہ ہو کر رہنا ہے) اور اِس کی گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۲۷-۲۸

محمد، اللہ کے رسول[117] اور جو اُن کے ساتھ ہیں، وہ منکروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔[118] تم اُن کو اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع و سجود

۱۱۶ یہ آخری فتح کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے اپنی یہ شانیں دکھائی ہیں، اُس پر بھروسا رکھو۔ اُس نے اپنے پیغمبر کو مغلوب ہو جانے کے لیے نہیں بھیجا۔ لہٰذا اِس قریبی فتح کے بعد جو حدیبیہ میں تم کو حاصل ہوئی ہے، اب فتح مکہ بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ رسولوں کے باب میں خدا کی یہی سنت ہے کہ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ اُن کے منکرین پر اُن کو غلبہ عطا فرماتا ہے۔

۱۱۷ آیت میں 'رَسُوْلُ اللّٰهِ' کے الفاظ ہمارے نزدیک عطف بیان کے حکم میں ہیں۔ چنانچہ آگے جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اُس پوری جماعت سے متعلق ہے جس میں آپ کی حیثیت گل سرسبد کی تھی۔

۱۱۸ یہ اُن منافقین کے مقابل میں مخلصین صحابہ کا کردار بیان کیا ہے جو مسلمانوں کے لیے تو روز بد کے منتظر رہتے تھے، مگر کفار میں اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے تھے کہ کوئی خطرہ پیش آیا تو وہ اُنھی کے ساتھ ہوں گے۔ فرمایا کہ پیغمبر کے یہ ساتھی آپس میں نہایت رحم دل اور سہل الانقیاد ہیں، مگر اپنے ایمان کی پختگی اور سیرت کی مضبوطی کے لحاظ سے منکروں کے لیے گویا پتھر کی چٹان ہیں۔ اُن میں سے کوئی اُن کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ آیت میں اِس کے لیے 'اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ' کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ اُن کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ منکروں کے ساتھ درشتی اور تندخوئی سے پیش آتے ہیں۔

وَرِضْوَانًا ز سِيمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ج صلے وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ قف ج كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ

میں سرگرم دیکھو گے۔[119] اُن کی پہچان اُن کے چہروں پر سجدوں کے نشان سے ہے۔ یہ اُن کی تمثیل تورات میں ہے[120] اور انجیل میں اُن کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے کھیتی ہو، جس

۱۱۹۔ اوپر خلق کے معاملے میں قدسیوں کی اِس جماعت کے کردار کا بیان تھا اور یہ خالق کے ساتھ اُن کے تعلق کی تصویر ہے جس سے اُن کی توجہ الی اللہ اور شب بیداری اور تہجد گزاری کو نمایاں کیا ہے۔ آگے اِسی کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ کثرت سجود سے اُن کی پیشانیوں پر نشان پڑ گئے ہیں جن سے تم اُن کو بالکل الگ پہچان سکتے ہو۔

۱۲۰۔ یہ اشارہ غالباً کتاب استثنا کی اُن آیات کی طرف ہے جن میں آپ کے صحابہ کے لیے 'قدوسیوں' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔ اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی۔ وہ بے شک، قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اُس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں اور تیرے قدموں میں ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہوگا۔" (۳۳: ۲-۳)

اِس عبارت میں، معلوم نہیں، کیا کیا تحریفات ہو چکی ہیں۔ تاہم اتنی بات پھر بھی بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے 'تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا' کے الفاظ میں جو کچھ فرمایا ہے، وہی مضمون یہاں 'قدوسیوں' کے لفظ سے اور اِس جملے سے ادا کیا گیا ہے کہ "اور وہ تیرے قدموں میں بیٹھے، ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہوگا۔" اِسی طرح 'اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ' کی جگہ 'آتشی شریعت' کے الفاظ آ گئے ہیں جن کا مدعا وہی ہے جس کی وضاحت مسیح علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں یوں فرمائی ہے کہ "جو اُس پتھر پر گرے گا، وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، لیکن جس پر وہ گرے گا، اُسے پیس ڈالے گا۔*" اِسی طرح فرمایا ہے

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ

نے اپنی سوئی نکالی، پھر اُس کو سہارا دیا، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔[۱۲۱] بونے والوں کے دلوں کو موہتی ہے کہ منکروں کے دل اُن سے جلائے۔[۱۲۲] اللہ نے اُن لوگوں سے جو اُن میں سے ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے ہیں،[۱۲۳]

کہ ''اُس کا چھاج اُس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا اور اپنے گیہوں کو تو اپنے کھتے میں جمع کرے گا، مگر بھوسی کو اُس آگ میں جلائے گا جو بجھنے کی نہیں**۔''

۱۲۱؎ تورات کی تمثیل میں صحابۂ کرام کے زہد و تبتل، اُن کے غلبہ و تمکن اور لوگوں کے ساتھ اُن کے عدل اور رحم کی تصویر ہے۔ انجیل کی تمثیل میں اِس بات کو نمایاں کیا ہے کہ اِن کی ابتدا اگرچہ کونپل کی طرح کم زور تھی، مگر اُس سے ارتقا کرتے ہوئے یہ ایک دن تناور درخت بن گئے جس کے سایے میں بڑی بڑی قوموں نے پناہ لی۔ متی میں یہ تمثیل اِس طرح نقل ہوئی ہے:

''اُس نے ایک اور تمثیل پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اُس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے، لیکن جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اُس کی ڈالیوں میں بسیرا کرتے ہیں۔'' (۱۳: ۳۱-۳۲)

استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہ تمثیل معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ مرقس باب ۴ اور لوقا باب ۸ میں بھی آئی ہے۔ اِسی تمثیل کی قرآن نے یوں وضاحت فرمائی کہ جو حال کھیتی کی نشو و نما کا ہوتا ہے، وہی حال اسلام کے تدریجی عروج و کمال کا ہو گا۔ کھیت میں جو دانے بوئے جاتے ہیں، اول اول وہ

* متی ۲۱: ۴۴۔

** متی ۳: ۱۲۔

مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾

مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ ۲۹

باریک سوئیاں سی نکالتے ہیں، پھر اُن کو مزید سہارا ملتا ہے جس سے سوئیاں موٹی اور قوی ہو جاتی ہیں اور کھیتی اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح ایک دن آئے گا کہ جو تخم حق عرب کی سرزمین میں بویا گیا ہے، اُس کی فصل شباب پر آئے گی جو اپنے بونے اور آب یاری کرنے والوں کے دلوں کو تو موہ لے گی اور ساتھ ہی اُن لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے جلائے گی جنھوں نے اُس کی نشو و نما کو روکنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔''

(تدبر قرآن ۷/۴۷۵)

۱۲۲؎ یہ غایت اور انجام کا بیان ہے۔ آیت میں اِسے 'لِيَغِيۡظَ' کے 'ل' سے ادا کیا ہے۔ عربی زبان میں یہ اِس مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔ تمثیل کے آخر میں 'منکروں' کا لفظ اُس کے اصل مصداق پر روشنی ڈالتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...تمثیل میں یہاں مراد چونکہ اہل ایمان ہیں، اِس وجہ سے آخر میں یہ ظاہر کر کے کہ اُن کا عروج بالآخر ایک دن کفار کے لیے باعث حسرت و حسد ہو گا، گویا اِس تمثیل کے ممثل کو ظاہر کر دیا ہے۔ عربی زبان میں تمثیلات و استعارات کے اندر یہ طریقہ معروف ہے کہ آخر میں کسی لفظ کے ذریعے سے تمثیل یا استعارے کے ممثل یا مستعار لہٗ کو واضح کر دیتے ہیں تاکہ اصل مدعا واضح ہو جائے۔'' (تدبر قرآن ۷/۴۷۶)

۱۲۳؎ یہ اِس لیے فرمایا کہ مخاطبین پر واضح ہو جائے کہ بشارت صرف مخلصین کے لیے ہے، اُن منافقین کے لیے نہیں ہے جن کا رویہ اِس سورہ میں زیر بحث ہے۔

کوالالمپور

۱۲/ ستمبر ۲۰۱۴ء

الحجرات

۴۹

الحجرات

یہ ایک منفرد سورہ ہے جس پر قرآن مجید کا یہ پانچواں باب ختم ہو جاتا ہے۔ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ سابق سورہ ـــــ الفتح ـــــ کا تکملہ ہے۔ سورۂ فتح کی آخری آیت میں تورات کے حوالے سے صحابۂ کرام کی جو تمثیل بیان ہوئی ہے، یہ پوری سورہ گویا اُسی کی تفسیر ہے۔ چنانچہ اِس کا موضوع وہی تزکیہ و تطہیر ہے جو پچھلی دونوں سورتوں سے چلا آ رہا ہے۔ اِس کے تحت اِس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے باہمی حقوق سے متعلق ضروری ہدایات دی گئی ہیں۔

اِس میں خطاب اہل ایمان سے ہے اور اِس کے مضمون سے واضح ہے کہ مدینۂ طیبہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ تزکیہ و تطہیر میں اُس وقت نازل ہوئی ہے، جب آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کا وقت قریب آ گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ اخلاقی تربیت کی کمی، باہمی منافرت اور قبائلی عصبیت کے جھگڑے اُن کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دے سکتے ہیں۔

سورۃ الحجرات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

ایمان والو[1]، اللہ اور اُس کے رسول کے آگے اپنی رائے کو مقدم نہ کرو[2] اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے[3]۔ ۱

۱۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن مضمون کے تدریجی ارتقا سے واضح ہو جائے گا کہ روے سخن درحقیقت اُن اہل بدو کی طرف ہے جو مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام تو لے آئے تھے، مگر ابھی تک نہ ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھتے تھے اور نہ صحابۂ کرام کی صحبت سے دور ہونے کی وجہ سے اپنی کچھ تربیت ہی کر پائے تھے۔ پھر یہی نہیں، اُن کے سردار خاص کر ایک غلط قسم کے پندار میں بھی مبتلا تھے کہ اُنھوں نے بغیر کسی جنگ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کر لی ہے تو آپ پر یہ اُن کا احسان ہے۔ چنانچہ اُن کا یہ پندار اُن کے انداز گفتگو اور طرز عمل، ہر چیز سے نمایاں ہوتا تھا۔

۲۔ یعنی خدا کے رسول کو اپنے سرداروں کی طرح ایک سردار سمجھ کر اور اپنے آپ کو اُن سے زیادہ مدبر خیال کر کے اپنی رائے سے آپ کو متاثر کرنے یا آپ کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنے کی کوشش نہ کرو، اِس لیے کہ یہ درحقیقت خدا کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''(آیت میں) 'بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کا رسول اللہ کا سفیر و نمایندہ ہوتا ہے۔ اُس کو بن پوچھے مشورہ دینا خود اللہ تعالیٰ کو مشورہ دینا ہے، اُس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا اللہ کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا ہے اور اُس سے بڑھ کر اپنے آپ کو مدبر سمجھنا خود خداے علیم و حکیم

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ

ایمان والو، اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز پر اونچا نہ ہونے دو اور نہ اُس کو اُس طرح آواز دے کر پکارو، جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو[4]۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارا کیا کرایا سب اکارت ہو جائے[5] اور تمھیں احساس بھی نہ ہو[6]۔ (یاد رکھو)،

الحجرات
۴۹

سے بڑھ کر اپنے کو مدبر و حکیم سمجھتا ہے۔ یہ آدمی کے اِس رویے کے لازمی نتائج ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو اُس کی بلادت کے سبب سے اِن نتائج کا احساس نہ ہو، لیکن اِن کے لازمی نتائج ہونے سے انکار ناممکن ہے۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۴۸۷)

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہی حیثیت آپ کی لائی ہوئی ہدایت کی ہے۔ اب وہ آپ کی قائم مقام ہے اور اُس کے ساتھ بھی ہر مسلمان کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو یہاں بتایا گیا ہے۔

۳؎ لہٰذا جو کچھ کرو گے، وہ اُس سے چھپا نہیں رہے گا۔ اُس کے نتائج بھی لازماً بھگتنا پڑیں گے۔

۴؎ اِس لیے کہ یہ چیز غمازی کرتی ہے کہ تم نے نہ صرف یہ کہ خدا کے رسول کا مرتبہ نہیں پہچانا، بلکہ اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہو کر اِس حقیقت کو بھی نہیں سمجھے کہ تم کسی عام آدمی یا اپنے کسی سردار سے نہیں، بلکہ خدا کے رسول سے مخاطب ہو اور اُس سے کچھ سیکھنے کے لیے آئے ہو، اُس کو سکھانے یا بتانے کے لیے نہیں آئے۔

۵؎ یعنی رسول کا درجہ ایسا غیر معمولی ہے کہ اُس کی عزت اور احترام میں ذرا سی کمی بھی ہو جائے تو یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اِس سے آدمی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو سکتی ہے۔ اِس لیے متنبہ ہو جاؤ، اِس ہستی کا احترام، درحقیقت خدا کا احترام ہے جس نے اِس کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔

رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰى ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۳﴾

جو اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کی افزایش کے لیے جانچ کر منتخب کر لیا ہے۔[ے] اُن کے لیے مغفرت بھی ہے اور اجر عظیم بھی۔۲-۳

الحجرات ۴۹

۶؎ یعنی اِس بات کا احساس بھی نہ ہو کہ اسلام قبول کر لینے اور بظاہر دین کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جانے کے باوجود کیا کھو بیٹھے ہو؟

۷؎ اصل میں لفظ 'اِمْتَحَنَ' آیا ہے۔ یہ یہاں 'اِصْطَفٰی' یا اِس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر دل کو تقویٰ کی تخم ریزی اور اُس کی افزایش کے لیے منتخب نہیں کرتا۔ اِس کے لیے وہی دل منتخب کیے جاتے ہیں جن کے اندر اللہ و رسول کے لیے انقیاد و اطاعت کا سچا جذبہ اور اُن کے آگے عاجزی کا صحیح شعور ہوتا ہے۔ یہ اُس سنت کی فرع ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر ہے۔ لہٰذا یہ جذبہ و شعور جس کے اندر جتنا کم یا زیادہ ہوتا ہے، اُس کو تقویٰ کی نعمت بھی اُسی کے لحاظ سے ملتی ہے۔ یہاں اِسے پیغمبر کے آگے اپنی آواز کو پست رکھنے سے متعلق کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اِسی باطن کا ظاہر ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...جو شخص کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کا یہ عمل شہادت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُس سے اونچا خیال کرتا ہے۔ یہ چیز اکتساب فیض کی راہ بالکل بند کر دیتی ہے۔ اگر استاد کے آگے کسی شاگرد کا یہ طرز عمل ہو تو وہ اُس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ اِسی طرح اگر اللہ کے رسول کے آگے کسی نے یہ روش اختیار کی تو وہ صرف رسول ہی کے فیض سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی محروم ہو جائے گا۔ اِس لیے کہ رسول اللہ تعالیٰ کا نمایندہ ہوتا ہے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۴۸۹)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ

اِس میں کچھ شک نہیں، (اے پیغمبر) کہ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، اُن میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے[8]۔ اگر یہ لوگ صبر کے ساتھ انتظار کر لیتے کہ تم خود اِن کے پاس نکل کے آجاتے تو یہ اِن کے حق میں بہت بہتر ہوتا[9]۔ بہر حال (درگذر کرو)، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۴-۵

ایمان والو، اگر (اِن پکارنے والوں میں سے) کوئی فاسق[10] تمھارے پاس کوئی

۸۔ یہ اُنھی لوگوں کا طرزِ عمل بیان ہوا ہے، اوپر جن کے اندازِ گفتگو کا ذکر ہے۔ اِس کا باعث وہی پندار تھا جس میں یہ لوگ مبتلا تھے۔ اِن کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم نے آپ کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ لہٰذا ملنے کے لیے آئیں تو آپ کو چاہیے کہ بلا تاخیر ہمارا خیر مقدم کریں۔ چنانچہ اگر کبھی آپ کو مجلس میں تشریف فرما نہ دیکھتے تو حجروں کے باہر ہی سے آپ کو پکارنا شروع کر دیتے تھے۔ آیت میں اِن کی ناسمجھی پر ملامت بھی ہے اور اُس سے درگذر کرنے کا اشارہ بھی کہ ہر چند اِن کی حرکت نہایت ناشایستہ ہے، مگر اِن کی اکثریت آپ کے مقام و مرتبہ سے آشنا نہیں ہے، اِس لیے عفو و درگذر ہی بہتر ہے۔

۹۔ آیت کا اسلوب اِن لوگوں کی محرومی پر اظہارِ حسرت کا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس چشمۂ فیض پر پہنچے تھے، اگر اِنھوں نے اُس کی صحیح قدر پہچانی ہوتی تو اُس سے سیراب ہو کر لوٹتے۔ لیکن یہ اِن کی محرومی ہے کہ وہاں سے کچھ پانا تو درکنار، اپنی نادانی و ناقدر شناسی کے باعث یہ کچھ کھو کے پلٹے!“ (تدبر قرآن ۷/ ۴۹۱)

۱۰۔ اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین و اخلاق کے حدود سے بے پروا ہوں۔

تُصِيبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴿٦﴾

اہم خبر[11] لائے تو اُس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو[12]۔ ایسا نہ ہو کہ تم جذبات سے مغلوب ہو کر[13] کسی قوم پر جا چڑھو[14]، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ اور تم یہ بات بھی اچھی طرح

۱۱؎ یعنی کوئی ایسی خبر جو دور رس نتائج کی حامل ہو۔ اوپر بدوی قبائل کے جن سرداروں کا رویہ بیان ہوا ہے، وہ بعض اوقات اپنے حریفوں سے پرانے حساب چکانے کے لیے اُن کے بارے میں غلط صحیح خبریں صحابہ تک پہنچاتے اور اُن کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔ یہ غالباً اِسی طرح کی خبروں کا ذکر ہے۔

۱۲؎ یعنی خبر کی بھی اور خبر دینے والے کی بھی۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اطلاع دینے والا اگر کوئی مجہول شخص ہے جس کا نہ فسق معلوم ہے اور نہ ثقاہت تو اُس کی تحقیق بھی لازماً ہونی چاہیے۔ ہمارے محدثین نے اِسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کی روایت کرنے والوں کی تحقیق کی ہے اور اگر کسی راوی کی تحقیق میں اُن کو کامیابی نہیں ہوئی تو اُسے مجہول قرار دے کر اُس کی روایت کو اُنھوں نے رد کر دیا ہے۔ اِسی طرح فقہا اور مجتہدین نے خبر کی تحقیق کے اصول وضع کیے ہیں جنھیں درایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آیت پر غور کیجیے تو اِس میں اصلاً اِسی دوسری بات کی تاکید ہے، اِس لیے کہ راوی کا فسق تو یہاں پہلے سے معلوم ہے۔

۱۳؎ اصل میں اِس کے لیے لفظ 'جَهَالَة' آیا ہے۔ یہ جوش و ہیجان کے معنی میں ہے۔ عربی زبان میں یہ جس طرح لاعلمی کے معنی میں آتا ہے، اُسی طرح اِس مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔

۱۴؎ یعنی اِن لوگوں کی باتوں میں آ کر کسی بے گناہ قبیلے یا گروہ کے خلاف کوئی اقدام کر بیٹھو۔ اِس طرح کا اقدام، خاص طور پر مسلمانوں ہی کے کسی گروہ کے خلاف اگر کیا جاتا تو یہ نہ صرف صریح عدوان ہوتا جس کی دین و اخلاق میں کوئی گنجایش نہیں ہے، بلکہ اجتماعی مصالح کے بھی خلاف ہوتا جن کی رعایت اُس وقت کی نازک صورت حال میں اور بھی ضروری تھی۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝۷

جان رکھو کہ تمھارے اندر خدا کا رسول موجود ہے، (لہٰذا کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ اپنی رایوں پر اصرار کرو)۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لیا کرے تو تم بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے[۱۵] (جس طرح اِس سے پہلے پڑے رہتے تھے)، مگر اللہ نے تمھارے آگے ایمان کو محبوب بنایا اور اُس کو تمھارے دلوں میں اچھا کر دکھایا ہے اور کفر اور فسق اور پیغمبر کی نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں سخت ناپسندیدہ ٹھیرایا ہے[۱۶]۔

۱۵؎ اِس لیے کہ تمھاری زیادہ باتیں سنی سنائی اور خام ہوتی ہیں جنھیں تم تحقیق کیے بغیر محض اِن فتنہ پردازوں کے زیر اثر کر دیتے ہو اور پھر اِنھی کے ایما سے اُن پر اصرار بھی کرتے ہو۔

۱۶؎ یعنی ایمان اور کفر، دونوں کو اُن کی حقیقی صورت میں تمھارے سامنے پیش کیا ہے جس سے ایمان تمھارے لیے محبوب اور کفر و عصیان مبغوض بن گیا ہے۔ اِس اہتمام کا اب یہ حق ہے کہ تمھارے کسی قول و فعل میں نہ کفر و عصیان کی کوئی آمیزش ہو اور نہ ایمان کی محبت اور محبوبیت میں کوئی کمی آئے، بلکہ یہ ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ آیت میں 'حَبَّبَ' اور 'کَرَّہَ'، دونوں فعل 'قَدَّمَ' کے مفہوم پر متضمن ہیں جس سے وہ اہتمام خاص نمایاں ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو ایمان کا دل دادہ اور کفر و عصیان سے نفور بنانے کے لیے اپنے رسول کے ذریعے سے فرمایا۔ اِسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ 'حَبَّبَ' کے مفعول کی حیثیت سے صرف ایمان کا ذکر ہے، لیکن 'کَرَّہَ' کے ساتھ کفر، فسق اور عصیان، تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کے کردار پر تبصرہ ہو رہا ہے، وہ ابھی... اُن باتوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے جو ایمان کی ضد ہیں۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ اُن کو

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۸﴾

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۰﴾

الحجرات ۴۹

اللہ کے فضل و احسان سے یہی لوگ راست رو ہیں (کہ اِس نعمت سے بہرہ یاب ہیں) اور اللہ علیم و حکیم ہے۔۶-۸

(تمھاری وحدت اِسی سے قائم ہے، لہٰذا) اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر اُن میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرے، اُس سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلے کی طرف[۱۷] رجوع کر لے۔ پھر اگر رجوع کر لے تو دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرادو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو۔ یقیناً، اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ایمان والے تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے مابین مصالحت کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے[۱۸]۔۹-۱۰

وضاحت سے یہ بات بتائی جائے کہ صرف کفر ہی ایمان کے منافی نہیں ہے، بلکہ فسق و عصیان کے قسم کی ساری باتیں بھی اِسی شجرۂ ملعونہ کے برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اِن کو بھی مبغوض ٹھیرایا۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۴۹۴)

۱۷۔ اِس سے مصالحت کرانے والوں کا فیصلہ مراد ہے۔ اِس کا حکم چونکہ اللہ نے دیا ہے، اِس لیے اِسے اللہ کے فیصلے سے تعبیر کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا

ایمان والو، (اِسی اخوت کا تقاضا ہے کہ) نہ (تمھارے) مرد دوسرے مردوں

۱۸؎ اِن آیتوں میں جو حکم بیان ہوا ہے، اُس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسلمانوں کے دو گروہ اگر کبھی آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں کو اُسے پرایا جھگڑا سمجھ کر اُس سے الگ تھلگ نہیں بیٹھ رہنا چاہیے۔ اِسی طرح یہ بات بھی اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ حق اور ناحق کی تحقیق کیے بغیر محض خاندانی، قبائلی اور گروہی عصبیت کے جوش میں کسی کے حامی اور کسی کے مخالف بن جائیں۔ اُن کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ معاملے کو پوری طرح سمجھ کر فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کریں۔

۲۔ اگر ایک فریق مصالحت پر راضی نہ ہو یا راضی ہو جانے کے بعد پھر ظلم وعدوان کا رویہ اختیار کرے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ طاقت رکھتے ہوں تو اپنی کسی منظّم حکومت کے تحت اُس کے خلاف جنگ کریں، یہاں تک کہ وہ اُس فیصلے کے سامنے سر جھکا دے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ قرآن نے اِس فیصلے کو 'اَمْرُ اللّٰهِ' سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی فریق اِس سے گریز کرے گا تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھکنے سے گریز کرے گا۔

۳۔ فریقین مصالحت پر آمادہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اُن میں سے کسی کے ساتھ نہ بے جا رعایت کی جائے اور نہ کسی کو عدل کے خلاف دبایا جائے، بلکہ ٹھیک انصاف کے مطابق صلح کرائی جائے اور جس کا جو نقصان ہوا ہے، اُسے پورا کرا دیا جائے۔

یہ حکم، ظاہر ہے کہ صرف اُسی صورت سے متعلق ہے، جب مسلمانوں کی کوئی باقاعدہ حکومت موجود ہو جس کے تحت جنگ کی جا سکے۔ یہ صورت نہ ہو تو سیدنا حذیفہ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ ہر مسلمان کو اِس فتنے سے بالکل الگ ہو جانا چاہیے۔*

* بخاری، رقم ۷۰۸۴۔

مِنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ

کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں[19]، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں[20]، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ[21] اور نہ

۱۹؎ یعنی ایمان و عمل کے لحاظ سے بہتر ہوں جن کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزان عدل ہی سے معلوم ہوگا کہ کون رائی ہے اور کون پربت۔ اُس میں اُن چیزوں کا سرے سے کوئی وزن نہیں ہوگا جنھیں تم دنیا میں بڑی اہمیت دیتے ہو۔ چنانچہ یہ حسب و نسب کا ادعا اور عز و شرف کا غرور اُس میں بالکل بے حقیقت ثابت ہوگا۔

۲۰؎ آیت میں 'لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ' کے عام الفاظ اگرچہ کافی تھے، لیکن قرآن نے یہاں مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ کیا ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...قرآن نے فضائل و رذائل، دونوں کے بیان میں یہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکر اُن مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے، جہاں تاکید کے ساتھ اُن کو کسی فضیلت کے لیے ابھارنا یا کسی فتنے سے بچانا مقصود ہے۔ یہاں یہی دوسری صورت ہے۔ جس برائی سے یہاں مردوں کو روکا گیا ہے، وہ عورتوں کے اندر اُس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں پائی جاتی، جتنی مردوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے، اُن کا انداز خطاب و کلام اُن عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۷/ ۵۰۵)

۲۱؎ اصل میں لفظ 'لَمز' استعمال ہوا ہے جس کے معنی طعن کرنے اور آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کسی پر کوئی طنزیہ فقرہ چست کر دینے کے ہیں۔ اِس قسم کے زہر آلود فقرے قائل کے حسد اور اُس کے کبر و غرور کی غمازی کرتے ہیں جس سے دوسروں کی حوصلہ شکنی ہوتی اور باہمی

الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿١١﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ

آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب دو۔[۲۲] (یہ سب فسق کی باتیں ہیں، اور) ایمان کے بعد تو فسق کا نام بھی بہت برا ہے۔[۲۳] اور جو (اِس تنبیہ کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۱۱

ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، اِس لیے کہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے

تعلقات میں ایسا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جو بارہا نفرت و عناد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آیت میں اِس کا مفعول 'اَنْفُسَكُمْ' نہایت بلیغ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے قرآن نے توجہ دلا دی ہے کہ جو لوگ اپنے کسی بھائی کو ہدف طعن بناتے ہیں، استاذ امام کے الفاظ میں، وہ گویا اپنے ہی سینے کو اپنے تیر کا نشانہ بناتے اور اپنے ہی کو مجروح کرتے ہیں۔

۲۲ برا لقب دینا کوئی معمولی برائی نہیں ہے۔ یہ طریقہ بالعموم کسی فرد یا قوم کی انتہائی تذلیل کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس طرح کے القاب آسانی سے زبانوں پر چڑھ جاتے اور نہایت پایدار اور دور رس نتائج پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اِن کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افراد میں خیر خواہی کا رشتہ ختم ہو جاتا اور قومی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

۲۳ یہ مبالغے کا اسلوب ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہ اُسی طرح کی بات ہے، جس طرح کہیں: 'الشریر كاسمه'۔ شریر کا تو لفظ بھی برا ہے، پھر شریر کے برے ہونے کا کیا ٹھکانا ہے! ہماری زبان میں بھی کسی شے کی انتہائی برائی کے اظہار کے لیے یہ اسلوب موجود ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: بھائی، اِس چیز کے تو نام سے بھی گھن آتی ہے۔" (تدبر قرآن ۷/ ۵۰۸)

الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوۡا وَلَا يَغۡتَبْ بَّعۡضُكُمۡ بَعۡضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ يَّاۡكُلَ لَحۡمَ اَخِيۡهِ مَيۡتًا فَكَرِهۡتُمُوۡهُ ؕ وَاتَّقُوا

ہیں۔[24] اور (دوسروں کی) ٹوہ میں نہ لگو[25] اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تمھارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند

۲۴ یہ برے گمانوں سے اجتناب کی ہدایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے کسی بھائی کے بارے میں جو رطب و یابس گمان دل میں پیدا ہو جائے، اُس کو وہیں جگہ دے کر نہ بیٹھ جاؤ، اِس لیے کہ گمانوں کے زیادہ درپے ہو گے تو شدید اندیشہ ہے کہ کسی صریح گناہ میں مبتلا ہو جاؤ گے جو تم کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس سے یہ تعلیم نکلی کہ ایک مومن کو بدگمانیوں کا مریض نہیں بن جانا چاہیے، بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں سے حسن ظن رکھنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اُس کی اچھی توجیہ کرے، اگر کوئی اچھی توجیہ نکل سکتی ہو۔ اُس کے برے پہلو کو اُسی شکل میں اختیار کرنا جائز ہے، جب اُس کی کوئی اچھی توجیہ نہ نکل سکے۔ اگر بدگمانی کے سزاوار سے آدمی کو خوش گمانی ہو تو یہ اِس بات کے مقابل میں اہون ہے کہ وہ کسی خوش گمانی کے حق دار سے بدگمانی رکھے۔'' (تدبر قرآن ۷/۵۰۹)

۲۵ اوپر جس طرح اچھے گمان سے نہیں، بلکہ برے گمان سے روکا ہے، اُسی طرح یہاں اُس ٹوہ میں لگنے سے منع فرمایا ہے جو برے مقصد سے ہو۔ یہ چیز حسد کے جذبے سے بھی پیدا ہوتی ہے اور بغض و عناد کی شدت سے بھی اور یہ دونوں ہی چیزیں اخوت اور باہمی ہم دردی کے اُس تعلق کے بالکل منافی ہیں جو اوپر اہل ایمان کا بیان کیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ اپنے کسی بھائی کی مدد کے لیے اُس کے حالات کو جاننے کی کوشش کی جائے یا ریاست کی سطح پر لوگوں کے اچھے یا برے حالات کی خبر رکھی جائے تاکہ لوگوں کی خیر خواہی اور امن و امان کو قائم رکھنے کی جو ذمہ داریاں ریاست پر عائد ہوتی ہیں، اُنھیں پورا کیا جا سکے تو اِس کا اِس ممانعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾

کرے؟ سو اِسے تو گوارا نہیں کرتے ہو، (پھر غیبت کیوں گوارا ہو)[۲۶]! تم اللہ سے ڈرو۔ یقیناً، اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے[۲۷]۔ ۱۲

۲۶؎ یہ نہایت سخت فہمایش کا اسلوب ہے۔ مدعا یہ ہے کہ غیبت انتہائی گھناؤنا فعل ہے۔ اِس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ مردے کا گوشت کھانا بجاے خود قابل نفرت ہے۔ پھر وہ گوشت بھی اپنے بھائی کا ہو تو اُسے کوئی شخص کس طرح کھانا پسند کر سکتا ہے؟ اِس میں، اگر غور کیجیے تو اپنی مدافعت سے اُس کی بےبسی کی تصویر بھی نمایاں ہے۔ قرآن نے اِس تشبیہ کو پیش کر کے پوچھا ہے کہ تم جب اِس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اِسی طرح کی ایک نہایت مکروہ اور قابل نفرت چیز، غیبت کو کس طرح گوارا کرتے ہو؟

یہ غیبت کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...غیبت کے معنی کسی کی اُس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اُس کے اِس فعل کی خبر اُس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے۔ اِسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اُس کے پیٹھ پیچھے صرف اُن لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اُس کے ہم راز و ہم خیال اور شریک مقصد ہوتے ہیں یا کم از کم اُن سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اُس کے ہم درد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور اُس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۵۱۰)

۲۷؎ یہ تنبیہ بھی ہے اور توبہ و اصلاح کی ترغیب بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اِن گناہوں سے باز آجاؤ۔ اگر اِس ہدایت پر عمل کر کے توبہ کر لو گے تو خدا مہربان ہے۔ وہ تمھاری توبہ ضرور قبول فرمائے گا۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

لوگو، (ایک دوسرے کو بھائی خیال نہیں کرو گے تو اِنھی برائیوں میں پڑے رہو گے، اِس لیے خوب سمجھ لو کہ) ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو (الگ الگ) پہچانو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے[۲۸]۔ (وہ قیامت میں اِسی بنیاد پر فیصلہ کرے گا)۔ یقیناً، اللہ علیم و خبیر ہے۔ ۱۳

۲۸؎ یہ قرآن نے اُس نسلی، خاندانی اور قبائلی غرور کی بنیاد ڈھا دی ہے جو اُن برائیوں میں سے زیادہ تر کا باعث بنتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرمایا کہ تمام انسان آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ کسی گورے کو کالے اور کسی کالے کو گورے پر، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عز و شرف کی بنیاد کسی شخص کے خاندان اور قبیلہ یا رنگ و نسل پر نہیں، بلکہ تقویٰ پر ہے۔ اُس کے ہاں وہی عزت پائے گا جو سب سے بڑھ کر اُس سے ڈرنے والا اور اُس کے حدود کی پابندی کرنے والا ہے، اگرچہ کتنے ہی حقیر اور گم نام خاندان سے اٹھا ہو۔ اور جو سرکشی اور استکبار اختیار کرے گا، وہ لازماً ذلت سے دوچار ہو گا، اگرچہ کتنا ہی بڑا قریشی اور ہاشمی ہو۔ خاندانوں کی یہ تقسیم محض تعارف اور پہچان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کے چہرے مہرے، رنگ اور قد و قامت میں فرق رکھا ہے تا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں، اُسی طرح خاندانوں کی تقسیم بھی اِسی مقصد سے کی ہے۔ اِس سے زیادہ اِن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا

(تم کو حجروں کے باہر سے پکارنے والے) یہ بدوی (بڑا احسان جتا کر) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اِنھیں بتاؤ کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں، یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی ہے۔[۲۹] ایمان تو ابھی تمھارے دلوں کے اندر داخل تک نہیں ہوا ہے۔[۳۰] اگر تم اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمھارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔[۳۱] (سو اپنی اصلاح کر لو)؟ یقیناً، اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔[۳۲] (یاد رکھو)، مومن تو درحقیقت وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان

۲۹؎ اصل میں لفظ 'اَسْلَمْنَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ یہاں ظاہری اطاعت کے مفہوم میں ہے۔ عربی زبان میں یہ اِس معنی کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ تو تمھیں زیب نہیں دیتا۔ البتہ، یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے جب دیکھا کہ اسلام ایک سیاسی طاقت بن گیا ہے تو تم نے بھی اُس کے سامنے سر جھکا دیا۔ یہ بھی ایک قسم کی مغلوبیت ہی ہے۔ اِس میں احسان کی کیا بات ہے؟

۳۰؎ یعنی وہ حقیقی ایمان جو رگ و پے میں اترتا ہے تو دل و دماغ کو اِس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ انسان کے فکر و عمل میں کوئی چیز اُس سے الگ اور اُس کے اثرات سے خالی نہیں رہ جاتی۔

۳۱؎ یعنی اُن کا پورا پورا اجر دے گا۔ لہٰذا یہ اطاعت تمھارے ہی کام آئے گی، اِس میں کوئی چیز اللہ کے کام آنے والی نہیں ہے۔

۳۲؎ یہ اصلاح کی دعوت ہے۔ اِن میں زیادہ لوگ ناسمجھ تھے، اِس لیے تنبیہ کے ساتھ

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾
يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

لائے، پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔[۳۳] یہی سچے لوگ ہیں۔ ۱۴-۱۵

اِن سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو؟ دراں حالیکہ جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، اللہ اُسے جانتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۱۶

یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ اِنھوں نے اسلام قبول کر لیا۔[۳۴] کہہ دو کہ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تم کو ایمان کی توفیق

جگہ جگہ دعوت بھی دی ہے کہ رجوع کرو اور مغفرت مانگو، تمھارے پروردگار کی رحمت منتظر ہے، وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے۔

۳۳؎ یہ اِس بات کی شہادت کے طور پر فرمایا ہے کہ وہ کبھی شک میں نہیں پڑے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنا جان و مال کسی مقصد کے لیے قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے تو یہ اُس کے ایمان و یقین کی ایسی شہادت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۴؎ سورہ کے شروع میں اِن کا جو طرزِ عمل بیان ہوا ہے، وہ اِسی کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ اسلام لا کر اِنھوں نے پیغمبر کی عزت بڑھائی اور مسلمانوں کی شوکت میں اضافہ کیا ہے، لہٰذا ہر ایک کو اب اِن کا یہ احسان مان کر اِن کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾

عطا فرمائی،[۳۵] اگر تم (اپنے اِس دعوے میں) سچے ہو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ زمین اور آسمانوں کا سارا غیب اللہ کے علم میں ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[۳۶] ۱۷-۱۸

۳۵؎ اصل میں 'اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'ھَدٰی' کے بعد 'ل' کا صلہ دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں توفیق کے مضمون پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اول تو تمھارا ایمان و اسلام کا دعویٰ ہی محل نظر ہے، لیکن اگر اِس میں کچھ صداقت ہے تو خدا کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمھیں یہ توفیق بخشی اور ہلاکت کے اُس گڑھے میں گرنے سے بچالیا جس میں تمھاری قوم کے بہت سے لوگ گر چکے ہیں۔ اِس میں ضمناً یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ایمان و ہدایت کی توفیق جو کچھ ملتی ہے، خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اِس میں پیغمبر بھی اِس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے۔ چنانچہ یہ نہیں فرمایا کہ میرا تم پر احسان ہے کہ میں نے تمھیں ہدایت کی راہ دکھائی ہے۔

۳۶؎ یہ آخر میں وہی بات ایک دوسرے اسلوب سے دہرا دی ہے جو اوپر آیت ۱۶ میں فرمائی ہے کہ خدا کو کچھ بتانے کی کوشش نہ کرو، وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو اپنے ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عمل کرو۔ اِس کے بعد زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کوالالمپور

۱۵/ ستمبر ۲۰۱۴ء

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين